

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

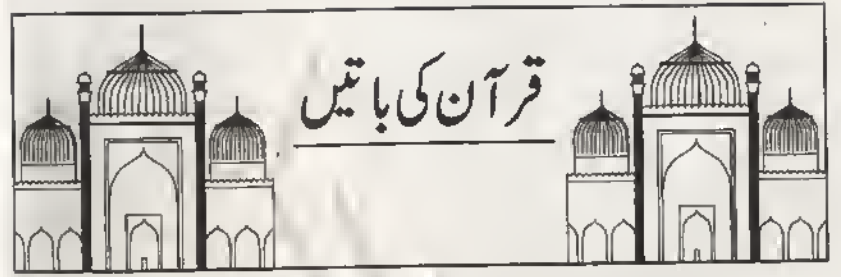
ڈائجسٹ

کراچی

ڈ

مارچ 2013





قرآن کی باتیں

- ☆ مگر جو ظالم ہیں، بے سمجھے اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں تو جس کو اللہ گمراہ کرے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔ (سورۃ روم 30 آیت 29)
- ☆ اور جس کو اللہ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں آدر جس کو اللہ ہدایت دے، اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ (سورۃ زمر 39 آیت 36 سے 37)
- ☆ اور جس شخص کو اللہ گمراہ کرے تو اس کے بعد اس کا کوئی دوست نہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 44)
- ☆ اور جس کو اللہ گمراہ کرے اس کے لئے ہدایت کا کوئی رستہ نہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 46)
- ☆ قسم قسم انسان کی اور اس ذات کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا پھر اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی یقیناً وہ فلاح پا گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد و ہواہ جس نے اس کو بادیا۔ (سورۃ یونس 91 آیت 7 سے 9)
- ☆ مومنوں! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک ان الفاظ کو جو منہ سے کہو، سمجھنے نہ لگو، نماز کے پاس نہ جاؤ۔ (سورۃ نسا 4 آیت 32)
- ☆ لوگوں اپنے رب سے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ ایک حادثہ عظیم ہے۔ اے مخاطب جس دن تو اس کو دیکھے گا اس دن یہ حال ہوگا کہ تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور تمام حمل والیوں کے حمل گر پڑیں گے اور لوگ تجھ کو متوالے نظر آئیں گے مگر وہ متوالے نہیں ہونگے بلکہ عذاب دیکھ کر مدہوش ہو رہے ہوں گے، بے شک اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ (سورۃ حج 22 آیت 1 سے 2)
- ☆ اور ہدایت کی کہ پیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہوتا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا اور میں اللہ کی تقدیر تو تم سے نہیں روک سکتا۔ بے شک حکم اسی کا ہے میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اہل توکل کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئے اور جب وہ ان ان مقامات سے داخل ہوئے جہاں جہاں سے داخل ہونے کے لئے باپ نے ان سے کہا تھا تو وہ تدبیر اللہ کے حکم ذرا بھی ٹال نہیں سکتی تھی ہاں وہ یعقوب کے دل کی خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی اور بے شک وہ صاحب علم تھے کیونکہ ہم نے ان کو علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۃ یوسف 12 آیت 67 سے 68)
- ☆ اور کافر جب یہ نصیحت کی کتاب سنتے ہیں تو یوں لگتے ہیں کہ تم کو اپنی نگاہوں سے پھسلا دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ تو پوانہ ہے اور لوگو یہ قرآن اہل عالم کے لئے نصیحت ہے۔ (سورۃ قلم 68 آیت 51 سے 52)
- ☆ اور جس شخص نے ایمان چھوڑ کر اس کے بدلے کفر کیا وہ سیدھے ہتے سے بھٹک گیا۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 108)
- ☆ (کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکریہ شیخ بک ابنی کراچی)

- ☆ کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت یعنی دین اسلام ہی ہدایت ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 120)
- ☆ اے پیغمبر کہہ دو کہ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 73)
- ☆ تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے، اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے اس طرح اللہ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے، عذاب بھیجتا ہے۔ (سورۃ انعام 6 آیت 125)
- ☆ اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا۔ (سورۃ یونس 10 آیت 25)
- ☆ کہہ دو کہ لوگو تمہارے رب کے ہاں سے تمہارے پاس حق آچکا ہے تو جو کوئی ہدایت حاصل کرتا ہے تو ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور میں تمہارا دلیل نہیں ہوں۔ (سورۃ یونس 10 آیت 108)
- ☆ جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے لئے اختیار کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں، عذاب نہیں دیا کرتے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 15)
- ☆ جس کو اللہ ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے۔ اور جس کو گمراہ کرے، تو تم اس کے لئے کوئی دوست راہ بنانے والا نہ پاؤ گے۔ (سورۃ کہف 18 آیت 17)
- ☆ کہہ دو کہ جو شخص گمراہی میں پڑا ہوا ہے اللہ اس کو آہستہ آہستہ مہلت دیتے جاتا ہے یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، خواہ عذاب اور خواہ قیامت تو اس وقت جان لیں گے کہ مکان کس کا رہا ہے اور لشکر کس کا کروڑ ہے اور جو لوگ ہدایت یاب ہیں، اللہ ان کو زیادہ ہدایت دیتا ہے اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں، وہ تمہارے رب کے صلے کے لحاظ سے خوب اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں۔ (سورۃ مریم 19 آیت 75 سے 76)
- ☆ جس کو اللہ روشنی دے، اس کو کہیں بھی روشنی مل سکتی۔ (سورۃ نور 24 آیت 40)

نوشین خان کوٹ مظفر ملکی سے، نیا شمارہ ستائیس تاریخ کو لاہور قریب بہت اچھا اور جاذب نظر تھا۔ سب سے پہلے حسب معمول اسلامی باتیں پڑھیں۔ پھر کہانیوں کی وادی میں چلا گیا۔ تین ماہ سے آپ مجھے مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں۔ میں خط تواتر سے ارسال کرتی ہوں اور آپ شائع ہی نہیں کرتے۔ جب ضرور جانا چاہوں گی۔ پلیز ایسا مت کیا کریں۔ دل ٹوٹ جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ خیال رکھیں گے۔ سب سے پہلے عمران قریشی کی اسٹوری نگام کا مطالعہ کیا جو کہ سوسوچی۔ پھر ایسا امتیازی کی جنات کا مہمان پڑھی۔ انجام ساجدہ راجہ کی اچھی کہانی تھی۔ ساجدہ جی اگر میں آپ سے دوستی کر دیکھ کر کہوں تو کیا آپ دوست نہیں کی میری؟ ضرور بتائیے گا۔ خوں کا قاتل مجھ سے بالاتر تھی۔ ردو کا اچھی تھی مگر اس میں جذباتی مناظر بہت تھے۔ بھیاک سزا گزرا اور آپ تھی۔ خوں جو کہ انگشت نگوں سے ناخوش تھی۔ آئیںی محمد۔ وارث آصف کی کہانی میری خالہ زاد کی آپ بھی تھی جو میں نے وارث آصف کو فون پر سنا کر گزراؤں کی تھی کہ اسے حرف بہ حرف ارسال کریں۔ انہوں نے اتنے اسی مشکل میں وحالاجس پڑیں ان کی شکر گزار ہوں۔ روح بیتی اچھی کہانی تھی۔ بدروح بیکر ٹھیک تھی۔ سنہری تابوت بھی اچھی تھی۔ مفرد ٹھیک نہیں تھی۔ تابوت جاسوسی کہانی کی طرح شدہ شکل تھی۔ نقشہ اچھی کہانی تھی۔ اگر طویل ہوتی تو مزہ آتا۔ برادر موری کی زبردست تحریر تھی۔ ڈرکا مختصری اور مزے دار اسٹوری تھی۔ بلیک ٹائیگر پروفیسر، ڈراما سی بات دل کو لگی۔ پیاز کی کے جن واقعی تعریف کے لائق تھی۔ اپنی غزل شائع کرنے پر مشکور ہوں۔

☆ نوشین صاحبہ: آپ یقین کریں کہ ہم کسی کا بھی خط شائع نہیں کرتے اگر خط ہم تک نہیں پہنچے تو ہمارا کیا قصور۔ اگر کوئی خط دیر سے موصول ہوتا ہے تو وہ بھی آئندہ شمارے میں شامل اشاعت ہو جاتا ہے۔ امید ہے آپ مائدہ نہیں کریں گی اور نوازش نامہ ضرور ارسال کریں گی۔

افسان رمضان پٹنہ واڈخان سے، السلام علیکم! آپ سب کو خوشیوں بھر 2013ء بہت مبارک ہو۔ خطوط شائع کرنے اور خط کو پسند کرنے والے تمام لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے تو فی امید ہے کہ خط کہانی پڑھنے والوں کو پسند آئی ہوگی۔ اس کے علاوہ شمارے کی دیگر کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ آج کل زیادہ تر راتر حضرات بڑی محنت سے اپنی کاوشیں ارسال کر رہے ہیں اور ان کی محنت کہانیوں میں شمولیت نظر آتی ہے۔ ایک ریکویسٹ تھی وہ یہ کہ ڈر میں "مختصر کہانیوں" کا سلسلہ جلدی شروع کیا جائے تاکہ جو پڑھنے والے راتر کو بھی آگے آنے کا موقع ملے میری غزل کی اشاعت کے لئے شکریہ۔ ساجدہ راجہ، عاصمہ رمضان، عروج، سنبل، مدثر بخاری، احسان، محمد اسلم کی غزلیں اچھی رہیں۔ کہانی ارسال خدمت ہے۔ امید ہے حوصلہ افزائی کر کے ضرور شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆ افسان صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ چلے خوش ہو جائے آپ کی نیلی کوٹھی شامل اشاعت ہے اور اب نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ امید ہے بہت جلد شکریہ کا موقع دیں گی۔

نورین اعظم راولپنڈی سے، السلام علیکم، امید ہے کہ ڈر واڈخان کوٹ مظفر قریب تر کی طرف رواں دواں ہو۔ تمام راتر زکو میری طرف سے سلام۔ 27 جنوری کو ڈر کا شمارہ ملا، ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، جلدی سے چلا گیا لگاتے ہوئے خطوط کی طرف دوڑی اپنا نام دیکھ کر خوشی اور سرت جھٹکی ہے اسے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں، بہت بہت شکریہ امید ہے آئندہ بھی ایسی ہی خوشی ملے گی۔ کہانی شائع نہ ہو سکی اور مانوں پڑ گئی مگر ہلانے کے لئے سوچا چلو غزل تو شائع ہوئی ہوگی مگر جب دیکھا تو وہاں میرا نام نہ تھا۔ پلیز اسے شائع کر دیں۔ چلو خیر مگر آپ نے خط شائع کر کے میرا دل باغ باغ کر دیا۔ اتنی پاموشی نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی مجھے یاد رکھیں گے۔ ایک کہانی اور ایک اشعار بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ اسے شائع کریں گے اور میرا دل نہیں توڑیں گے ابھی صرف سنہری تابوت اور ردو لوکا پڑھی ہے اس لئے کہانیوں پر تیرہ کرنے سے قاصر ہوں، پلیز یہ کہانی میں نے بہت محنت اور لگن سے لکھی ہے اگر اس میں کوئی غلطی ہے تو پلیز اسے ٹھیک کر کے شائع ضرور کیجئے گا

نہیں تو میرا دل ٹوٹ جائے گا آپ نے مجھے جو خط شائع کر کے حوصلہ دیا ہے میں چاہتی ہوں کہ میں ہر ماہ ڈر واڈخان میں لکھنے کی سعادت حاصل کروں آپ کا شکریہ پلیز اسے ضرور شائع کریں میں نے پہلے بھی ایک کہانی بھیاک سزا بھیجی تھی اس کے بارے میں بتائیے گا کہ وہ آپ کو کیسی لگی اگر آپ کہانی شائع نہیں کریں گے تو شاید میں پھر کہانی لکھنے کا حوصلہ نہ کر پاؤں اب یہ آپ پر ہے، اللہ آپ سب کو ترقی دے۔ آپ مجھے خط کی آخری تاریخ بھی بتا دیں کہ میرا خط ہر ماہ وقت پر پہنچ جایا کرے۔ شکریہ۔

☆ نورین صاحبہ: ہم بھی آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔ بھیاک سزا بہت ہی چھوٹی ہے اس سے بڑی انوکھا تعلق، آئندہ آپ کم از کم دس بارہ صفحات کی کہانیاں ارسال کیجئے گا، ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ ماہ انوکھا تعلق شائع ہو، غزل شامل اشاعت ہے، خط کی تاریخ ہر ماہ چھ سات تاریخ تک موصول ہو جائے۔ شکریہ۔

سنبل طہ: سرگودھا سے، آداب، ڈر کا کرٹ شمارہ 5 تاریخ کو لاہور سب سے پہلے خطوط میں اسارہ نوشین، بلقیس خان اور محمد آصف شہزاد کا شکریہ، کائنات بلوچ کو بھی آپ سے یہ شکایت ہے کہ خط کاٹ کر کیوں شائع کیا جاتا ہے۔ کہانیوں میں خط کا کوئی جواب نہ تھا۔ حافظہ، تابوت کہانی، ہولناک رات، آگشہ، مسافر بھی اچھی تھی۔ موت کے رنگ ٹھیک نہیں تھی۔ غزلوں میں میری غزل کی اشاعت کے لئے شکریہ، آسمان، عاصمہ، افشان، عروج، محمد آصف شہزاد، ایسا امتیاز احمد اور غلام نبی نوری کے کلام بہت زبردست تھے۔ ایک ریکویسٹ تھی کہ کوئی ایسا سلسلہ بھی شامل کریں جس میں راتر کے بارے میں جانا جا سکے۔ مطلب اعتر و یوز کا سلسلہ میں مختصر واقعات بھیج رہی ہوں آپ اپنے مختصر مختصر واقعات والے سلسلے میں شامل کر لیجئے گا۔ کچھ آریکٹر اور غزلیں بھیج رہی ہوں۔ پلیز جلد شائع کیجئے گا۔ اب اجازت چاہوں گی۔ امید ہے میرے خط اور آریکٹر کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ اللہ حافظ۔

☆ سنبل صاحبہ: خطوط کے لئے چند صفحات محدود ہیں، لہذا سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اصل مقصد شائع کر دیا جاتا ہے۔ آپ سب کی غزلیں اور اشعار تواتر شائع ہو رہے ہیں۔ مختصر کہانیوں اور اعتر و یوز کا سلسلہ مغرب شروع کیا جائے گا۔ آئندہ بھی نوازش نامہ کا انتظار ہے گا۔

بلقیس خان پٹنہ سے، السلام علیکم، ڈر کا ماہ فروری کا شمارہ جنوری کی 21 تاریخ کو مل گیا۔ سب سے پہلے ٹائل کو سرسری دیکھا۔ ٹائل وغیرہ نقل و ثارے رہا تھا۔ اس کے بعد قرآن کی باتوں سے دل کو منور کیا۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر دل خوش ہوئی۔ سب دوستوں کے خطوط زبردست انوکھے اور خوب صورت تھے۔ رضیہ عارف صاحبہ واقعی آپ درست فرما رہی ہیں۔ پٹنہ شہر کے حالات بھی کراچی کی طرح ڈرگوں ہیں۔ بس دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرے۔ فارہ، نسیم، پرسنہ، ڈی، انوری رمضان کو اور ایسا حبیب خان، عاصمہ رمضان اور نعمت محمود، پیار سے بھر پور سلام قبول کو۔ آپ نے راتر کو حوصلہ دیتے ہیں۔ عثمان غنی کے شعر نے متاثر کیا۔ غزلوں اور نظموں میں احسان محرم کی غزل اور ساجدہ راجہ کی نظم نے متاثر کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے میناش پڑھی۔ ویڈیو کہانی واقعی ابتدائی صفحات کے قاتل تھی۔ دوسرے نمبر پر واصل جنم رہی۔ مگر کہانی بڑی تھی اور راتر کی مضبوط گرفت کی وجہ سے اچھی لگی۔ شائستہ جی قاتل نے تیسرا نمبر لے لیا۔ باقی سب دوستوں کی کہانیاں زبردست رہیں۔ خط وار اسٹوریز میں بلیک ٹائیگر نے اس بار بازی لپٹ دی۔ البتہ اس بار مغربی کہانیاں زیادہ تھیں۔ البتہ ایسا امتیاز احمد کی شیطانی کھوجی اور عابدی کی خلا سے واقعی زبردست کہانیاں تھیں۔ باقی ڈر کے لئے دعا گو۔

☆ بلقیس صاحبہ: بہت بہت شکریہ، آپ قلمی لگاؤ سے خط لکھتی ہیں۔ تعریفی الفاظ کے لئے شکریہ، آپ کی کہانی دیو ی ضرور شائع ہوگی، تجوڑ انتظار کر لیں پلیز!

فاریہ تبسم ٹھیک سورتھور سے، ڈر کے تمام راتر، اساف، اناریوں، لکھاریوں کو میری طرف سے بہت بہت سلام قبول ہو۔ نیا شمارہ بہت مل گیا۔ قرآن کی باتیں زبردست تھیں۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر سرت ہوئی۔ بلقیس خان، رضیہ خان، نورین اعظم، ساجدہ راجہ، انوری رمضان، غلام نبی نوری، پرسنہ، ڈی اور عاصمہ رمضان کے خطوط دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا کہانیوں میں ردو کا کیسٹ آف وی منعقد تھی۔ زندگی، ہیروئی، قاتل، خلا سے، واپسی، واصل جنم، سیاہ بھوت، خونی پاؤں، کلون، دل کے رشتے، ابر جا، وگر بہت اچھی تھیں۔ لے بال اس سے پہلے ایک اور رسالے میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ تو قس قس میں افسانہ رباب، فرید خان، محرم، مامہ، انور، محمد واکر اور محمد وارث آصف کے کلام اچھے تھے۔ آخر میں سب کے لئے ڈیویر سلام۔

پس نوید ہاشمی ٹنڈو جام سے، کمری و ستر ام ایڈیٹرز ڈاٹ انجسٹ آف آب عرض، امید ہے کہ بخیریت ہوں گے، اول اپنا مختصر تعارف کروادوں خاکسار کو عبد القادر کہتے ہیں اور پیر نوید شاہ ہاشمی کے قلمی نام کے ساتھ اردو اور سندھی ادب سے 25، 26 برس پانی والنگی ہے۔ کچھ مصلحتی ٹنڈو جام کے بک اسٹال پر ”ڈوڈا انجسٹ“ و میکا تو ایسا دل میں اترتا کہ مستقل قاری بن بیٹھے، چونکہ دینے والی ڈراوٹی، پراسرار کہانیوں کے لئے مخصوص ”ڈوڈا انجسٹ“ بلاشبہ اپنی نوعیت کا منفرد اور اچھوتا پرچہ ہے، انفس تو اس بات کا ہوا کہ اس کی اشاعت کو 14 برس بیت چکے ہیں لیکن ہماری شناسائی اب ہوئی ہے! خیر ”برآوردست آیدئے صدق“ اب قلمی رفاقت بھانجے رہیں گے، فی الوقت چند ایک چھوٹی موٹی قلمی اشیا اور اس تبصرہ کے ساتھ آغا ذکر رہے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ مکمل حوصلہ افزائی کر کے آئندہ کہانیاں ارسال کرنے کے جذبے کو حوصلہ دیں گے۔ کچھ بات، دو ہجائے شمارہ فروری 2013ء کی جو اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہاتھوں کے کشتجے میں ہے۔ ٹائٹل حسب سابق ول ولہا دینے والا ہے۔ ”ڈوڈا انجسٹ“ کے انوکھے اور دہشت ناک ٹائٹل اسے اسٹائر پرسب سے ممتاز ثابت کرتے رہتے ہیں جس کے لئے آپ سب ہمارا کباد کے متحتی ہیں۔ جہاں تک ڈوڈا انجسٹ کی کہانیوں کا سوال ہے تو تعین کریں کہ سب کہانیاں اس قدر محروم واریتیں نہ ہوں گے جن میں انجمن ہوری ہے، تو ہماری رائے کے مطابق اس مرتبہ طویل کہانی ”واصل جنہم“ اول رہی۔ ہیر وکن، قاتل، میناش، سیاہ بھوت بھی اس شمارہ کی بہترین کہانیاں ثابت ہوئیں اور پھر اپنی طرح محفوظ کرنے کا باعث بنیں۔ ان کے علاوہ دیگر کہانیوں میں کلون، لمبے بال، شیطان کھوپڑی، ول کے رشتے، زندگی، خونی پاؤں، دعا کی طاقت، موت کا چھپچھا، جاوگر اور خلا سے واپسی بھی مناسب رہیں۔ بلیک ٹائیگر اور سنہری تانوت کی تو کیا تعریف کی جائے۔ ام المیاس اور ام اے راحت جیسے بڑے نام ڈاٹ انجسٹ میں شامل ہیں۔ تو یہ بات

☆☆ نوید صاحب: ڈرڈانجسٹ میں ایک مرتبہ پھر خوش آمدید، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور تمام قارئین پر اپنا فضل و

کرم رکھے اور خوشیوں سے نوازے، امید ہے آپ آئندہ ہر ماہ شکر کے کا موقع دیتے رہیں گے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا ”ڈرڈائجسٹ“ ہمارے سامنے ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلفے خوب رہے۔ اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب بجا جواب رہا۔ آرٹیکلز لگانے کا شکر ہے۔ آرٹیکلز آپ کے پاس ہیں۔ پلیز دیکھئے گا۔ مزید میٹرز میں۔ راج ذلاری، حسین تھوڑی، رحمت بے پایاں (مراسلہ) ارسال خدمت ہے۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ”ڈرڈائجسٹ“ کے تمام خوب صورت لکھنے والے راءلز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دو پڑ کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: آپ ہر ماہ قلمی لگاؤ کا ثبوت دیتے ہیں اس کے لئے دیری دیری تھکنس، امید ہے یہ قلمی لگاؤ ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔ کہانی شامل اشاعت ہے اور نئی کہانی کا انتظار ہے۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالیہ سے، رسالہ جلد ہی مل گیا، حسب معمول دوستوں کے خطوط اور رد و لوکے اور دیگر کہانیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ رسالہ ڈرڈائجسٹ۔۔۔۔۔ مجھے ہے پرانے پڑھنے لکھنے والوں کو بخوبی یاد ہوگا ڈرڈائجسٹ کتنی ہی ساقی آئے کتنی ہی چلے گئے۔۔۔۔۔ کتنی ہی آ رہے ہیں۔۔۔۔۔ کتنی ہی جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ مگر دیار داں ہے۔۔۔۔۔ مجھے ہے پرانے پڑھنے والوں نے غرض مریات کے موضوع پر کئی بار ڈرڈائجسٹ پڑھا ہے ایک ہی موضوع کو مختلف رنگ میں غرضوں۔۔۔۔۔ می۔۔۔۔۔ ٹکلو پٹھر کو ڈرڈائجسٹ میں لکھ رہے ہیں۔ رد و لوکا واحد کہانی ہے جو پہلی قسط سے جب جڑی بوٹی کی تلاش میں حکیم صاحب کی ملاقات جنگل میں رد و لوکا سے ہوتی ہے اور حکیم صاحب رد و لوکا کو ناش کر رہے ہیں اور دوستی کا آغاز ہوتا ہے۔ 93 قسط ہر قسط دلچسپی سے بھرپور پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس کہانی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، یعنی سورج کو چاڑھ دکھانے کے برابر۔ اس طرح اس سے پہلے جادو بھی اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ والسلام دعا میں سب کو۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کا ڈرڈائجسٹ سے یہ قلمی لگاؤ ہے کہ آپ کو رد و لوکا کی پہلی قسط بھی یاد ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ذوق نظر والے ہی رد و لوکا کی اہمیت و دلچسپی اور کہانی کے تانے بانے اور اتار چڑھاؤ کو سمجھتے ہیں۔ آپ کے چاہت غلطوں نامہ کا آئندہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔ شکر ہے۔

محمد ہمایوں پڑھنا نامہ سے، السلام علیکم کے بعد تمام قارئین اور لکھنے والوں کو ادارے کے اسٹاف کو میری طرف سے عید میلاد النبی مبارک ہو، اس وقت اپنے گاؤں پڑھنے میں بھی بیک اسٹال سے اپنا پسندیدہ ماہنامہ دیکھا تو دل خوش ہوا کہ ہمارے گاؤں کے لوگ بھی ڈرڈائجسٹ پڑھتے تھے۔ سردی کی چڑیل، ادوہ معاف کیجئے گا حین کو کد کے دل میں گدگدی سی ہوئی اور بے اختیار دل نے کہا۔ کاش آپ ہمارے ہوتے کہانیوں میں سب سے پہلے رد و لوکا پڑھی اور تب چھوڑی کہ جب رد و لوکا کو جنوں کے گاؤں میں روٹا شک کے والد کی شکل سے اٹھے کہ اب اگلے ماہ پھر ملیں گے مزاحیہ شعر۔ سن کر حساب یہی کا چکر اکیا ہوں میں۔ چھتیس سال کا ہو کر سنیا گیا ہوں میں۔

☆☆ ہمایوں صاحب: جو صلہ اور ہمت سے کام لیں۔ سنیانے کے بجائے رگیدے والے بنیں۔ خیر غلطوں دل سے لکھے خط کے لئے شکر ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خوش کن الفاظ سے نوازیں گے۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، السلام علیکم، آپ کی خیریت کا طالب ہوں، غزل کی اشاعت پر تہ دل سے مشکور ہوں، اس بار بھی غزلوں کے ہمراہ شرکت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تعاون کیا جائے گا۔ ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

قدیر صاحب: ڈرڈائجسٹ سے قلمی لگاؤ کے لئے بہت بہت شکر ہے۔ آئندہ ماہ بھی غلطوں نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

بشیر احمد بھٹی فوجی ہسپتال بہاولپور سے، السلام علیکم، فروری 2013ء کا ڈرڈائجسٹ لے کے پہنچا اسے گھر تو دیکھا کہ پہلے ماہ بھیجا ہوا تبصرہ گول ہے۔ ٹیکہ نمبر 2 ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب نے پونے تین نمبر تجویز کیا ہے۔ میں بغور سنی آنگھوں سے خطوط کے صفحات میں اپنا نام و نمونہ تار مار کر سوہوہ لگتا ہے ٹھکڑا ڈاک کی اٹلی کار کردگی کی جھینٹ چڑھ چکا ہے میرا سابقہ خط حائل کہ یہاں سے ڈاک بذریعہ خیر لال ہوگی میں ڈاک جاتی ہے۔ ہوگی کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بھی بند ہوتے ہیں۔ پھر خط کیسے ہوا کی نظر ہو کے کہیں جاگرا۔ خیر۔ اب ٹھکڑا ڈاک کی کار کردگی بہتر ہو چکی ہے۔ فروری کے شمارے میں ٹائٹل کے بعد جج نمبر 2 پر

بچوں کے رسالے نکشن کا اشتہار موجود ہے۔ مگر یہ رسالہ بہاولپور میں دستیاب نہیں۔ اس کا حصول ممکن بنائیے۔ پہلی کہانی میٹاں اور آخری کہانی دامل جنم اس ماہ کی زیر دست کہانیاں ہیں۔ مصنفین نے خوب محنت کی ہے۔ رد و لوکا کی قسط نمبر 93 سے ظاہر ہے۔ یہ کہانی پتھر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تاویث کی قسط 9 اور بلیک ٹیگٹر کی قسط 8 دولہ انگیز رہیں۔ اس ماہ کی کہانیوں میں کلون، لمبے بال، دل کے رشتے، شیطانی کھوپڑی، میر دن، زندگی، سنہری تاویث قسط نمبر 9، قاتل، سیاہ بھوت، خونی پاؤں، دعا کی طاقت، موت کا پیچھا، جادوگر، خلا سے واپسی، ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک دہی۔ قوس قزح کی غزلیں اچھی ہوتی ہیں۔ بچوں کے ادب پر چند بہترین کہانیاں لکھ رکھی ہیں۔ جوش ماہنامہ نکشن کو ارسال کرنا چاہتا ہوں۔“

☆☆ شیر صاحب: آپ بعد شوق نکشن کے لئے کہانیاں ارسال کر دیں۔ ڈرڈائجسٹ سے آپ کا لگاؤ قابل دید ہے اور ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خط بھیج کر شکر کا موقع ضرور دیں گے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم، آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں کچھلی وقت آپ کو خط تحریر نہ کر سکا بہت افسوس ہوا۔ ماہ جنوری کا پڑچہ بہت خوب صورت تھا۔ سردی کی مثالیں آپ تھا۔ ماہ جنوری میں خطوط اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گزشتہ سال میں جوتھان میرے ساتھ آپ نے کیا بہت بہت شکر ہے۔ امید کرتا ہوں کہ نئے سال 2013ء میں بھی پہلے کی طرح تعاون کریں گے۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا غلط نامہ پڑھ کر اچھا لگتا ہے آپ کی چاہت اور غلطوں قابل دید ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

احسان سحر میاںوالی سے، السلام علیکم، امید کرتا ہوں آپ اور آپ کا اسٹاف خیریت سے ہوگا ڈرڈائجسٹ بے حد شکر گزار ہوں جس نے مجھے سپورٹ کیا اور اپنے چاہنے والوں کا جن کے وقفے وقفے سے ایس ایم ایس اور کال مجھے موصول ہوتا آرہا ہے۔ اللہ پاک نے چاہا تو یہ سلسلہ چلا رہے گا۔ اور میں ڈرڈائجسٹ کے سہرا بننے کو چاہتا ہوں۔

☆☆ احسان صاحب: خط لکھنے کے لئے شکر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دل کو دل سے راحت ہوتی ہے۔ امید ہے آپ اپنا تعاون آئندہ بھی ڈرڈائجسٹ سے جاری رکھیں گے اس کے لئے شکر ہے۔

غلام نبی نوری کھڑیاں خاص سے، سب سے پہلے ڈرڈائجسٹ کے تمام پڑھنے لکھنے، دیکھنے اور ڈرڈائجسٹ کے تمام اسٹاف کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بہت بہت دعا و سلام فروری 2013ء کا شمارہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے رد و لوکا پڑھی، اس میں چھوڑی سی تبدیلی کرنے سے مزہ آگیا۔ سنہری تاویث سوسچی، بلیک ٹیگٹر اچھی تھی۔ زعد کی پہلی نمبر پڑھی۔ نمبر 2 پر موت کا پیچھا، نمبر 3 پر دل کے رشتے، نمبر 4 پر میٹاں نہایت ہی زبردست اور سبق آموز تھی۔ لمبے بال، شیطانی کھوپڑی، قاتل، سیاہ بھوت، خلا سے واپسی اور جادوگر زبردست تھیں۔ قوس قزح میں اپنی غزل نہ پا کر دکھ ہوا۔ باقی تمام شاعروں نے اچھا لکھا۔ آخر میں تمام راءلز اور اسٹاف کو غلطوں بھر اسلام۔

☆☆ غلام نبی صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکر ہے۔ جناب جب کسی کا خط ہم تک نہیں پہنچتا تو پھر شائع کیسے ہوگا۔ ذرا جلدی کا خیال رکھا کریں۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ بذریعہ خط۔ خدا حافظ۔

محسن علی جٹ فریڈ ناؤن ساہیوال سے، امید ہے ڈرڈائجسٹ اور اسٹاف اور قارئین بخیریت ہوں گے۔ جناب آپ نے ولا سادیا کہانی ضرور شائع ہوگی آپ کی بہت مہربانی۔ قوی امید ہے کہ میری کہانی بے وقا لوگ شائع کر دیں گے۔ شدت سے انتظار رہے گا۔ کہانی کے شائع ہوتے ہی نئی کہانی بہت جلد ارسال کر دوں گا۔ فروری 2013ء کے شمارے کی تو عین کہانی بیٹ تھیں۔ رد و لوکا فرسٹ، سیکنڈ ٹیماس، تیسری دامل جنم تھی، یہ تینوں کہانیاں سبق آموز تھیں، باقی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ میری دعا ہے کہ ڈرڈائجسٹ دن و رات چوگتی ترقی کرے۔

☆☆ محسن صاحب: آپ گہرائیوں میں اپنے وقت پر آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی۔ کہانی زیادہ اصلاح طلب ہے اور جو کہانی زیادہ اصلاح طلب ہوئی ہے وہ اتنا کا شکر ہوا جاتی ہے۔ نیز آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

☆☆

پاگل بیتی

عمران قریشی - کوئٹہ

صبح ہی صبح ایک نوجوان نے بانسری میں ایک عجیب دھن چھیڑی اس دھن کو سن کر قصبہ کے سارے چوہے اپنے اپنے بلوں سے نکل کر نوجوان کے گرد جمع ہو گئے تو نوجوان ایک سمت کو چل پڑا، چوہے نوجوان کے پیچھے پیچھے تھے اور پھر.....

دل و دماغ پر خوف و ہراس کی چادر ڈالتی ایک ناقابل فراموش جگر کو پاش پاش کرتی کہانی

سے نہایت معمول اور نفس انسان دکھائی دیتا تھا۔ سر سے مگنیا اور فریبی مائل جسم کا مالک تھا۔ آنکھوں پر نفیس شیشوں والی عینک کی بدولت دکان کے مالک کے بجائے کسی یونیورسٹی کا پروفیسر دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کی پاگل خانے میں موجودگی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ لیکن اس کی زبانی مجھے جس حیرت انگیز کہانی کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ نہایت اچھوتی اور روٹ گئے کھڑے کر دیئے والی تھیں۔ اس آپ بیتی کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے مجھے دو مہینے سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔ تو اب آپ بیتی کی جانب آئیے۔ جسے میں نے کہانی کی صورت دے دی ہے۔

اس کی حیرت انگیز آپ بیتی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب اس نے شیل ٹاؤن میں چلتی ہوئی دکان نہایت سستے داموں خریدی۔ کرسی کی آمد آمد تھی۔ لوگ کھلونوں اور پھولوں کی دکان پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ ڈوٹی نے دکان خریدنے کے فوراً بعد کرسی بڑی آرڈر پر بنوا کر دکان کے فرٹ پر بٹے ہوئے برآمدے میں رکھوا دیے۔ شیل ٹاؤن کے مختصر افراد کا کرسی بڑی پر ہجوم لگ گیا۔ وہ ٹری کی خریداری کے ساتھ کھلونوں اور پھولوں کی خریداری بھی کر رہے تھے۔ لیکن شام پانچ

میری کتاب پاگل خانہ کامیابی کے ریکارڈ توڑ رہی تھی۔ فلم کے ڈائریکٹر پروڈیوسر میری منت ساجت کر رہے تھے کہ وہ اس کتاب پر فلم بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے تحریر کے حقوق فروخت کرنے کے لئے بات چیت پر آمادہ ہیں۔ لیکن مجھے فلم لائن سے کسی بھی قسم کی دلچسپی نہیں رہی۔ اس لئے میں نے صاف انکار کر دیا۔ اب میرے ایڈیٹر کا بھی یہی تقاضا تھا کہ پاگلوں پر مزید کوئی تحریر ارسال کروں۔ تاکہ اس پر کام کیا جاسکے۔ ان دنوں میری کتاب ”پاگل خانہ“ کے اعزاز میں پاگل خانے والوں کی جانب سے خصوصی تقریب کا انعقاد ہوا۔ اور مہمان خصوصی میں تھا۔

یہاں یہ بھی بتانا چلوں کہ میں ان چند ہی دنوں میں اچھا خاصا کھانا پیتا شہری بن چکا تھا۔ سفری سٹزمین والی نوکری کو خیر باد کہنے کے بعد میں نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز کہانیوں کی اشاعت کو ہی بنالیا تھا۔ بہر حال تقریب کے دوران میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو کھلونوں کی دکان کا مالک تھا۔ اس کی دکان شہر سے کچھ دور واقع ایک غیر معروف ٹاؤن میں تھی۔ ٹاؤن کا نام شیل ٹاؤن تھا۔ اور آبادی تقریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آدمی کا نام ڈوٹی تھا۔ شکل و صورت

بچے کے فوراً بعد شیل ٹاؤن کے بازار کی دکانیں بند ہونے لگیں۔ لوگ خوفزدہ چہرہ لئے گھروں کی جانب جانے لگے۔ اور بازار میں لکچٹ دیرانی پھیلنے لگی۔

ڈونی نے حیرت بھری نگاہوں سے بازار کی جانب دیکھا۔ جہاں دیرانگی کا اب یہ عالم تھا کہ انسان تو انسان جانور بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس نے کانٹھے اچکائے اور دکان میں داخل ہو کر کیش چیک کرنے لگا۔ اس کی پہلے دن کی سیل حیرت انگیز طور پر قابل رشک تھی۔ نہ جانے دکان کا پہلا لاک اسے سستے داموں کیوں فروخت کر گیا تھا۔ یہ تو ایک منافع بخش کاروبار تھا۔ رقم کو مختصر کیش باکس میں رکھنے کے بعد اس نے باکس کو تالا لگایا اور پوری دکان میں طائرانہ نگاہ ڈالی۔ شیفٹ میں رنگ برنگے کھلونے سجے ہوئے تھے۔ درمیان کے حصے میں بڑے بڑے جانوروں کے بھس بھرے لاشے رکھے تھے۔ پرندوں کے لاشے بھی وہاں الیتادہ کئے گئے تھے۔ ان سب کے علاوہ درمیان کی جگہ میں ایک بوڑھے آدمی اور بوڑھی عورت کے کپڑوں سے بنے ہوئے بت بھی کھڑے کئے گئے تھے۔ یہ سامتا کلاز کے جسمے تھے۔ سرخ و سفید رنگ میں لمبوس خوب صورت بوڑھا جوڑا۔۔۔۔۔ بوڑھے فرشتے کی کمر پر سرخ تھیلا لدا ہوا تھا۔ جس میں کھلونے بھرے ہوئے تھے۔ عورت کے کپڑے وجود میں لکڑی کی لاشی نمایاں تھی۔ جس پر عقاب کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔

ڈونی کی محدود معلومات کے مطابق سامتا کلاز جو کہ ایک فرشتے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ عورت کا بت اس نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن یہاں تھا۔ کرمس کی آمد آمد پر اتنی جلدی بازار بند ہو جانے کی وجہ بھی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ بہر کیف اس نے ابھی ہوئی نگاہوں سے دکان کا جائزہ لیا۔ پھر لائٹ بند کرنے کے لئے بٹن کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دکان کا شیشے کا دروازہ کھلا اور پولیس کا ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔ ڈونی نے تنگی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ تب وہ بولا۔ ”میرے خیال میں تم شیل ٹاؤن میں نو وارد

ہو۔ بھی پانچ بجنے کے بعد بھی دکان کھولے بیٹھے ہو۔ لیکن تمہارا یہاں مزید بیٹھنا فضول ہے۔ اب یہاں کوئی بھی کسٹمر نہیں آنے والا۔“

”کیوں؟“ ڈونی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کچھ عرصہ سے شیل ٹاؤن پر اسرار واقعات کی زد میں ہے۔ کبھی بند بازار میں سے درد بھری چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور کبھی جلی ہوئی سرخ شدہ لاشیں دریافت ہوتی ہیں۔ کچھ دن پہلے چار سے زیادہ لکڑی کے گھر آگ لگنے کی بدولت جل کر جسم ہو گئے۔ فائر بریگیڈ والوں نے آگ بجھانے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر آگ بجھنے کے بجائے مزید بڑھتی چلی گئی۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن گھر کے رہائشی طور پر تقریباً دیوالیہ ہو گئے۔ اب مزید دونوں سے ٹاؤن کے بازار میں کچھ نرملہ مخلوق کو گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔ اس مخلوق نے کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچایا۔ لیکن خوف و ہراس پھیلانے کا باعث ضرور بنی ہے۔

ایک مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس مخلوق کی توجہ کا مرکز تمہاری حال ہی میں خریدی ہوئی دکان رہی ہے۔ اس لئے دکان کو بند کر دو۔ اور فوراً سے پیشتر گھر کی جانب روانہ ہو جاؤ۔“ پولیس والے نے غلات میں تفصیلات بتائیں اور جواب سے بغیر دکان کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ڈونی اس کے لب و لہجے میں جیسے ہوئے خوف و ہراس کو محسوس کر چکا تھا۔ معاملے کی سنگینی کا اندازہ اسے پولیس والے کے خوفزدہ ہونے سے بخوبی ہو گیا۔ اس نے لائٹ آف کی اور دکان کا ششدریچہ کرنے کے بعد تیز تیز قدموں کے ساتھ بازار سے لمختہ رہائشی علاقے کی جانب چل دیا۔ جہاں اس کا دو کردوں پر مشتمل کرائے کا مکان موجود تھا۔

شیل ٹاؤن کا پر اسرار قصبہ سنسان و ویران دکھائی دے رہا تھا۔ سورج مغرب کی جانب جھٹکا چلا جا رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر درختوں پر پرندے بھی

نہایت خاموشی اور اداسی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ ڈونی خوفزدہ قدموں کے ساتھ تقریباً بھاگے لگا۔ اس نے دل میں پکا تہیہ کر لیا تھا کہ آئندہ پانچ بجے سے پہلے ہی دکان بند کر کے گھر چلا آئے گا۔ ٹاؤن کی ویرانی اور اداسی اسے پریشان کئے دے رہی تھی۔

”خوف و ہراس“

ڈونی کا گھر دو کردوں پر مشتمل ٹاؤن کے تقریباً درمیان میں بنے جدید اور خوب صورت گھروں پر مشتمل آبادی کے اندر واقع تھا۔ گھر کے سامنے مختصر لان بنا تھا۔ جسے بازہ کے ذریعے بند کر دیا گیا تھا۔ بازہ کے آگے برآمدہ اور برآمدے کے آگے دو کمرے۔۔۔۔۔ اس وقت تمام گھر اور ان کے سامنے لان سنسان دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خوب صورت پینٹنگ کو سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ ڈونی نے غلات میں دروازہ کھولا اور گھر میں داخل ہونے کے بعد دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ پھر طویل سانس لیتے ہوئے اس نے لائٹ آن کی۔ آتش دان کو سلگایا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کافی کا پیالہ تھامے ریڈیو کے پاس آ بیٹھا اور غریب سننے لگا۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ کافی بننے کے بعد اس نے ریڈیو کی آواز اونچی کی اور لیکن میں تمس کر پٹکن برگر تیار کرنے لگا۔ تب اچانک ہی اس کے حساس کانوں نے شیل ٹاؤن کا نام سنا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اناؤنسر کہہ رہی تھی۔ ”شیل ٹاؤن خوف و ہراس کی لپیٹ میں ہے۔ پاگل خانے کو لگنے والی آگ کے مہینہ پورا ہو جانے کے باوجود بھی شیل ٹاؤن کی مختصر آبادی میں ہونے والے حادثات میں کمی واقع نہیں ہو پائی۔ خوف و ہراس کی بدولت ٹاؤن کے افراد سرشام کاروبار زندگی ترک کرنے کے بعد گھروں کا رخ کرتے ہیں اور کسی بھی نئے حادثے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ رکھتے ہیں۔ تاوقت حال حکومت معاملے کی چھان بین کے علاوہ کوئی بھی مثبت قدم نہیں اٹھایا۔“ قصبے والوں کے بقول ان واقعات کا آغاز پاگل خانے میں لگنے والی

آگ کے بعد ہوا۔ جس میں وقت کے ساتھ کمی کے بجائے شدت نمایاں ہونے لگی۔ حکومت سے اپیل ہے کہ ٹاؤن کے دیگر گوں ہوتے حالات کی جانب مکمل توجہ دی جائے۔“

ڈونی نے ریڈیو کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ پھر برگر کھائے بغیر میٹنگ روم سے ملحقہ سونے کے کمرے کی جانب چل دیا۔ دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد اس نے لائٹ بند کئے بغیر لحاف کو سر تک اوڑھا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دماغ پر خوف کی لہر مسلط تھی۔ سونا اس کے اختیار سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ خوف کی بدولت اسے اپنے جسم کے روٹنگے کھڑے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کے باہر کوئی دے قدموں چل رہا ہو۔ پھر چلتے قدموں کی دھمک اس کے کمرے کے سامنے آ کر رگ گئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ شاید اب دروازے کے باہر کھڑا ہونے والا عفریت تالے کے سوراخ سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

اچانک ہی داخل ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھا۔ ڈونی کا دل اچھل کر قلعے میں آ گیا۔ اس نے لحاف کو مزید اوپر کھینچ لیا۔ گھنٹی متواتر بجتی چلی جا رہی تھی۔ ڈونی نے سوچا۔ ”خوف و ہراس“ دور کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ وہ فون پر بات چیت کر کے منتشر دماغ کو کچکا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور نہیں ہو سکتا۔“ اس نے لحاف میں سے سر باہر نکال کر کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر بستر سے نیچے اتر کر دروازے کی جانب چل دیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ میٹنگ روم کی لائٹ آن تھی۔ اور وہاں حالات معمول کے مطابق تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ ڈونی نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب خاموشی طاری رہی۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ ڈونی کپکپاتے ہوئے لہجے میں

ہوا۔ اب کی دفعہ دوسری جانب ہلکی سرگوشی کی آواز ابھری۔ پھر جھٹکے کے ساتھ فون بند کر دیا گیا۔ ڈوٹی ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ شدت کے ساتھ اس بات کا خواہاں تھا کہ کوئی اس کے ساتھ بات چیت کرے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اس نے باپوی بھرے انداز میں ریسیور کو کرٹیل پر رکھ دیا۔ ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ سی ایل آئی نصب تھی۔ جس پر فون کرنے والے کا نمبر نمایاں ہو جاتا تھا۔ لاشعوری طور پر ڈوٹی کی نگاہیں سی ایل آئی سیٹ کی اسکرین پر پڑیں۔ وہاں موجود نمبر حیرت انگیز طور پر اس کی اپنی دکان کا تھا۔ ڈوٹی نے آنکھوں کو اچھی طرح مسلا۔ پھر دوبارہ نمبروں کا جائزہ لیا۔ وہ حرف بہ حرف اس کی دکان کے نمبر تھے۔ لیکن سوچنے کی بات تھی کہ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔

جہاں تک اسے یاد تھا۔ وہ دکان کو تالا لگا کر آیا تھا۔ اور اس کی اطلاع کے مطابق دکان کی چابی بھی اس کے علاوہ کسی کے پاس موجود نہیں تھی۔ لیکن فون کال کے مطابق دکان تا صفر کھلی ہوئی تھی بلکہ دکان میں کچھ افراد بھی موجود تھے۔

ڈوٹی کے چہرے پر فکر انگیز لکیر یوں کا جال بکھر نے لگا۔ دکان میں رقم کے علاوہ قیمتی سامان بھی موجود تھا۔ اگر مکان میں ڈاکا پڑ جاتا۔ تب وہ دیوالیہ ہو کر رہ جاتا۔ خوف و ہراس کی وہ لہر جو کچھ دیر پہلے اس کے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔ یکدم غائب ہوئی چلی گئی اور اس جگہ پریشانی اور لا چاری نے لے لی۔ پریشانی دکان میں کسی کی موجودگی سے تعلق رکھتی تھی اور لا چاری اس بات کی تھی کہ خندوش حالات کی بدولت وہ گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ ڈوٹی نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاما اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

اچانک مکان کے دروازے کی کھنٹی بجنے لگی۔ ڈوٹی نے چونک کر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے باہر بھلا کون ہو سکتا تھا؟ رات کے اس پہر ٹاؤن دالوں میں سے کوئی بھی باہر نکلنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ شاید کوئی بھولا

بھٹکا ہوگا۔ لیکن شام کو پولیس والے کے تیر کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسا سوچنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نے صوفے پر بیٹھ بیٹھ چلا تے ہوئے پوچھا۔

”باہر کون ہے؟“

”دروازہ کھولنے میں چوکیدار ہوں۔“ کرخت آواز میں جواب موصول ہوا۔ ڈوٹی نے اطمینان بھرا طویل سانس لیا اور صوفے سے اٹھ کر دروازے کی جانب چل دیا۔ دروازہ کھولنے پر اس نے جس عجیب و غریب اور مضحکہ خیز شخص کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ کسی بھی لحاظ سے چوکیدار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بال بکھرے ہوئے..... چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر گول شیشوں والا چشمہ..... ناک بہ کر بوتلوں کی جانب آ رہی تھی۔ جسے وہ وقتاً فوقتاً زبان کی مدد سے چاٹ رہا تھا۔ وہ شدید سردی کے باوجود صرف پینٹ شرٹ میں لباس تھا۔ مجموعی طور پر چوکیدار کے بجائے کسی سرکس کا جوکر دکھائی دیتا تھا۔ ڈوٹی نے استغیاباً نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

تب وہ دوبارہ کرخت لہجے میں بولا۔

”جواب..... اس وقت آپ کو پریشان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ابھی کچھ دن قبل میں نے ریپچہ نما جانور کو اس رہائشی کالونی کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن اس گلی تک پہنچنے کے بعد وہ یکدم نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ آپ کو بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ محتاط رہیے گا۔ حالات یقیناً بہتر نہیں ہیں۔“ بات ختم کرتے ہی وہ قدموں پر دوسری جانب گھوما اور مکان کے مخالف جانب چل دیا۔ ڈوٹی کو کچھ دیر قبل کرے میں ابھرتے قدموں کی آہٹ یاد آئی۔ اس نے چلا کر چوکیدار کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ چوکیدار نے سپاٹ نگاہوں کے ساتھ ڈوٹی کی جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں کسی بھی قسم کے تاثرات موجود نہیں تھے۔

ڈوٹی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ابھی کچھ دیر قبل مجھے میری دکان سے فون آیا ہے۔ میں نے فون اٹھایا۔ تب کسی نے بات چیت کے بغیر فون بند کر دیا۔ تم

یقین جانو..... شام کو دکان بند کرنے سے پہلے وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بند دکان جس میں کوئی موجود نہیں ہو وہاں سے فون کیا جاسکے۔ میرے اندازے کے مطابق دکان میں چور گھس گئے ہیں۔ غلطی سے انہوں نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کر دیا۔ یوں مجھے پتا چل گیا۔“ ڈوٹی تفصیل بتانے لگا۔

”اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ہمراہ دکان کی جانب چلو۔ جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں تمہاری اس خدمت کا معاوضہ علیحدہ دوں گا۔“ چوکیدار نے کوئی بھی جواب دیے بغیر اثبات میں سر ہلادیا۔ ڈوٹی کا مقصد صرف گھر سے دور رہنا تھا۔ اس لئے اس نے جلدی سے گھر میں داخل ہو کر لباس تبدیل کیا اور چوکیدار کے ہمراہ دکان کی جانب چل دیا۔ راستے میں خاموش طاری رہی۔ ٹاؤن کی گلیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ انسانوں کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ دکان تک پہنچنے میں انہیں تقریباً دس منٹ لگ گئے۔ دکان کا شرٹاٹھا ہوا تھا اور شرٹے کا دروازہ چوچٹ کھلا تھا۔ وہاں گہما گہمی کا یہ عالم تھا کہ ایک گاہک اندر جا رہا تھا اور دوسرا باہر آ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھلونوں سے بھرے ہوئے شاپر تھامے ہوئے تھے۔ ڈوٹی کی آنکھیں حیرت کے مارے تقریباً پھٹے لگیں۔ اس نے چلا تے ہوئے اپنے پیچھے موجود چوکیدار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”انہیں گرفتار کرلو۔ یہ سب چور ہیں۔ میری دکان کا سامان چرا کر لے جا رہے ہیں۔ اسے اپنے پیچھے جواب سنائی نہیں دیا۔ ڈوٹی نے ہڑ بڑا کر پیچھے دیکھا۔ لیکن وہاں چوکیدار کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔

معاملہ ڈوٹی کے اختیار سے باہر ہو گیا۔ اور وہ چیختے چلاتے دکان کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ تب بے خیالی میں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے سڑک پر جا گرا۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ پوری طاقت کے ساتھ سڑک سے ٹکرایا۔ اسے رات کے وقت سورج طلوع ہوتا دکھائی

دیا۔ پھر چاروں جانب اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔

سانا کلازا کا پراسرار مجسمہ

صبح منہ اندھیرے ڈوٹی کی آنکھ کھلی۔ اسے اپنے سر میں شدید دھماکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارد گرد اب ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ہڑ بڑا کر دکان کی جانب دیکھا۔ شرٹ بند تھا۔ اور دکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ ڈوٹی نے سر کو ہلاتے ہوئے سوچا۔ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن فوراً ہی اسے اپنے خیال کو مسترد کرنا پڑا۔ اس کی سڑک پر موجودگی اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ وہ رات کو یقیناً یہاں تک آیا تھا۔ سر پر موجود گومڑ بھی اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ بدحواسی کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سڑک پر آ گرا۔ جس کے بعد اسے ہوش و حواس کی دنیا کو ترک کرنا پڑا۔

بہر حال وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے گہرے پڑتا گھر کی جانب چل دیا۔ دکان سے کچھ ہٹ کر اور رہائشی علاقے کے شروع میں اس نے تین چار پولیس والوں کو قصبے کے کچھ افراد کے ہمراہ کھڑے ہوئے دیکھا۔ ڈوٹی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ معاملے کے متعلق معلوم کرنے کے لئے ان سے بات چیت کرتا۔ اس لئے کسی کتزا کر گھر کی جانب جانے والی گلی میں مڑ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے گرم پانی میں نمک شامل کیا۔ اور غسل کرنے کے بعد ناشتہ تیار کرنے لگا۔ ریڈیو آن تھا۔ لیکن اس پر خبروں کا سلسلہ شروع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد ڈوٹی نے کپڑے تبدیل کئے۔ اس کی حالت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ آرام کرنا ممکن نہیں تھا۔ دکان کو شروع کے مراحل میں بند کر دینا اچھا نہیں تھا۔ اس لئے وہ خبریں سننے کے بعد دکان کی جانب چل دیا۔ موسم ابراہم لود تھا۔ اور خیر بستہ ہوائیں ٹیل ٹاؤن کو گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔ ڈوٹی نے دکان میں داخل ہوتے ہی گیس کا ہیئر آن کیا۔ اور کیش باکس کو چیک کرنے لگا۔ وہاں پچھلے دن والی رقم کے علاوہ مزید رقم

بھی موجود تھی۔ یعنی رات کے وقت مزید خریداری ہوئی تھی۔ اور یہ خریداری اس کی عدم موجودگی کے دوران پراسرار گاؤں کے ذریعے ہوئی تھی۔

اس نے پریشان لگا ہوں سے دکان میں طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ دکان میں بہت سے کھلونے کم تھے۔ یقیناً وہی خریدے گئے تھے۔ تمام کھلونوں پر پراسرار پرنٹ تھے۔ اس نے حساب لگایا۔ گزشتہ رات کی سیل کھلونوں کی فروخت کے مطابق تھی۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور سوچنے لگا۔ مقتل دکان کو پراسرار طریقے سے کھونے والے وہ پراسرار لوگ کون ہو سکتے تھے؟ جو اس کی دکان کو نقصان پہنچانے بغیر کھلونوں کی خریداری کے بعد دکان مقتل کے دہاں سے خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

اچانک ڈونی کی نگاہ سامنے موجود سانا کلاز کے مجسمے پر پڑی۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ لیکن سانا کلاز اور اس کے ساتھ کھڑی بوڑھی عورت کے مجسمے کے پاؤں میں پہنے ہوئے جوتوں پر خشک مٹی لگی ہوئی تھی۔

ڈونی کو اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلی رات ایسا نہیں تھا۔ ان دونوں مجسموں کے پاؤں میں موجود جوتے صاف ستھرے تھے۔ یقیناً رات کو خریداری کرنے والے گاہک کپڑوں سے بنے مجسموں کو اپنے ہمراہ لے کر باہر گئے ہوں گے۔ جوتوں پر لگی ہوئی مٹی کی گرد اچھی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ گاؤں کے آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ڈونی نے دونوں مجسموں کے پاؤں سے جوتوں کو اتارا اور انہیں اچھی طرح جھاڑنے کے بعد دوبارہ پہنانے لگا۔

ابھی وہ جوتے مکمل طور پر پہنانے نہیں پایا تھا کہ دکان کا دروازہ کھلا اور پولیس کے دو سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ڈونی مجسموں کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پولیس والوں نے ڈونی کے سر پر اچے کا جائزہ لیا۔ پھر ایک سپاہی بولا۔

”گزشتہ رات تمہاری دکان کے قریب شیل ٹاؤن کے ایک رہائشی کا قتل ہوا ہے۔ اسے اس کی لاش

اس کے گھر کے قریب سڑک پر پڑی ہوئی ملی ہے۔ گھر والوں کا کہنا ہے کہ رات کے تین بجے دروازہ کھٹکا۔ دروازہ کھولنے پر انہوں نے جس شخص کو سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ رہائشی علاقے کے مکانوں کی چوکیداری کرتا ہے۔ اور کچھ بات چیت کے لئے گھر کے سربراہ کو باہر لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وہ سانا کلاز کے لباس میں لبوس تھا۔ اس لئے گھر کا سربراہ اس کے ہمراہ باہر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ واپس نہیں آ سکا۔

صبح میں نے اپنے اسٹنٹ کے ہمراہ جب ٹاؤن کا راونڈ لگایا۔ تب اس آدمی کی لاش کو سڑک کے کنارے پڑے ہوئے پایا۔ اس کے سر کو ڈنڈا مار کر بھاڑ دیا گیا تھا۔ میں گاڑی لانے کے لئے واپس پولیس اسٹیشن کی جانب بھاگا۔ تب تمہیں میں نے دکان کی سڑھیوں کے پاس بے ہوش پڑے ہوئے پایا۔ گاڑی لانا ضروری تھا۔ اس لئے میں تمہیں نظر انداز کر کے پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ گاڑی کے ہمراہ جب واپس آیا۔ تب میں نے تمہیں غائب پایا۔ بہر حال دکان کھلنے پر ہم نے دوبارہ تعقیب کا آغاز کرنے کی ٹھانی اور پولیس اسٹیشن چلے آئے۔ اب تم ہمیں بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔“

بات کرنے کے دوران اس کی نگاہ دکان کا جائزہ لینے میں مصروف تھی بلکہ اطراف کا جائزہ لینے کے بعد سانا کلاز میں اور اس کے ساتھ کھڑی بوڑھی عورت کے مجسمے پر جم چکی تھی۔ ڈونی اس کی نگاہوں میں پوشیدہ خیالات کو کسی حد تک جان گیا تھا۔ کچھ بھی چھپانا اس کے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے حرف بہ حرف گزشتہ رات جیتنے والے تمام واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے۔

دونوں پولیس والے نہایت تجربات کے عالم میں اس کی بیان کردہ تفصیلات کو سنستے رہے۔ پھر پہلا پولیس والا بولا۔

”میرا نام سارجنٹ انتھونی ہے۔ میں تمہاری بیان کردہ کہانی کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن کیا تم

مجھے بتانا پسند کرو گے کہ سانا کلاز کا یہ مجسمہ تمہارا خود تیار کردہ ہے۔ یا پھر پہلے سے یہاں نصب تھا۔ سانا کلاز کا یہ مجسمہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یاد رہے گزشتہ رات والے قتل کے دوران قاتل نے سانا کلاز کا روپ دھارن کیا تھا۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”جب میں نے دکان خریدی۔ تب یہ تمام مجسمے پہلے ہی سے یہاں نصب تھے۔ مجھے کسی قسم کا سامان خریدنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ سوائے کسٹمری کے۔۔۔ جن کی خریداری دو دن پہلے کی تھی۔“

سارجنٹ انتھونی نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ پھر پوچھا۔ ”تمہاری بیان کردہ کہانی پر اسرار اور ناقابل یقین ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس میں رتی برابر بھی جھوٹ نہیں۔ اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران اب میں سامنے کھڑے شخص کی صورت دیکھ کر اس کے دل کا حال معلوم کرنے کی صلاحیت بخوبی رکھتا ہوں۔ تمہاری بیان کردہ کہانی یقیناً سچ ہے۔ یا پھر زماغ میں موجود خوف کی لہر کی بدولت تمہیں حقیقت کی صورت میں دکھائی دی ہے۔ جو بھی ہے تمہاری دکان کی نگرانی ضروری ہے۔ اس لئے میں دو ہندوں کو مکان کے باہر تعینات کر دیتا ہوں۔ یقیناً تمہیں اعتراض نہیں ہوگا۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں پولیس والوں نے سانا کلاز کے مجسمے کا تفصیلی جائزہ لیا اور دکان کی مختصر تلاشی لینے کے بعد باہر نکل گئے۔

”پراسرار انسانوں کی آمد“

اس دن کی مصروفیات کچھ خاص نہیں رہیں گاؤں کی تعداد کم تھی۔ بچے کھلونوں کی خریداری کے لئے آتے جاتے رہے۔ ڈونی کا دماغ بھی موجودہ صورت حال کی بدولت الجھا رہا۔ کام میں توجہ نہ ہونے کے برابر رہی۔ لیکن تمام دن کی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے میں کا سیاب ہوا کہ اسے کچھ دن دکان کے اندر ہی سونا چاہئے۔ دکان کی چھت پر کچھ موجود تھا۔ لیکن یہاں ہاتھ روم یا بجکن کی سہولت موجود نہیں تھی۔ یہ

کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے گھر جا کر ضروریات زندگی سے فارغ ہونے کے بعد کھانے پینے کے سامان کے ہمراہ واپس دکان میں آ سکتا تھا۔ اسے بمشکل آدھے گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ نہیں لگتا۔

سرشام اس نے دکان بند کی اور تیز قدموں کے ساتھ گھر کی جانب چل دیا۔ اس کی دکان پر متعین دونوں پولیس والے پانچ بجے کے بعد اچانک ہی غائب ہو گئے تھے۔ ڈونی نے گھر میں داخل ہو کر کافی اور سینڈویچ تیار کئے۔ پھر ہاتھ روم وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد تیز قدموں کے ساتھ دوبارہ دکان کی جانب چل دیا۔ ٹاؤن سنسان ہو چکا تھا۔ ڈونی آتے ہوئے اپنے ہمراہ ریڈیو بھی لیتا آتا تھا۔ اس نے دکان کے شیشے کے دروازے کو اندر سے لاک کیا۔ پھر ریڈیو آن کر کے خبروں کا پچھل لگا دیا اور خود کھانا کھانے لگا۔ مختصر خبروں کے بعد انٹرنس نے شیل ٹاؤن کی موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرنے کے بعد پولیس والوں کا بیان پیش کیا۔ جس کے مطابق ”آج کی تمام رات پولیس سیکورٹی مضبوط رکھنے کا اعلان کیا گیا تھا اور ٹاؤن کے افراد سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ کسی بھی صورت میں گھروں سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کریں۔ امیر جنسی کی صورت میں مختلف بتائے جانے والے نمبروں پر ڈائل کرنے کی صورت میں پولیس ان کے بتائے ہوئے ایڈریس پر جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرے گی۔“

خبریں ختم ہونے کے بعد ڈونی نے ریڈیو کو بند کر دیا اور خود اپنا بستر اٹھائے دکان کی اوپری منزل پر بنے ہوئے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس نے بستر بچھایا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔

شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ نیند اس کی نگاہوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے رہ رہ کر پولیس کی ناقص کارکردگی پر غصہ آ رہا تھا۔ ٹاؤن کا بازار اور رہائشی علاقہ سنسان پڑا تھا۔ پولیس کے گشت کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ ریڈیو پر بڑی بڑی باتیں کی جارہی تھیں۔ درنہ عملی اقدام نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈونی نے

گزشتہ رات کی طرح لائٹ بند نہیں کی تھی۔ لحاف منہ تک اوڑھ کر وہ خاموشی کے ساتھ لیٹ کر واقعات کے متعلق سوچتا رہا اور رات کے درج گئے۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ دکان کے اوپر سے اس مختصر کمرے کی اکلوتی کھڑکی بازار کی جانب کھلتی تھی۔ جب ڈونی لیٹے لیٹے اکتا گیا۔ تب اٹھ کر کھڑکی کی جانب چل دیا۔ اس نے کھڑکی کھولی۔ اور اسٹریٹ کی روشنی میں بازار کی دکانوں پر تفصیلی نگاہ دوڑائی۔ شہر بند تھے اور دروازے بند بازار سنان دکھائی دے رہا تھا۔ ڈونی نے سوچا کہ وہ سڑک سے اوپر دکان کی دوسری منزل پر کتنا محفوظ ہے۔ کھڑکی کھول کر باہر جھانک سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ سڑک کے درمیان میں کھڑا ہو جائے۔ تب اس کے وجود کے ساتھ بازار میں گھومنے پھرنے والا قاتل کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی سوچ دھری کی دھری رہ گئی۔ جب اس نے چار آدمیوں کو سامنے کی گلی سے نکل کر اپنی دکان کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے کھر کی بدولت غیر واضح دکھائی دیتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے سڑک پار کرنے لگے۔ انداز ایسا تھا۔ جیسے اسکول کی چھٹی کے بعد بچے سڑک پار کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

بہر حال سڑک عبور کرنے کے بعد انہوں نے ڈونی کی دکان کا رخ کیا۔ ڈونی کو دکان کا نچلا حصہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے جسم کو کھڑکی کے راستے آدھے سے زیادہ باہر نکالا اور نیچے جھانکا۔ دکان کا مزید کچھ حصہ دکھائی دینے لگا۔

دہاں لوگوں کا جھوم موجود تھا۔ وہ دکان میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ڈونی کو اپنے جسم کے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سخت سردی کے باوجود بھی اس کا جسم پسینے سے جھینگنے لگا اور اس نے جھٹکے کے ساتھ کھڑکی کو بند کر دیا۔ پھر اپنا ہوا اپنے بستر پر آ بیٹھا۔ وہ سوچنے لگا۔ ان پر اسرار لوگوں کا اس کی دکان کے ساتھ نہ جانے کیا تعلق ہے۔ وہ روزانہ رات کو وہاں آ کر خریداری

کرتے ہیں اور رقم کو کیش باکس میں رکھ جاتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تب رقم کیش باکس میں رکھے بغیر کھلونے خاموشی کے ساتھ ہمراہ لے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی ایمانداری کی انتہا تھی کہ وہ کھلونوں پر موجود رقم پڑھنے کے بعد اتنی ہی رقم کیش باکس میں رکھ کر کھلونے ہمراہ لے جاتے تھے۔ یعنی ان کی نیت بری نہیں تھی۔ ڈونی کو اپنے جسم میں موجود خوف کی لہر کم ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ معاملے کے متعلق معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ نیچے دکان میں جا کر۔۔۔ یقیناً وہ اسے نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ لیکن اگر وہ سڑکیوں کے پاس کھڑا ہو کر اپنی موجودگی کو پوشیدہ رکھتے ہوئے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا۔ تب یقیناً ان کے ارادے کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے لحاف ایک جانب رکھا اور دیوار کے ساتھ رکھی پردہ لٹکانے والی فالٹو پڑی اوپر کی راڈ کو اٹھایا۔ اور دروازہ کھول کر دے قدموں نیچے دکان کی جانب سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔

اسے مختلف لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت اہم موضوع زیر بحث بنا ہو۔ آخری میزگی کے پاس پہنچ کر اس نے احتیاط کے ساتھ سر آگے بڑھاتے ہوئے دکان کے اندر جھانکا۔ وہاں پردہ کے قریب لوگ موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر کے چہرے سب سے اترے جسم پر آگ سے جھلنے کے نشانات موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے جبکہ ایک نوجوان جوڑا ان سے کچھ ہٹ کر کاؤنٹر پر ایسے براہمان تھا کہ لڑکی کا سر لڑکے کے کاندھے پر ٹکا ہوا تھا۔ لڑکی زار و قطار رو رہی تھی۔ اور نوجوان اسے چپ کر دانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔

ڈونی نے زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔ ان میں مرد عورتیں بچے بوڑھے سب شامل تھے۔ اچانک نوجوان لڑکے نے لڑکی کے جسم کو ایک جانب ہٹاتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب دیکھا اور اونچی آواز میں بولا۔

”ڈونی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیڑھیوں سے اتر کر سامنے آ جاؤ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوئے ڈونی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے اوپری کمرے کی جانب بھاگنے کے متعلق سوچا۔ لیکن فوراً ہی خیال کو مسترد کر دیا۔ کمرے میں گھس کر بھلاہو کیونکر ان سے چھپ سکتا تھا۔ وہ با آسانی دروازے کو توڑ کر اسے گرفتار کر سکتے تھے۔ بہتری اسی میں تھی کہ وہ جیسا کہہ رہے تھے۔ خاموشی کے ساتھ ویسا ہی کرتا جائے۔

ڈونی نے حلق میں آتے ہوئے تھوک کو نگا اور کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر دکان کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ نوجوان لڑکا کاؤنٹر سے نیچے اتر آیا۔ زمین پر بیٹھے ہوئے افراد نے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ بے جان تراشے ہوئے بتوں کے ٹکسے ہوں۔ جن میں سے جان نکال لی گئی ہو۔ لڑکی اپنے چہرے پر موجود آئینوں کے ریلے کو صاف کرنے میں مصروف تھی۔ ڈونی کمرے کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ نوجوان نے تشکر بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈونی تمہاری دکان استعمال کرنے کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ لیکن مخدوش حالات کی بدولت مجبوراً ہمیں ایسا کرنا پڑا۔ میرا نام بل شیٹ ہے اور یہ میری بیوی این ہے۔ اگر اعتراض نہ ہو تو ہمارے ہمراہ بیٹھ کر ہمارے موجودہ مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔ ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا اور قریب ہی موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکا جس کا نام بل تھا۔ وہ دوبارہ کاؤنٹر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بلے ہوئے چہرے پر کڑھکی کے تاثرات نہیں تھے بلکہ معصومیت کا رجحان تھا۔ ڈونی کو اپنے دل میں اٹھتا ہوا خوف کم ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ پھر بل سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے یہ جان کر الجھن محسوس ہو رہی ہے کہ دکان کے باہر لگے گائے کو تم نے کیسے کھولا بلکہ آج تو دکان اندر سے لاک تھی۔ پھر بھی تمہاری موجودگی اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ تم نے دروازے کو پر اسرار طریقے سے کھولا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے تمہاری یہاں موجودگی کی وجہ بھی سمجھ نہیں آ رہی۔“

بل نے کچھ دیر خاموش ہو کر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ ”تالا کھولنا کسی انسان کے لئے مشکل ہوگا۔ لیکن رد میں اس سے بالاتر ہیں۔“

ڈونی کو اپنے جسم کے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے پھریری لی۔ پھر کرسی پر پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ بل بولے چلا جا رہا تھا۔ ”ہمیں اس دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ایک مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن ہم آج بھی در بدر ہیں۔ ہمیں کھوج ہے۔ اپنے بچے کی۔۔۔ شاید تم ہماری مدد کر سکو۔ ہمیں تم سے کوئی بھی غرض نہیں ہے۔ اس لئے کہ تم شیل ہاؤس کے رہائشی نہیں ہو۔ اگر ہو تو تب یقیناً جانو کہ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑتے۔“

ڈونی نے بے چین لہجے میں بات درمیان میں کاٹ دی۔ اور پھر پوچھا۔ ”تم مجھے مسئلہ بتاؤ۔ ہو سکتا ہے۔ میں اسے سلجھانے کا باعث بن سکوں۔ اگر ایسا نہ بھی ہو سکا۔ تب بھی کوشش ضرور کروں گا۔“

بل کاؤنٹر سے نیچے اتر آیا۔ اس نے کاؤنٹر کے دوسری جانب موجود کرسی کو گھمنا اور ڈونی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی این خاموشی کے ساتھ کاؤنٹر پر بیٹھی تھی۔

بل نے ڈونی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہتری اسی میں ہے کہ میں تمہیں اپنی آپ بیتی تفصیل کے ساتھ سنا دوں، مسئلے کے متعلق جانکاری کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔“ ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بل مسکرا ہوا۔

”پاگل بیتی“

”یہ آج سے تقریباً سو سال پہلے کی بات ہے۔“

یاشاید اس سے کچھ کم۔۔۔ مجھے صحیح طرح یاد نہیں ہے۔ لیکن ہم سب شیل ٹاؤن کے پاگل خانے میں زیر علاج تھے۔ پاگل خانے کے سربراہ کا نام ہنری ڈسن تھا۔ وہ نرم خور اور تنگھا ہوا انسان تھا۔ شیل ٹاؤن پاگل خانے کے تمام پاگل اسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ تھا بھی اسی قابل۔۔۔ میں نے اسے کبھی بھی کرخت لہجے میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آپ بیتی کی شروعات تب ہوئی۔ جب میری شادی این کے ساتھ ہونے لگی۔ میں اور این ایک دوسرے سے بے تحاشا محبت کرتے تھے۔ ہمارا علاج بھی تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ پاگل خانے سے فارغ ہونے میں صرف دو مہینے باقی رہ گئے تھے۔ سر ہنری ڈسن میرا امتحان لینے کے لئے مجھے ٹاؤن کے بازار میں بھیجا کرتے تھے۔ تاکہ میں سودا سلف کی خریداری کر کے انہیں اس بات کا یقین دلا سکوں کہ میرا علاج بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ میں اس امتحان میں پورا اتارنے کے لئے نہایت زور و شور سے کوششوں میں مصروف تھا۔ لیکن پھر نہ جانے کیسے تمام حالات مختلف رخ و ہارنے لگے۔ ہوا کچھ یوں۔۔۔ کہ شادی سے پہلے جب میں سودا سلف کی خریداری کے لئے پاگل خانے سے باہر ٹاؤن کے مختصر بازار کا رخ کرتا تھا۔ تب این ہمیشہ میرے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے درخواست کرتی تھی کہ بازار سے واپسی کے دوران میں اس کے لئے چاکلیٹ۔ چپس اور گلاب کے پھول لے کر آؤں۔ اسے پھول پسند تھے۔ میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ میں سودا سلف بعد میں خریدتا تھا۔ لیکن این کی فرمائش کروہ چیزیں پہلے اکٹھی کرتا تھا۔

پاگل خانے کے تمام ڈاکٹر نرسیں اور مزید اسٹاف ہماری محبت کے متعلق بخوبی جان چکے تھے۔ ہماری محبت کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹروں کی میٹنگ ٹیٹھی۔ جس میں فیصلہ ہوا کہ ہمارے سرپرست اعلیٰ سے اجازت لے کر شادی کر دی جائے۔ ہو سکتا ہے اس تجربے کے مثبت اثرات نمایاں ہوں۔ یوں ہماری

شادی ہوئی۔ اپنی شادی کا دن میں رفتی دنیا تک بھلا نہیں پاؤں گا۔ شادی کے بعد بھی ہماری محبت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ محبت بڑھتی چلی گئی۔ مجھے وہ دن نہیں بھولتا۔ جب پھر ڈے کے کسی تہوار کے دوران پاگل خانے میں پاگلوں کے علاوہ صرف سر ہنری ڈسن اور نوکر یا نرسیں موجود تھیں۔ تب پاگلوں کے لگا تا سرسار کے بعد سر ہنری ہمیں کہانی سنانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ رات کا وقت تھا اور خوشگوار بہار کے دن تھے۔

سر ہنری نے ہمیں اس رات جو کہانی سنا کی۔ اس کا نام بانسری والا تھا۔ اور کہانی کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

یاد رہے اس کہانی کا اس آپ بیتی کے ساتھ گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ اس لئے سنا ضروری ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک گاؤں میں جو بھوں کی تعداد یکفخت بڑھنے لگی۔ جب یہ تعداد خطرناک حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔ تب وہ ایک ایسے بانسری والے کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ جس کی بانسری کی دھن میں جاو جیسی تاثیر ہوتی ہے۔ بانسری والا گاؤں والوں کو جو ہے کی خطرناک بڑھنے والی تعداد سے نجات دلانے کے لئے رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ گاؤں والے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے اسے یقین دلاتے ہیں کہ کام مکمل ہو جانے کے فوراً بعد وہ معاوضہ اسے دے دیں گے۔ بانسری والا دوسرے دن صبح سویرے بانسری کی دھن جھپٹاتا ہے۔ تب تمام گاؤں کے چوہے بے خود ہو کر اس کے پیچھے پیچھے گاؤں سے باہر کا رخ کرتے ہیں اور پھاڑوں میں گم ہونے کے بعد واپس کا راستہ بھلا دیتے ہیں۔

گاؤں والے سکون کا سانس لیتے ہیں۔ لیکن حسب وعدہ بانسری والے کو معاوضہ دینے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ بے چارہ بانسری والا روتا دھوتا گاؤں سے کچھ دور جنگل میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرے دن وہ صبح سویرے نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں بانسری موجود ہوتی ہے۔ وہ بانسری کو اپنے

ہونٹوں کے ساتھ لگاتا ہے اور ایک ایسی دھن کا آغاز کرتا ہے۔ جسے سن کر گاؤں کے تمام بچے اچھلتے کودتے ہیں اس کے ہمراہ پھاڑوں کی جانب چل نکلتے ہیں۔ بانسری والا بچوں کو غار میں بند کر دیتا ہے۔ پھر گاؤں والوں سے اپنے معاوضے کا تقاضا کرتا ہے اور معاوضہ ملنے پر وہ بچوں کو رہا کر دیتا ہے۔

یہاں پہنچ کر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ہماری دروہجری کہانی کا آغاز اس کہانی کے اختتام کے بعد ہوتا ہے۔ کہانی سننے کے بعد جب میں نے اور این نے کمرے کا رخ کیا۔ تب این سوچوں میں گم تھی۔ وہ مجھ سے بات چیت نہیں کر رہی تھی۔ ایسا ہماری مختصر ازدواجی زندگی کے دوران پہلی دفعہ ہوا تھا۔ میں نے اسے کئی دفعہ اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ تب وہ خاموش ہی رہی۔ تنگ آ کر میں نے اپنا رخ مخالف جانب کیا۔ اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تب وہ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اٹھ کر آتش دان کے اوپر لگے فریم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ میں اس کی حرکات و سکنات کا بخور جائزہ لے رہا تھا۔ فریم میں ایسی تصویر موجود تھی۔ جس میں چار شخصے بنے بیچتو لیے میں لپٹے ہاتھ پاؤں ہلانے میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ تصویر کچھ عرصہ پیشتر این نے مجھ سے فرمائش کر کے منگوائی تھی۔ اور میں نے اسے آتش دان کے اوپر لگا رکھا تھا۔ وہ کچھ دیر تصویر کو محویت کے عالم میں دیکھتی رہی۔ پھر ایک بچے کے چہرے پر اٹھ کر رکھ کر آتش دان کے ساتھ ہٹکا ہوا ہوتی۔

”نبل ڈیئر۔۔۔ مجھے ایسا بچہ چاہئے۔ کیا تم مجھے لا دو گے۔ دیکھو انکار نہیں کرنا۔ میں بہت بے چین ہوں۔ مجھے بچے اچھے لگتے ہیں۔“

میں مسکراتے ہوئے ہمراہ تصویر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر محویت کے عالم میں بولے چلی جا رہی تھی۔

”تم نے ہمیشہ میری خواہشات کا احترام کیا ہے۔ میں نے تم سے جو بھی مانگا۔ تم نے مہیا کرنے کی کوشش کی۔ آج آخری دفعہ مانگ رہی ہوں۔ اس کے

بعد پھر کبھی نہیں مانگوں گی۔ مجھے ایسا بچہ چاہئے۔“ میں نے بخور بچے کی تصویر کی جانب دیکھا۔ وہ ایک دودھ پینے صحت مند بچے کی تصویر تھی۔ میں نے نہایت اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر تھری لپٹے میں لیے بولا۔

”کل صبح یہ بچہ تمہارے پاس موجود ہوگا۔“ اس نے بے ساختہ گھومتے ہوئے مجھ سے لپٹ کر اپنا سر میرے سینے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ڈیئر مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔“

دوسرے دن صبح سویرے میں انکل ٹام کے اسٹور کے سامنے کھڑا تھا۔ انکل ٹام کے اسٹور میں دودھ، وہی، اٹلے، مکھن، ڈبل روٹی اور غرض ناشتے میں استعمال کی جانے والی تمام اشیاء خورد و نوش دستیاب تھیں۔ اس لئے صبح سویرے ان کے اسٹور پر بے تحاشا رش پایا جاتا تھا۔ میں رش لگنے کے انتظار میں تھا۔ مجھے خریداری کی ضرورت نہیں تھی۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ انکل ٹام کی رہائش اسٹور کے پچھواڑے میں تھی اور راستہ کاؤنٹر کے پیچھے سے ہو کر نکلتا تھا۔ انکل ٹام کا دودھ پیتا بچہ اکثر صبح کے وقت گہری نیند سو رہا ہوتا تھا۔ اور ان اوقات میں مسز ٹام انکل ٹام کے ساتھ اسٹور میں ہاتھ بٹاتی دکھائی دیتی تھیں۔ یعنی میرے خیال کے مطابق اس وقت جو نیر ٹام کمرے میں تھا ہوتا تھا۔ میں رش کے دوران با آسانی بچے کو گھر سے اٹھا سکتا تھا۔ اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔ میرے ہاتھوں میں بانس کی بنی ہوئی بڑی باسکٹ موجود تھی۔ سوا سات بجے کے قریب گاؤں کا رش شروع ہوا۔ اور ساڑھے سات بجے تک رش نے شدت اختیار کر لی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے نوکری کو احتیاط کے ساتھ ہاتھوں میں تھا ہا اور اسٹور کے شیشے کے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ کھلنے پر مترن گھنٹیوں کی آواز سے ماحول گونگ اٹھا۔

مسز ٹام نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں

نے گد مار تھک کہہ کر انہیں مخاطب کیا۔ انگل نام نے مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ پھر انتظار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے گاہکوں کے ساتھ لین دین کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سبز نام بھی جلدی جلدی ان کا ہاتھ بنا رہی تھیں۔ میں نے چورنگا ہوں سے گاہکوں کی جانب دیکھا۔ ان میں سے کوئی بھی میری جانب متوجہ نہیں تھا۔ میں دے قدموں کے ساتھ کاؤنٹر کے آخری سرے کی جانب چل دیا۔ یہاں چپس کے کارٹن، میز کے ٹین، ڈبل روٹی کے پیگ موجود تھے۔ میں ان کی آڈیٹا ہوا کاؤنٹر کے چھلی جانب نظر آتے ہوئے رہا کئی کمرہ کے دروازے میں گھس گیا۔ یقیناً مجھے ایسا کرتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ شور مچا دیتا۔ سامنے مختصر گیلری بنی ہوئی تھی۔ جس میں آنے والے سامنے دو کمرہ کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ سیدھے ہاتھ والا دروازہ بیڈروم کا تھا جبکہ اگلے ہاتھ کی جانب والا دروازہ سیٹنگ روٹم کا تھا۔

میں نے بیڈروم والا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ پچ لکڑی کے پالنے میں نہایت گہری نیند سویا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ بچے کو کیبل کے ہمراہ اٹھایا اور باسکٹ میں ڈال کر دھککا بند کر کے مختصر کنڈی لگادی۔ پھر دے قدموں کے ساتھ راہداری سے ہوتا ہوا اسٹور کے دروازے سے باہر نکل کر کاؤنٹر کے سامنے گاہکوں کے رش میں شامل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔ تب انگل نام کی نگاہوں کا مرکز بن سکتا تھا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے والی مزاحمتیں میری پوشیدگی کا راز فاش کر دیتی۔ وہاں گاہکوں کے درمیان میں زیادہ دیر کھڑا رہنا بھی میرے لئے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ ابھی میں سوچ و بیمار میں مصروف ہی تھا کہ ماحول دروازہ کھلنے کی مزاحمتیں کی آواز سے گونج اٹھا۔ ایک گاہک اپنے دو عدد بچوں کے ہمراہ اسٹور میں داخل ہو رہا تھا۔ انگل نام نے گاہک کی جانب دیکھا۔ پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر

دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔

میں نے سوچ غمت جانا۔ اور تیزی کے ساتھ کھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔ مجھے اپنے پیچھے شیشے کے دروازے کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا اور باسکٹ کے ہمراہ پاگل خانے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ پاگل خانے کے مین دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد میں نے رہائشی کمرہ کا رخ کیا۔ پاگل خانے کے بہت سے اضافے میرا سامنا ہوا۔ لیکن انہوں نے بات چیت نہیں کی۔ کیونکہ وہ مجھے پاگل خانے سے باہر آتے جاتے دیکھنے کے عادی تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد این سے مخاطب ہوتے ہوئے پر جوش لہجے میں کہا۔

”ڈیز میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ یہ دیکھو تمہاری خواہش کو پورا کرنے کے لئے میں تمہارا بچہ ہمراہ لے آیا ہوں۔“

این نے بے تابانہ قدموں کے ساتھ آگے بڑھ کر ٹوکری کے اندر جھانکا۔ پھر خوشی سے چلاتے ہوئے بولی۔

”نیکل ڈیز۔۔۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر بھول نہیں پاؤں گی۔ تم نے مجھے ماں بنا کر مجھ پر احسان ہی تو کیا ہے۔ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ ہم اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا کر بھلا کہاں رکھیں گے۔ اگر انہیں اس نسخہ فرشتے کے متعلق بھوک بھی پڑ گئی۔ تب وہ اسے یقیناً ہم دونوں سے جدا کرنے کی کوشش کریں گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اگر ٹاؤن والوں کے علاوہ پاگل خانے والوں کو بھی بچے کی موجودگی کی بھوک پڑ جاتی۔ تب وہ یقیناً بچے کو ہم سے چھیننے کی کوشش کرتے۔ میں نے کچھ دیر سوچے رہنے کے بعد چٹکی بجاتے ہوئے این سے مخاطب ہو کر کہا۔

”پاگل خانے کا تہہ خانہ بچے کی پوشیدگی کے

لئے مناسب رہے گا۔ وہاں کوئی آتا جاتا نہیں ہے۔“

این انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”لیکن وہاں گہری کا معقول انتظام نہیں ہے۔ بچے کو سر دی لگ سکتی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم صدیوں سے بند پڑے اس آتش دان کی موجودگی سے بے خبر ہو۔ جو کھا کھاڑے کے سامان کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ لکڑیاں بھی پاگل خانے کے اسٹور میں بکثرت پڑی ہیں۔ ہم ان کے ذریعے تہہ خانے کو گرم رکھ سکتے ہیں۔ اب ہمیں دو باتیں ملحوظ نظر رکھنی ہیں۔ پہلی یہ کہ بچے کی بھوک کا مداوا کیونکر کیا جاسکے اور دوسری یہ کہ تہہ خانے کی صفائی کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر تمہارے پاس کچھ رقم موجود ہو۔ تب مجھے دوتا کہ میں سر ہنری کے اٹھنے سے پہلے دودھ والی بوتل اور دودھ خرید کر لاسکوں۔“

این نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر پریشان لہجے میں بولی۔ ”میرے پاس تو پھونکی کوڑی بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن میں سر ہنری کے کمرے کے خفیہ دروازے سے آگاہی رکھتی ہوں۔ جہاں وہ رقم سنبھال کر رکھتے ہیں اور وہ اسے تالا بھی نہیں لگاتے۔“

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ”تب پھر تم رقم کا بندوبست کرو۔ تاکہ میں باہر کے کام جلد از جلد نمٹا سکوں۔“ این نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے باسکٹ میں سوتے ہوئے بچے کی جانب دیکھا۔ وہ نہایت معصوم شکل بنائے گہری نیند سویا ہوا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد این دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ تو اس کے ہاتھوں میں رقم موجود تھی۔ میں نے رقم لے کر جیب میں رکھی۔ پھر این سے پوچھا۔ ”کسی کو خبر تو نہیں ہوئی۔“

این نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”سر ہنری سوتے ہوئے ہیں۔ کمرہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر نہایت آسانی کے ساتھ رقم حاصل کی۔ اور واپس چلی آئی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب تم پاگل خانے والوں کے اٹھنے سے پہلے تہہ خانے کو صاف کر کے اس قابل بنادو کہ وہاں ہمارا ننھا آرام و سکون کے ساتھ رہ سکے۔ میں دودھ والی بوتل اور دودھ لے کر ابھی واپس آتا ہوں۔“ این نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ خطرناک پاگلوں کی رہائش کا انتظام مختلف تھا۔ اس پاگل خانے میں علیحدہ کمرے کی سہولت بھی صرف مجھے اور این کو اس لئے حاصل تھی کہ ہماری شادی کو صرف تین ہی دن گزرے تھے۔ علاوہ ان میں علیحدہ کمرے کی سہولت عمارت تھی۔ میں نے پاگل خانے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا جب میں انگل نام کے جزل اسٹور کے پاس پہنچا۔ تب میں نے وہاں پولیس والوں کو موجود پایا۔ تمام ٹاؤن جزل اسٹور کے ارد گرد جمع تھا۔ شاید تفتیش کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ میں نے کئی کترائی اور ساتھ والی گلی میں گھستا چلا گیا۔ یہاں قریب ایک اور بڑا اسٹور بھی موجود تھا۔ میں نے وہاں سے دودھ کی بوتل اور دودھ خریدا۔ پھر خاموشی کے ساتھ پاگل خانے چلا آیا۔ این تہہ خانے کو صاف کرنے میں مصروف تھی۔ میں نے کام میں اس کا ہاتھ بنایا۔ جو نیز نام اٹھ چکا تھا۔ لیکن پیچھے چلانے کے بجائے حیرت بھری نظروں سے تہہ خانے کے اجنبی ماحول کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے این سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم دودھ گرم کرو۔ جو نیز نام کو روٹا نہیں چاہیے۔ ورنہ تہہ خانے سے باہر اسٹاف کو خبر ہو جائے گی کہ ہم یہاں بچے کو چھپائے ہوئے ہیں۔ تب وہ ہمارے لئے درو سری کا باعث بن سکتے ہیں۔“ این نے اثبات میں سر ہلایا اور میرے حکم کی تعمیل کے لئے پاگل خانے کے باورچی خانے کی جانب چل دی۔ تہہ خانہ صاف ہو چکا تھا۔ میں نے آتش دان میں لکڑیاں اٹھائی کر کے رکھیں۔ اور ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگادی۔

ماحول یک لخت گرم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر میں این دودھ گرم کر کے بوتل کے ہمراہ تہہ خانے میں لے آئی۔ جو نیز نام بھوک سے ہلک رہا تھا۔ دودھ پیتے ہی اچھلنے کودنے لگا۔ اور ابھی ہم اسے گود میں اٹھانے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ اس نے اپنے کپڑوں کو گلیا کر دیا۔ میں نے تھکی نگاہوں سے این کی جانب دیکھا۔ تب وہ پر جوش لہجے میں بولی۔

”ہمارے کمرے میں میرے دو خالو کپڑوں کے جوڑے موجود ہیں۔ میں انہیں کاٹ کر تہہ خانے میں لے آئی ہوں۔ اس کے کپڑوں کا اس سے بہتر انتظام مزید نہیں ہو سکتا ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ کچھ ہی دیر میں کپڑے کاٹ کر لے آئی۔ ہم نے جو نیز نام کے کپڑے تبدیل کئے اور اس کے ہمراہ کھیلنے لگے۔ نام ایک صحت مند خوب صورت اور مضل کھ بچہ تھا۔ وہ چیخنے چلانے یا بھگڑنے کے بجائے ہمارے ہمراہ خوشی کھیلتا رہا۔ اس نے رونے کی کوشش نہیں کی۔ این کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ ناشتہ کرنا بھی بھول چکی تھی۔ میرا دماغ مختلف سوچوں کے گھبرے میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے اوپر اپنے کمرے کا رخ کر لینا چاہئے۔ میری عدم موجودگی شک و شبہات کا باعث بن سکتی تھی۔ این اگر بچے کے ہمراہ تہہ خانے میں بھی رہتی۔ تب مضائقہ نہیں تھا۔ میں حالات کو سنبھال سکتا تھا۔ اس لئے میں نے این کو تہہ خانے سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کی اور خود دروازے کو بند کر کے کمرے کی جانب چل دیا۔ وہاں حالات نارمل تھے۔ میں نے غسل کیا۔ اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔

”پولیس کی آمد“

مجھے سوچتے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزر پائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ تب سامنے جوزف کو کھڑے ہوئے پایا۔ جوزف پاگل خانے کا سینئر درکار تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ نیچے ہال کمرے میں سرہنری ناشتے کی میز میرے اور این کے

منتظر تھے۔ ہماری شادی کے بعد تین دن مجھے ادرا این کو ناشتہ ڈانگ دم میں پاگل خانے کے ڈاکٹروں اور اسٹاف کے ہمراہ دیا جا رہا تھا۔ ذرا پاگل خانے میں موجود مزید پاگلوں کو یہ سہولت دستیاب نہیں تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ پاگل خانے کا زیادہ تر اسٹاف جھوٹی پر گیا تھا۔ گئے تھے لوگ باقی تھے۔ جو اپنے معمول کے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت ناشتے کی میز پر سوائے سرہنری کے علاوہ مزید کوئی ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ میں نے سرہنری کو سلام کرنے کے بعد کرسی کھسکا لی اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔ انہوں نے تھکی نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”این دکھائی نہیں دے رہی۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

میں نے پہلے سے گھڑا ہوا جھوٹا دہرا دیا۔ ”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات کے کھانے کے بعد سے جو کئی اور موٹن کار جان ہوا۔ تو ابھی تک جاری و ساری ہے۔“ سرہنری کے سامنے پر فکر انگیز لکیروں کا جال پھیلنے لگا۔ اور وہ پریشان کن لہجے میں بولے۔

”کچھ دوا وغیرہ کا انتظام کیا۔ اگر نہیں تو میں دیے دیتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دوسرا جھوٹا نہایت بے باکی کے ساتھ بول دیا۔ ”کمرے میں ٹیلیٹ موجود تھی۔ میں نے اسے دے دی ہے۔ اس سے افادہ بھی ہوا ہے۔ لیکن مٹلی کی بدولت اسے بھوک نہیں لگ رہی۔ اس لئے ناشتہ ہلکا پھلکا بعد میں کرے گی۔“ سرہنری نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی۔ میں نے بھی چائے کا پیالہ اپنے سامنے رکھا اور توس پر مکھن لگا کر آلیٹ کے ہمراہ کھانے لگا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے سرہنری چوکتے ہوئے بولے۔

”آج ناؤن میں عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ بقول جوزف کے..... نام میلسن کے گھر سے اس کے دودھ پیتے بچے کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ نجائے وہ کون مردود

ہے جسے دودھ پیتے بچے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔“ میں نے مکھن اور انڈا بھرے نوالے کے اوپر چائے کا برا سا گھونٹ بھرا۔ پھر چہرے پر مصہومیت کے تاثرات نمایاں کرتے ہوئے کہا۔

”پیارے انکل نام..... میں ہمیشہ ان کی دکان سے سودا سلف لاتا تھا۔ جو نیز نام کو میں نے بھی دیکھا تھا۔ بہت خوب صورت اور صحت مند بچہ تھا۔ کیا اس کی کشدگی کے بارے میں کچھ پتا چلا۔“ سرہنری نے آلیٹ کا ٹکڑا کاٹنے میں پھنسانے کے بعد میں رکھا اور چائے کے گھونٹ کے ساتھ نکلنے کے بعد جواب دیا۔ ”پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ لیکن تاحال کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آ سکا۔“ مختلف بات چیت کے بعد موضوع تبدیل ہو گیا۔ میں نے ناشتہ مکمل کیا۔ سرہنری نے مجھے این کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور میں اٹھ کر بن کی جانب چل دیا۔ میں نے جوزف کو کہہ کر این کے لئے مختصر ناشتہ ہمراہ لیا اور تہہ خانے میں آ گیا۔ این نے ناشتہ کیا۔ اس کے بعد باقی کا آدھا دن ہم دونوں بچے کے ہمراہ کھیلتے رہے۔

شام کو پولیس پاگل خانے میں موجود تھی۔ اور سارجنٹ انتھونی مجھے گھورے چلا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں جو نیز نام کی تصویر تھی اور چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ سرہنری بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہ کرفٹ لہجے میں بولا۔

”اسے پہچانتے ہو؟“ اس نے تصویر کو میرے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اقرار میں سر ہلادیا۔

”کون ہے یہ.....؟“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں مجھے دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

”انکل نام کا لڑکا..... جو نیز نام.....“ میں نے گھبرائے بغیر سیاٹ لہجے میں جواب دیا۔ کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہنے کے بعد وہ دوبارہ بھلکا م ہوا۔

”جو نیز نام اس وقت کہاں ہے؟ کیا تم اس کے

متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟“ میں نے دوبارہ اثبات میں سر ہلادیا۔ اس نے دوبارہ حیرت بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور بولا۔

”کیا تم واقعی بتا سکتے ہو کہ یہ اس وقت کہاں ہے؟“ اس دفعہ میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

”تم مجھے اتنی حیرت کے ساتھ کیوں دیکھ رہے ہو۔ میں یقیناً بتا سکتا ہوں کہ لڑکا اس وقت کہاں ہے۔“

”تب بھروقت ضائع کئے بغیر جلدی بتاؤ۔ اس کے ماں باپ بہت پریشان ہیں۔“ سارجنٹ نے پوچھا۔

”کیا مطلب پریشان ہیں۔“ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال کے مطابق جو نیز نام کو انکل نام کے گھر میں ہی ہونا چاہئے۔ وہ اگر ان کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ تب اس کی موجودگی کے لئے اس سے بہتر مزید جگہ نہیں ہونی چاہئے۔“ سارجنٹ انتھونی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر لفظوں کو چپاتے ہوئے بولا۔

”تم آج صبح انکل نام کے جنرل اسٹور میں کیا کرنے گئے تھے۔ بہت سے ناؤن والے تمہاری دہاں موجودگی کے غشی گواہ ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق بچے کی کشدگی سے کچھ پہلے کہیں نہایت مختصر وقت کے لئے اسٹور میں دیکھا گیا تھا۔ فوراً سے پیشتر اپنی دہاں موجودگی کی وجہ بیان کرو۔“ میں دوبارہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

”کسی جنرل اسٹور پر میری موجودگی کا مقصد اس کے علاوہ مزید کیا ہو سکتا ہے کہ میں سودا سلف لینے کی نیت سے ہی گیا ہوں گا۔“

”لیکن تم نے سودا سلف نہیں خریدا۔“ سارجنٹ انتھونی پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ میں نے مطمئن لہجے میں سوچا سمجھا جواب نہایت مصہومیت کے ساتھ دہرا دیا۔

”جب جب میں پیسے ہی موجود نہیں ہوں گے۔ تب خریداری بھلا کیونکر ہو سکتی ہے۔“ سرہنری کی نگاہوں میں شک و شبہات کی پرچھائیاں رقص کرتی

دکھائی دینے لگیں۔ ظاہر ہے وہ اس بات سے بخوبی آگاہی رکھتے تھے کہ مجھے آج کے دن سودا سلف لانے کے لئے پاگل خانے سے باہر نہیں بھیجا گیا تھا۔ پھر بھلا اٹکل ٹام کی دکان پر میری موجودگی کیا معنی رکھتی تھی۔

”دراصل بات کچھ یوں ہے۔“ میں معاملے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”سرہنری اس بات سے واقف ہیں کہ میری بیوی این کی طبیعت کل رات سے بہت خراب ہے۔ اسے کئی اور موٹن کی بیماری لاحق ہے۔ صبح پاگل خانے میں ابھی کوئی بھی سوکر اٹھ نہیں پایا تھا کہ میں نے باہر کارخ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اٹکل ٹام کی دکان میں مختصر میڈیسن بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن دکان پر پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ میں دم ہمارا لانا بھول گیا ہوں۔ اس لئے بغیر خریداری کے واپسی چلا آیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ کچھ ادویات کمرے میں موجود تھیں۔ اس لئے مجھے دوبارہ دکان پر نہیں جانا پڑا۔“

سارجنٹ اتھونی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”لیکن مجھے یہ اطلاعات بھی ملی ہیں کہ اس کے بعد تمہیں بازار میں دوبارہ دیکھا گیا۔ تم نے اس دفعہ جون کے جنرل اسٹور کارخ کیا اور وہاں سے دودھ خریدا۔ یہ ایک غیر فطری بات تھی کہ تم نے دوبارہ ٹام کی دکان کا رخ کرنے کے بجائے ایک مخالف دکان کی طرف جانا بہتر جانا۔ معلومات کرنے پر مجھے یہ بھی پتا چلا کہ یہ وہی وقت تھا۔ جب ٹام کی دکان میں تفتیش کا عمل شروع کیا گیا تھا۔“

میرے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو نوراً سنہال لیا اور مکمل خود اعتمادی کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی۔

”میں نے ہمیشہ خریداری کے لئے اٹکل ٹام کی دکان کا ہی انتخاب کیا ہے۔ لیکن دودھ لانے کے لئے جب میں نے ان کی دکان کا رخ کیا۔ تب شاید ان کی دکان پر تفتیش شروع ہونے کی بدولت رش کچھ زیادہ تھا۔ این کی ناساز طبیعت کو ٹھوٹو نظر رکھتے ہوئے میں نے اٹکل جون کی دکان پر جانے کو مناسب جانا۔“

سارجنٹ نے بات درسیان میں کاٹ دی۔ اور پوچھا۔ ”لیکن صبح تمہیں دودھ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”این کے لئے۔۔۔۔۔“ میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ ”میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس کی طبیعت کل سے ناساز ہے۔“ سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد دوبارہ ہلکا ہوا۔ ”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لوگوں کی افکار مشن کے بعد جب میں نے معلومات کا سلسلہ شروع کیا۔ تب پوچھ گچھ کرتا ہوا جون کی دکان تک جا پہنچا۔ جون نے مختصر بات چیت کے بعد اس بات کا اعتراف کیا کہ تم کچھ دیر پہلے اس کے اسٹور پر آئے تھے۔ مزید استفسار پر اس نے بتایا کہ تم نے دودھ کے علاوہ شیشے کی بوتل اور نیل کی خریداری بھی کی تھی۔ تمہارے بیان کے مطابق دودھ تمہاری بیماری بیوی این کے لئے تھا۔ لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ دودھ کی بوتل بھلا تم نے کس کے لئے خریدی تھی۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے۔“

مجھے اپنے سر پر ہاڑوٹا محسوس ہوا۔ دودھ این کے لئے لانا ممکن تھا۔ لیکن شیشے کی بچوں والی بوتل۔۔۔۔۔ میرے پاس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے آخری کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے دودھ کے علاوہ اٹکل جون کی دکان سے بوتل نہیں خریدی۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

اتھونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اسے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ لیکن تمہیں جھوٹ بولنے سے فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ تم نے بچے کو پاگل خانے میں چھپا رکھا ہے۔ اب سچ بتاؤ کہ بچہ کہاں ہے؟“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ بچہ پاگل خانے میں نہیں ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا۔ تب تم اسے پاگل خانے میں تلاش کر سکتے ہو۔“

سارجنٹ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں ایسا ضرور کروں گا۔“ اس نے خاموش بیٹھے سرہنری کی

جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔“ انہوں نے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلکا کرکھانی لینے کی اجازت دے دی۔

تلاش کا کام ہمارے کمرے سے شروع کیا گیا۔ این کمرے میں موجود تھی۔ شاید وہ تہہ خانے سے نکل کر ہماری مختصر بات چیت سن چکی تھی۔ کیونکہ اس کے چہرے پر ابھرنے کے تاثرات نہیں تھے۔ میں نے اسے حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ”سارجنٹ اتھونی جو نیزہ ٹام کی تلاش میں پاگل خانے کی تلاش لینا چاہتے ہیں۔ انہیں کچھ غلط فہمی لاحق ہو چکی ہے۔ اس لئے میرے مطمئن کرنے کے باوجود وہ ضد پراڑے ہوئے ہیں کہ پاگل خانے کی تلاش لئے بغیر وہ یہاں سے باہر نہیں جائیں گے۔“ این کے چہرے پر فکر مند کی تاثرات ابھرنے لگی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔ سارجنٹ اتھونی نے اپنے ماتحتوں کو تلاش کا حکم دیا اور پاگل خانے میں پھیلنے چلے گئے۔ سارجنٹ ہمارے کمرے میں چلا آیا۔ تقریباً یوں کھٹے کے بعد تمام پاگل خانے کی تلاش لی جا چکی تھی۔ لیکن بچے کا وہاں نام نشان بھی موجود نہیں تھا۔ سارجنٹ نے حیران ہو کر سرہنری کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہاں چھپنے کی مزید جگہ موجود ہے۔ مثلاً تہہ خانے یا پھر کوئی خفیہ کمرہ وغیرہ۔“

سرہنری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”تہہ خانہ موجود ہے۔ لیکن وہاں پر کاٹھ کباڑ کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں ہے۔“

سارجنٹ پر جوش لیجے میں بولا۔ ”تب پھر میں تہہ خانے تک لے چلے۔ ہم اسے چیک کرنا چاہتے ہیں۔ یقیناً بچہ تہہ خانے میں ہی چھپا یا گیا ہوگا۔“

”میرے ساتھ آئیے۔ میں آپ کو تہہ خانے میں لے جاتا ہوں۔“ سرہنری نے جواب دیا اور بچکن کے پاس واقع اسٹور روم کے اندر بنی تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب چل دیے۔ میں اور این بھی پریشان چہرہ لئے ان

کے ہمراہ تھے۔ سیڑھیاں اتر کر جب ہم سب تہہ خانے میں داخل ہوئے تب سرہنری کے علاوہ سارجنٹ کی آنکھوں میں بھی ابھرنے کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ صاف ستھرا تہہ خانہ جس میں سلنگا ہوا آتش دان اس بات کا مظہر تھا کہ وہ کسی کی رہائش کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ سرہنری کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے صاف کس نے کیا؟“

سارجنٹ اتھونی نے یکدم پوچھا۔ ”کیا آج سے پہلے یہ ایسا نہیں تھا۔“

”سرہنری نے انکار میں سر ہلایا۔ سارجنٹ کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ پھر اس نے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا۔ اور وہ تہہ خانے کی تلاش لینے لگا۔ میں نے کن آنکھوں کے ساتھ این کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات تھے۔ جیسے سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہو۔ اس کے علاوہ وہ مکمل طور پر خاموش رہی۔ تہہ خانے کی مکمل تلاش لی گئی۔ لیکن وہاں سے کسی بھی قسم کا سراغ نہیں مل سکا۔ یقیناً یہ سب این کی کارستانی رہی ہوگی۔ اس نے چھپ کر میری اور سارجنٹ کی بات چیت سننے کے بعد بچے کے علاوہ اس کے کپڑے اور بوتل بھی چھپا دی تھی۔ میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ سارجنٹ اتھونی کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

وہ طعنیہ لیجے میں بولا۔ ”ابھی سکون کا سانس مت لو۔ آگے بہت سے مرحلے باقی ہیں۔ تہہ خانے کی صفائی۔ آتش دان کی تیش اور تمہارے بچے کی بوتل کی خریداری اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ یہاں کوئی رہائش پذیر تھا۔ تہہ خانے کے استعمال کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پاگل خانے والوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہنا۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ لیکن جلد مکمل ثبوت کے ساتھ واپس آؤں گا۔“ اس نے پاؤں پٹختے اور تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔

”بچے کی موت“

سار جنت کے جانے کے بعد سرہنری نے ہم دونوں سے مختصر پوچھ گچھ کی۔ ان کی آنکھوں میں شک و شبہات کی پرچھائیاں موجود تھیں۔ یقیناً وہ یہ جان کر مایوسی محسوس کر رہے تھے کہ ان کا شادی والا تجربہ ناکام رہا تھا۔ بہر کیف انہوں نے زیادہ بات چیت کرنا مناسب نہیں جانا اور خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے این کا ہاتھ تھاما۔ اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے کے دروازے کو کئی لگانے کے فوراً بعد میں نے این کی جانب دیکھتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

”بچہ کہاں ہے؟ یقیناً اسے تم نے چھپا دیا ہوگا تاکہ ہم دونوں گرفتار نہ کر لئے جائیں۔“

این نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ”میں نے تمہاری اور سار جنت کی باتیں سن لی تھیں۔ میں نے بچے کو اس کے کپڑوں کے ہمراہ چھپا دیا۔ اور تم میری عقل کی داد دو گے کہ اتنے پولیس والے سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود بھی اسے تلاش نہیں کر پائے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے داد دینے کے بعد بچے کی پوشیدگی والی جگہ کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے فخریہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کپڑوں کے اس ٹریک کی جانب اشارہ کیا۔ جس میں ہمارے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا پولیس کے ساتھی نے اسے بھی کھول کر دیکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اپنے جسم کے روٹھے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اگر بچہ ٹریک میں مقفل تھا۔ تب پھر پون گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزرنے کے بعد نہ جانے اب تک زندہ ہو گیا یا نہیں۔۔۔۔۔؟

میں نے دوبارہ این کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔ اور بچہ ٹریک کے اندر ہی موجود ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے کند ذہن بچے کی مانند

اقرار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ یقیناً ٹریک کے اندر ہی موجود ہے۔ میرے خیال کے مطابق اس سے بہتر اور کوئی جگہ پاگل خانے میں دستیاب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔“

میں نے سر کو جھٹک کر دماغ میں اٹھتے ہوئے بگولوں کو منتشر کرنے کی کوشش کی اور پھر آگے بڑھ کر کپڑوں کے ٹریک کے ڈھکنے کو جھٹکے کے ساتھ کھول دیا۔ مختصر ٹریک نما چٹی اوپر تک کپڑوں سے بھری ہوئی تھی اور وہاں بچہ موجود نہیں تھا۔ میں نے اپنے پیچھے کھڑی این کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

تب وہ دوبارہ معصومیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”بچہ کپڑوں کے نیچے پوشیدہ ہے۔ اگر اسے اوپر ہی لٹا دیتی۔ تو اب تک پولیس والوں کے ہتھے ہم چڑھ چکے ہوتے۔“

میں نے زچ ہو کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اتنے کپڑوں کے نیچے بچہ کے زندہ رہنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہی رہ جاتے تھے۔ پھر بھی امید پر دنیا قائم ہے کہ مترادف میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ کپڑے ہٹانے شروع کر دیئے۔ میں جس کپڑے کے جوڑے کو بھی اپنی جگہ سے ہٹاتا تھا۔ وہ دوبارہ وہیں آگرتا تھا۔ جھنجھلا کر میں نے کپڑوں کو پھینکنا شروع کر دیا۔ این مجھے ایسا کرتے دیکھ کر قبضہ لگا کر ہنس پڑی۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ اس نے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا۔ اور مجھے ہاتھوں کے پاس سے تھام کر ٹریک کے پاس سے ہٹایا۔ اور ٹریک کے تقریباً اندر گھس کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ سردیوں کے کپڑے کچھ نہ کچھ تو یقیناً وزن رکھتے ہی ہیں۔ اسے کچھ وقت پیش آ رہی تھی۔ لیکن پھر چانک ہی اس کا متحرک جسم ایک نکتہ سا کرت ہو گیا۔ شاید وہ اپنے مخصوص مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پھر جب وہ باہر آئی۔ تب مجھے اپنا سانس حلق میں پھنستا محسوس ہوا۔ وہ بچے کو پاؤں کے پاس سے تھامے ہوئے تھی اور اس کی لاش این کے ہاتھ میں ایسے لٹکی ہوئی تھی۔ جیسے

مردہ مرغی کی کھال کو اتار کر سوپ والی ریڑھی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

این نے قہقہہ لگاتے ہوئے اسے سیدھا کیا۔ پھر بیسنے کے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”اسے سردی لگ گئی ہے۔ اس لئے خاموشی کے ساتھ ٹرک میں لیٹا ہوا تھا۔ ورنہ یہ چپ بیٹھنے والے کہاں ہیں۔“

میں نے افسردہ نگاہوں سے جونیر نام کی لاش کی جانب دیکھا۔ پھر این کو مخاطب کرتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ مر چکا ہے۔ تم بہت بڑے گناہ کی سرکب ہو چکی ہو۔ تمہیں اسے ٹرک میں بند بندیں کرنا چاہئے تھا۔“

این نے بچے کی لاش کو ہاتھوں میں بچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر میں ایسا نہ کرتی۔ تب پولیس والے اسے مجھ سے جھین لیتے۔ میں اسے اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دینا چاہتی۔“

”لیکن یہ مر چکا ہے۔“ میں نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ ”اب تم اسے مزید پاس نہیں رکھ سکتی ہو۔“

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“ این غراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”مرنے یا زندہ ہونے سے مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس کی جدائی میں برداشت نہیں کروں گی۔“

میں نے دوبارہ پریشان نگاہوں سے این کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر مستحکم تاثرات دیکھ کر میں معاملے کی گھمبیر تا کے متعلق بخوبی جان سکتا تھا۔ یعنی اگر میں اس سے بچے کو جینے کی کوشش کرتا۔ تب وہ انتہائی اقدام اٹھانے سے گریز نہ کرتی۔ اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے خاموش ہو گیا۔ وہ رات تک بچے کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی۔ رات کا کھانا میں نے اسے زبردستی کھلایا۔ کھانے کے بعد جب وہ مختصر وقت کے لئے ٹو اٹک گئی۔ تب میں نے بچے کی لاش کو اٹھا کر تہہ خانے میں موجود دکانیوں کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ پھر

مختصر کپڑوں کے ڈھیر کے ساتھ ایک مصنوعی گڑیا کا پلے ڈھنگا وجود بنا کر اسے کپڑوں میں لپیٹ کر بستر پر رکھ دیا۔ این نے اتھارہ روم سے باہر نکلتے ہی پہلی نگاہ بچے کے بے ڈھنگے وجود پر ڈالی۔ اس کے دماغ نے فوراً تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ لیکن میں نے معاملے کو سنہالنے ہوئے اسے سمجھایا کہ جونیر نام کو ٹرک میں سردی لگ کر بخار چڑھ گیا ہے۔ اس لئے میں نے اسے کپڑوں کے اندر اچھی طرح پیک کر دیا ہے۔ تاکہ اسے مزید سردی نہ لگ سکے۔ بہتری اسی میں ہے کہ اب اسے دوبارہ کپڑوں سے باہر نہ نکالا جائے۔ این نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ پھر کپڑوں پر مشتمل بے ڈھنگے وجود کو اٹھا کر بیسنے کے ساتھ لگا لیا۔ اور کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد دوبارہ بولی۔

”جونیر نام کا وزن بہت کم ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں شاید ایسا بخار کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہمیں اسے دودھ پلا دینا چاہئے۔ کہیں اس کی طبیعت مزید خراب نہ ہو جائے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہارا خیال نہایت عقلمندانہ ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ روم جانے کے بعد میں بچے کو دودھ پلا چکا ہوں۔ اب اسے صرف گہری نیند کی ضرورت ہے۔ تم اسے ہلائے بغیر بستر پر لٹا دو۔ تاکہ یہ پرسکون نیند سو سکے۔“

این نے اثبات میں سر ہلایا اور کپڑوں کے بے ڈھنگے وجود کو احتیاط کے ساتھ بستر کے کنارے پر لٹا کر اس کے ہمراہ بستر پر لیٹ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر لائٹ آف کر دی۔ پھر این کے ہمراہ بستر کے دوسری جانب لیٹ گیا۔ اور اس کے سونے کا انتظار کرنے لگا۔

”پاگل خانے میں آگ“ رات کے بارہ بجے کمرہ این کے خراٹوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ کھیل کو ایک جانب بنایا۔ اور بستر سے نیچے اتر آیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے۔ جوتے پہنے پھر نیچے تہہ خانے میں

بچے کی لاش اور کھدائی کے اوزار اٹھائے۔ اور نہایت خاموشی کے ساتھ پاگل خانے کی دیوار کو پھانڈ کر باہر نکل آیا۔ پاگل خانے کے گیٹ کو نہایت طاقتور تالے سے مقفل کر دیا جاتا ہے۔ یہ تالابج کے قریب کھولا جاتا ہے۔ پاگل خانے سے کچھ دور شیل ٹاؤن کا سرسبز و شاداب قبرستان واقع ہے۔ میں نے بچے کی لاش کو ایک جانب رکھا۔ اور زمین کھودنے لگا۔ مٹی ہموار در نرم مٹی۔ اس لئے قبر اتارسانی کے ساتھ کھدی چلی گئی۔ قبر اتار کرنے کے بعد جب میں نے بچے کی لاش کو اندر ڈال کر اسے ہموار کیا۔ تب شیل ٹاؤن کی جانب سے لوگوں کے چنچنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ہڑبڑا کر اوزار اٹھائے۔ اور یہ سوچتے ہوئے ٹاؤن کی جانب بھاگ کھڑا ہوا کہ شاید پاگل خانے والوں کو میرے باہر نکلنے کی اطلاع مل گئی ہے اور مجھے دھوڑنے کے لئے ٹاؤن کا رخ کر چکے ہیں۔ لیکن ٹاؤن میں پہنچ کر مجھے مختلف صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

لوگ جوتے در جوتے پاگل خانے کی جانب منہ اٹھائے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ میں نے پاگل خانے والی سمت نگاہ دوڑائی۔ وہاں آگ کے شعلے اٹھتے دکھائی دیے۔ میرے ہاتھوں سے اوزار چھوٹ کر نیچے گر گئے اور میں بھی سر پیٹ پاگل خانے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ عمارت کے قریب پہنچنے پر میں نے شعلوں کو آسان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ آگ باہر کے تمام راستوں کو گور کر چکی تھی۔ اس لئے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ لوگ باہر کھڑے تماشادیکھنے میں مصروف تھے۔ لیکن عملی قدم اٹھانے کی ہمت کسی میں بھی موجود نہیں تھی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر پاگل خانے کی دوسری منزل کی جانب دیکھا۔ وہاں تمام پاگل اور اسناف کے ہمراہ این بھی حیران و پریشان کھڑی نیچے کی جانب دیکھ کر مدد کے لئے چیخ رہی تھی۔ میں نے چلائے ہوئے ٹاؤن والوں کو پانی لانے کے لئے کہا۔ لیکن وہ ہونفوں کی طرح میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر ایک آدمی نے چلائے ہوئے بتایا کہ فائر بریگیڈ والوں کو فون کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان

کے آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے ٹاؤن کے رہائشیوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اگر فائر بریگیڈ والے صبح آئے تب کیا تم انہیں یوں جل کر مر جانے دو گے۔“ انہوں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”اگر ایسا ہوا۔ تب مزید کچھ سوچنا پڑے گا۔ لیکن اس وقت ہم ان پاگلوں کے لئے خود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔“ میں نے غصے کی شدت پر قابو پاتے ہوئے اس کے چہرے پر مکار سید کر دیا۔ وہ پیچھے کھڑے تماشائیوں کے درمیان جا کر۔ ابھی وہ پیچھے بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر پاگل خانے کے چلتے ہوئے دروازے میں سے اندر چھلانگ لگا دی۔ مجھے اپنے پیچھے لوگوں کے چنچنے چلانے اور روکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ لیکن میں نے توجہ نہیں دی بلکہ اندھا دھند دوسری منزل پر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بھاگتا چلا گیا۔ وہاں ہر جانب آگ کی پٹیلیں اٹھتی دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں میرے جسم کو آگ نے گھیرے میں لے لیا اور آگ اور دھوئیں کی بدولت بے دم ہو کر زمین پر گر جاتا چلا گیا۔ آگ میں گھسا تھاقت تھی اور فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس بات کی سمجھ مجھے اس وقت آئی جب وقت گزر چکا تھا۔“

میں اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پاگل خانے میں آگ کس نے لگائی تھی؟“

میں نے جواب دیا۔ ”این نے۔۔۔۔۔ اس نے مجھے جونیر نام کی لاش کے ہمراہ پاگل خانے کی دیوار کو پھلانگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میرے پیچھے وہ دیوار تو پھلانگ نہیں سکی۔ غصے کی شدت پر قابو نہ پاتے ہوئے اس نے تمام پاگل خانے کی دیواروں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ اس انتہائی کارروائی کے نتیجے میں میرے ہمراہ تقریباً تمام پاگل خانے کے عملے اور پاگلوں کی موت واقع ہوئی۔ یہ سب پاگلوں کی رحلیں

ہے۔ ”ڈونی بولا۔ ”تم خود بتاؤ۔ ردحوں کے حملے سے ٹاؤن والوں کو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہو۔ کیا پولیس کی نفری انہیں ان کے عزائم سے منع کر سکتی ہے۔ اگر ایسا کر سکتی ہوتی تو اب تک کرینکی ہوتی۔ پھر میری تدبیر کے مطابق اگر ہم یتیم خانے والوں سے رجوع کریں۔ اور ان سے کسی ایسے بچے کی دستیابی کا مطالبہ کریں جو دودھ پیتا ہو اور اس کے آگے پیچھے رونے والا کوئی نہیں ہو۔“

سارجنٹ نے انکار میں سر ہلایا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ”میں ایسے سفاکانہ عمل کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ تم خود سوچو کیا ایسے دودھ پیتے بچے کو ان ہاگل ردحوں کے حوالے کرنا عقل مند ہی ہوگی۔ جو یہ بھی نہیں جانتے کہ بچے کو ٹرک کے اندر کپڑوں کے نیچے بند کرنا بے فوٹی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہوا پر مشتمل وہ ردحوں بچے کی بھوک کا ازالہ کیسے کر پائیں گی۔ بوتل کو ہاتھوں میں تھامنے کے لئے بھی انہیں گوشت پر مزین ہاتھ چاہئے۔ جو ان کے پاس نہیں ہیں۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں بھی اتنا سنگدل نہیں ہوں کہ ایک دودھ پیتے بچے کو پاگل ردحوں کے حوالے کر دوں۔ میری تدبیر اس سے مختلف ہے۔ اور بات یوں ہے کہ ٹاؤن کے ایک گھر کو خالی کر کے ہاگل ردحوں کے لئے مختص کر دیا جائے۔ جہاں وہ بچے کے لئے با آسانی آجاسکیں۔ یتیم بچے کی نگہداشت کے لئے کسی عورت کا بھی بندوبست کر دیا جائے۔ عورت بچے کی نگہداشت کی ذمہ دار ہوگی۔ اس کے علاوہ دن کے باقی اوقات میں ردحوں بچے کے ساتھ اپنا دل بہلا سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی عرصے میں ردحوں کا دل بچے کے وجود سے بھر جائے گا اور وہ اسے چھوڑ کر کہیں اور چلی جائیں گی۔“

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد دوبارہ ہنگام ہوا۔ ”لیکن تم اس بات کو یکسر فراموش کر رہے ہو کہ ردحوں کا وجود ہوا پر مشتمل ہے جبکہ بچے کا گوشت سے مزین..... بھلا وہ بچے کے ساتھ کیسے دل بہلا سکیں گی۔

اگر وہ کھلونوں کے سخت دجود کا سہارا لیں گی تب بچہ شدید زخمی بھی ہو سکتا ہے۔“

”واقعی اس پہلو کے متعلق میں نے نہیں سوچا۔“

”ڈونی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن مجھے سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس مسئلے کے متعلق وہ خود سوچیں گی۔ میں رات کو تدبیر ان کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ دیکھنا وہ کیا جواب دیتی ہیں۔“

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دکان سے باہر نکل گیا۔

”گمشدہ بچے“

رات کے بارہ بجے تمام ردحوں دکان کے اندر موجود تھیں۔ این اور بیل کی روح کاؤنٹر پر بیٹھی تھیں۔ جبکہ باقی سب حسب معمول نیچے زمین پر..... این کے چہرے پر ادا کی کے تاثرات تھے اور بیل تاسف بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ڈونی نے جب اپنی تدبیر بیل کے سامنے دہرائی۔ تب بیل انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”نہیں ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔ این بچے کی جدائی برداشت نہیں کر پائے گی۔ یہ تدبیر ناقابل عمل ہے۔ تم کچھ مزید سوچو۔ کل کرکس کی رات ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم ضرور کوئی بہتر حل تلاش کر لو گے۔“

ڈونی نے بیچارگی کے عالم میں بیل کی روح کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ میں تمہارے غمخیز مسئلے کا حل تلاش کر پاؤں گا۔ مسئلہ کا حل ڈھونڈنا آسان نہیں ہے۔ اگر تم خود ایسا کر دو تب زیادہ بہتر ہوگا۔“

بیل بولا۔ ”ہمارے پاس مسئلے کے حل کے بجائے انتقام لینے کی تدبیر موجود ہے۔ کارروائی کے متعلق تمہیں کل معلوم ہو جائے گا۔ اب کی رات ٹاؤن میں ہماری آخری رات ہے۔ کل سے ہم ٹاؤن کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ لیکن اپنے پیچھے پر چھائیوں کی چھاپ چھوڑ جائیں گے۔ تاکہ آئندہ آنے والی شلیں ہمیں یاد رکھ سکیں۔“

”تم کیا کرنے والے ہو؟“ ڈونی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں.....“ بیل سپاٹ لہجے میں بولا۔

”کل تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔“

اس مختصر بات چیت کے بعد تمام ردحوں وقتاً فوقتاً غائب ہونے لگیں۔ ڈونی نے کاندھے اچکائے اور دکان کے اوپر بے اپنے رہائی کمرے کی جانب چل دیا۔ کمرے میں بستر لگا ہوا تھا۔ ڈونی نے لحاف کو سر تک اڑھا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات نہایت سرد اور طویل ثابت ہوئی۔ تمام رات طوفانی ہواؤں کی بدولت ٹاؤن کا ماحول سنسناتا رہا۔ صبح کے قریب خاموشی طاری ہو گئی۔ ڈونی نے اٹھ کر کانی کے لئے پانی الیکٹرک ہیٹر پر رکھا۔ اور کمرے کی کھڑکی کو کھول دیا۔ آسمان سفید بادلوں کے گھیرے میں تھا۔ روٹی کے سفید گالوں کی بدولت منظر صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ٹاؤن کی سڑکیں برف کی بدولت سفید ہو رہی تھیں۔ ماحول نہایت سرد اور برفیلا تھا۔ اس نے جبر جبری لئے کر کھڑکی کو بند کیا۔ پھر کانی پینے کے بعد تیار ہو کر دکان میں چلا آیا۔ حالات معمول کے مطابق تھے۔ لیکن دکان کے درمیان میں سے سانا کلاز کا مجسمہ غائب تھا۔ اس نے حیران ہو کر دکان کا مزید جائزہ لیا۔ مجسموں کے علاوہ باقی سامان موجود تھا۔ جونی نے سوچا۔ یقیناً بیل اور این کی روح مجسموں کے ہمراہ لے کر جا چکی ہیں۔ شاید انہیں اسے مقصد کی کامیابی کے لئے مجسموں کی ضرورت پڑ گئی ہوگی اور یقیناً کچھ ہی دیر میں ان کی انتہائی کارروائی نمایاں ہونے والی تھی۔ اس نے سر کو جھٹکا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

دکان میں آدھا دن نہایت مصروفیت کے عالم میں گزر گیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کا وقت بھی نہیں مل سکا۔ لیکن سہ پہر چار بجے کے قریب اچانک ہی بازار میں بے چینی کی کیفیت پھیلنے لگی۔ ماحول سرگوشیوں کی بدولت محسوس پیدا کرنے لگا۔ ڈونی نے سمجھا کہ ایسا شاید پانچ بجے بازار بند ہونے کی وجہ سے ہے۔ لیکن

سرگوشیوں کے سلسلے نے جب بڑھتے بڑھتے شور و شرابے کی صورت اختیار کر لی۔ تب اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ وجہ معلوم کرنے کے لئے دکان سے باہر نکل آیا۔ لوگوں کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات تھے اور ان کے درمیان میں سارجنٹ انٹونی کھڑا دلا سہ دینے میں مصروف تھا۔ ڈونی نے آگے بڑھ کر سارجنٹ انٹونی سے معاملے کے متعلق دریافت کیا۔

تب سارجنٹ بولا۔ ”ٹاؤن کے پندرہ بچے اچانک ہی لاپتہ ہو گئے ہیں۔ ان کے ماں باپ کا کہنا ہے کہ بچے اپنے دوستوں کے ہمراہ قریبی پارک کی جانب گئے تھے۔ پھر ان کے چند دوست واپس آ گئے زیادہ تر واپس نہیں آئے۔ گمشدہ بچوں کے دوستوں سے پوچھ گچھ کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ پارک کے باہر سانا کلاز بارہ بجے کے ساتھ جتی ہوئی کبھی میں موجود تھا۔ بچوں نے کبھی میں بیٹھنے کا تقاضا کیا۔ تب سانا کلاز نے انہیں کبھی میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اس کے ہمراہ ایک بوڑھی عورت بھی براجمان تھی۔ جس کے ہاتھوں میں لاٹھی موجود تھی۔ لاٹھی کے اوپر عقاب کی تصویر نقش تھی۔ سانا کلاز نے بارہ بجے کو چابک رسید کیا۔ تب بارہ بجے ٹاؤن سے کچھ ہٹ کر جنگلات کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ بارہ بجے کی سواری اور سانا کلاز دوبارہ دکھائی نہیں دیا۔ تب بچے مایوس ہو کر ٹاؤن کی جانب چلے آئے۔“

ڈونی نے سارجنٹ انٹونی کو دکان میں آنے کی دعوت دی اور دکان کی جانب چل دیا۔ سارجنٹ انٹونی اس کے پیچھے تھا۔ دکان میں داخل ہونے کے بعد ڈونی نے سانا کلاز کے مجسموں کی خالی جگہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دونوں مجسموں کو بیابان سے چرایا گیا ہے۔ بارہ بجے اٹھ اور تھ انہیں کہاں سے دستیاب ہوا۔ میں نہیں جانتا۔“

سارجنٹ انٹونی نے جگہ کا معائنہ کیا۔ پھر ڈونی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”یقیناً وہ ایسا کچھ دن پہلے بھی کر چکے ہیں۔ اور

Dar Digest **42** March 2013

لیتے ہوئے کہا۔

”یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔ اب مجھے سارجنٹ انٹونی کو پاگلوں کی روحوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ٹاؤن والوں کے حق میں وکالت کرنی ہوگی۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ اتنے تردد کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک دفعہ ان پاگلوں کو میرے سامنے کھڑا کرو۔ پھر دیکھو میں انہیں کیسے سیدھا کرنا ہوں۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر پانچ سو سال پہلے کے بچے نہ بن گئے۔ تب میرا نام بدل کر انٹونی کے بجائے مارکونی رکھ دینا۔“

ڈونی نے حیرت بھری نگاہوں سے سارجنٹ انٹونی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”سارجنٹ تم شاید بھول رہے ہو کہ ان پاگلوں کی روحوں گوشت پوست کے اجسام کے ساتھ قطع تعلق کر چکی ہیں۔ اب وہ ہوا پر مشتمل روحوں ہیں۔ جن پر تشدد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کر سکتے ہو۔ تب وہ نیچے موجود ہیں۔ تم بخوشی کر لو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ جہاں تک میرے مشورے کا تعلق ہے تو وہ یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ اور صلح و صفائی سے اسے حل کرنے کی کوشش کرو۔ چننا چلانا۔ بارنہا دھڑانا۔۔۔۔۔ کسی انسان کے معاملے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ روحوں کے معاملے میں نہیں۔ اور روحوں میں بھی پاگلوں کی روحوں۔۔۔۔۔ جنہیں عام حالات میں سمجھنا ہی ممکن نہیں۔۔۔۔۔ یہاں تو معاملہ عام حالات سے تجاوز کر چکا ہے۔“ ڈونی لحد بھر کے لئے سانس لینے کے لئے رکا۔ پھر دوبارہ بولا۔ ”اب اگر نیچے آنا چاہتے ہو۔ تب خاموشی کے ساتھ آ جاؤ۔ نہیں آنا چاہتے تب نہیں بیٹھے رہو۔ میری جانب سے کسی پر بھی زور و زبردستی نہیں ہے۔“ اس نے بات ختم کی اور نیچے دکان کی جانب چل دیا۔

ٹیل اور این کی روحوں کرسیوں پر براجمان تھیں۔ ڈونی کوئی بھی بات کہنے بغیر درمیان دالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سڑکیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ایک ایک کر کے بچوں کے والدین خوفزدہ چہرہ لئے نمودار ہونے لگے۔ ان کی نگاہوں کا مرکز ٹیل

اور این کی روحوں تھیں۔ شاید عام حالات میں وہ بھی ان روحوں کا سامنا کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ لیکن آج تو بات ان کے بچوں کے ساتھ منسلک تھی۔ اس کے علاوہ ڈونی کا وہ بھی ان کے لئے تسکین کا باعث بن رہا تھا۔ جوج کی کرسی پر ٹیل و دار کے ساتھ براجمان تھا۔ سب سے آخر میں سارجنٹ انٹونی سڑکیوں سے کود کر دکان میں داخل ہوا۔ اس نے بھی حیرت بھری نگاہوں سے ٹیل اور این کی روحوں کی جانب دیکھا پھر مزید بات کہنے بغیر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈونی نے تفصیلی نگاہوں سے دکان میں بیٹھے تمام افراد کا جائزہ لیا۔ پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔

”مقدمے کی روداد“

”مجھے ٹیل ٹاؤن آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا اور آج یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے کہ میں وقتی طور پر ہی تھی۔ لیکن یہاں پر وقوع پڑ رہے ہوئے دالے پوچھہ کیس کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ آپ سب یقین چاہیے کہ مجھے ایسا کرنے کا رتی برابر بھی شوق نہیں۔ لیکن ٹیل اور این کی روحوں کی بدولت ایسا کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ وہ اس کیس کے لئے کسی ایسے افراد کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا تعلق ٹیل ٹاؤن سے کسی بھی صورت میں بھی نہیں نہ رہا ہو۔ ایسا شخص میرے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے میرے ساتھ بات چیت کر کے مجھے معاملے میں مداخلت کرنے کی درخواست کی۔ جسے میں نے صرف انسانیت کے ناطے مجبور ہو کر قبول کر لیا۔ ورنہ میرا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اب ہم کیس کی جانب آتے ہیں۔

میرے دونوں مظلوم ساتھیوں ٹیل اور این کے دلوں میں ٹاؤن والوں کے خلاف چند غلط فہمیاں موجود ہیں۔ جنہیں میں معاملے کے شرور میں ہی رفاغ و دفاع کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ آج سے ایک ماہ ٹیل ٹیل ٹاؤن کے پاگل خانے میں آگ لگ گئی تھی۔ جس میں بہت سے پاگلوں کے علاوہ ٹیل اور این

کی موت بھی واقع ہوئی تھی۔ لیکن ٹاؤن کے کسی بھی فرد نے آگے بڑھ کر ان لاچار پاگلوں کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ وہ پہلی غلط فہمی تھی۔ جس کی بنا پر ٹیل اور این کے دلوں میں نفرت کا جوالہ کھٹکی پھٹنے لگا۔ اور اس نفرت کی بناء پر ان روحوں نے پندرہ کے قریب انسانوں کی جان لے لی۔ سارجنٹ انٹونی کیا تم اپنا موقف پیش کرنے کی کوشش کرو گے کہ ایسا کیوں کیا۔ یاد رہے۔ موقف ایسا ہونا چاہئے جو ٹیل اور این جیسی معصوم روحوں کے دلوں میں موجود غلط فہمی کو ختم کر سکے۔“ سارجنٹ انٹونی نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”ٹیل ٹاؤن کے پاگل خانے میں جب آگ لگی۔ تب میں وہاں موجود تھا۔ آگ نے اتنی شدت کے ساتھ خطرناک صورت اختیار کی کہ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آگ جان بوجھ کر اور مٹی کا تیل چھڑک کر لگائی گئی ہو۔ تمام پاگل آگ سے گھبرا کر دوسری منزل پر چڑھ دوڑے۔ ہمارے پاس آگ پر قابو پانے کے لئے مناسب سامان موجود نہیں تھا۔ اس لئے ہم نے قریبی شہر کے فائر بریگیڈ کے عملے کو فون کیا۔ انہیں ٹاؤن تک پہنچنے میں دیر لگی اور یوں عمارت جل کر خاکستر ہو گئی۔ ہم باہر کھڑے ان مظلوم افراد کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکے۔“ سارجنٹ خاموش ہو گیا۔

ڈونی نے تھیں نگاہوں سے ٹیل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹیل ڈیز۔۔۔۔۔ تمہارا اس کیس کے متعلق کیا موقف ہے۔ اگر بتانا چاہتے ہو۔ تب کرسی سے کھڑے ہو کر بتا سکتے ہو۔“

ٹیل طویل سانس لیتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ پھر نہایت رنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے بولا۔ ”ہم اس بات سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں کہ فائر بریگیڈ کی سہولت ٹاؤن میں موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر ٹاؤن کے افراد آگ کو بجھانا چاہتے۔ تب یقیناً ایسا کر سکتے تھے۔

ٹاؤن میں پانی کی کمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ دروازے کو توڑ کر پاگل خانے میں داخل ہونے کی کوشش کرتے۔ تب بھی اندر ٹھس کر بہت سے افراد کی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ صرف یہ سوچ کر۔۔۔۔۔ کہ مرنے والے پاگل ہیں اور انہیں بچانے کے لئے آگ میں کودنا حماقت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اس لئے انہوں نے مرنے کے لئے بے یار مددگار چھوڑ دیا۔“ ٹیل خاموش ہو گیا۔

ڈونی نے اس دفعہ سارجنٹ انٹونی کی جانب سنجیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے جواب دینے کی پینش کی۔ سارجنٹ بھی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”ایسا سوچنا بھی تمہاری بے وقوفی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ ہم نے اندر داخل ہونے کی کوشش صرف اس لئے نہیں کی کہ اندر سب پاگل تھے۔ اگر تم بات کو ایسا رخ دینا چاہتے ہو۔ تب مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم نے آگ میں کود کر پاگل خانے کی دوسری منزل پر جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صرف اپنی بیوی کو بچانے کے لئے۔ کیا تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ نہیں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکا۔ اور بدلے میں تم کو اپنی جان سے ہاتھ دھوئے پڑے۔ رہی پانی سے آگ بجھانے کی بات۔ تو اس کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں کہ پاگل خانے میں آگ سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر لگائی گئی تھی جس کی بدولت آگ نے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ شدت اختیار کی اور کچھ دیر میں پاگل خانے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں اس بات کی حقیقت سے بھی آگاہی رکھتا ہوں کہ ایسا کس نے کیا۔ مجھ سے زیادہ اس حقیقت کے بہت سے پوشیدہ معاملوں کے متعلق تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ لیکن یہاں میں صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ ایسا تمہاری بیوی نے اپنے انتہائی جذبے کی تسکین کے لئے کیا تھا۔ جس کی پاداش کے لئے بہت سے بے گناہ پاگلوں کو موت کو مجبوراً گلے لگانا پڑا۔ اگر میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ تو کیا تم میرے اس سوال کا جواب دینا چاہو گے کہ تمہاری بیوی نے ایسا کیوں

بل غصیلہ لہجہ میں بولا۔ ”صرف ایک بچے کے وجود کے حصول کے لئے..... اس تمام معاملے کے پیچھے ایک مانتا کی دلگداز کہانی کے علاوہ مزید اور کچھ بھی نہیں پایا جاتا۔ زندگی تو ختم ہو ہی گئی ہے۔ اس لئے اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انگل نام کے بچے کو میں نے ہی اغوا کیا تھا۔ لیکن این کی معصوم فطرت یا پھر پاگل پن کے بدولت بچہ مر گیا۔ این اس کے مردہ وجود سے دور نہیں ہوتا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے چپ کر بچے کے وجود کو قبرستان میں لے جا کر دفنایا۔ لیکن مانتا کی ماری این کو خبر ہو گئی۔ اور اس نے میری غیر موجودگی میں انتقامی جذبے کے تحت پاگل خانے کو آگ لگا دی۔

میں ڈوئی کو پہلے بتا چکا ہوں کہ این کو جیتا جاگتا بچہ چاہئے۔ میں اسے ہر طرح بھلائے پھسلانے کی کوشش کر چکا ہوں۔ لیکن مقصد میں کامیاب نہیں ہو پایا۔ اس لئے میں نے تم سے رجوع کیا کہ شاید تم کوئی حل تلاش کر سکو۔ لیکن تم نے بھی معاملے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور ہم نے کافی سوچ بچار کے بعد انتہائی اقدام اٹھانے کی کوشش کر ڈالی۔“

ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور سارجنٹ انتھونی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن وہ انتہائی اقدام بچوں کے اغوا سے متعلق ہے۔ بل کیا تم بتا سکتے ہو کہ بچے اس وقت کہاں ہیں؟“

نیل نے اثبات میں سر ہلایا اور جواب دیا۔ ”ٹاؤن سے ہٹ کر جنگلوں کے درمیان پوشیدہ ایک غار میں بچے محفوظ ہیں۔ میں نے اور این نے سرڈی کا اطمینان بخش انتظام آگ کی صورت میں کیا ہے۔ یقیناً تمہارے دماغوں میں یہ سوال گردش کر رہا ہوگا کہ ہوا پر مشتمل ردحوں نے آگ کیونکر روشن کر لی تو اس کا جواب یوں ہے کہ یہ کام ہمارے کہنے کے مطابق بچوں نے خود کیا ہے۔ وہ سب وہاں نہایت اطمینان د سکون سے ہیں۔ ہماری ساتھی رخصانہ ان کی حفاظت کے لئے غار کے ارد گرد موجود ہیں۔“ ڈوئی نے بچوں

کے والدین کی جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ میں سے کوئی ان سے سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ تو پوچھ سکتا ہے۔“ کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ سب خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

پھر ایک آدمی ہمت کر کے کھڑا ہوا۔ اور ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”جناب ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے بچے خوش و خرم جنگل کی غار میں محفوظ ہیں۔ لیکن یہ جان کر افسوس محسوس ہوا کہ اب ہمیں ان سے ملنے کے لئے موضوع اوقات کا انتظار کرنا ہوگا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ ایسی کون سی شرائط ہیں جن پر پورا اترنے کے بعد ہم اپنے بچوں کے حصول کو ممکن بنا سکیں گے۔“

نیل نہایت انکسارانہ لہجہ میں بولا۔ ”میں پہلے کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ ہمیں صرف ایک جیتے جاگتے بچے کا حصول چاہئے۔ آپ یقیناً جانیے کہ آپ سب کو پریشان کر کے مجھے اور این کو قطعاً خوشی محسوس نہیں ہو رہی۔ لیکن میں کیا کروں اپنی بیوی کی محبت کے لئے ہر جائز و ناجائز قدم اٹھانے کے لئے مجبور ہوں۔ اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ شرائط پوری کرنے کے بعد دوبارہ ٹاؤن کا رخ نہیں کروں گا۔“

کمرے میں دوبارہ خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر بندہ سوچ و بچار میں گم تھا۔ ردحوں کی عجیب و غریب شرائط پر پورا اترنا ان میں سے کسی کے بھی اختیار میں نہیں تھا اور شرط کو پورا کئے بغیر انہیں بچوں کا واپس ملنا بھی ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب اپنے دماغوں کو ایک عجیب گھن چکر میں مبتلا محسوس کر رہے تھے۔ پھر اس خاموشی کو ٹاؤن کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے توڑا۔ وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کی شرائط پر پورا اترنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میرے محدود دماغ کے مطابق اس کے علاوہ مسئلے کا مزید حل دستیاب

نہیں ہو سکتا کہ تمام ٹاؤن میں سے کوئی ایسا گھرانہ قربانی دینے کے لئے تیار ہو سکے۔ جس کے گھر میں دودھ پیتے بچے کے علاوہ مزید بچوں کی زیادہ تعداد موجود ہو۔ اور وہ اپنا دودھ پیتا بچہ این کے سپرد کر کے ردحوں کی شرائط پر پورا اترنے کے بعد ٹاؤن والوں کے بچوں کی بازیابی کا باعث بن سکے۔“

ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر سامنے بیٹھے ہوئے چندہ کے قریب ٹاؤن کے افراد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہاں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو قربانی دینے کے لئے بچوں کی رہائی کا باعث بن سکے؟“ کمرے کے ماحول میں دوبارہ گھمبیر خاموشی طاری ہوئی چلی گئی۔ اس دفعہ سارجنٹ انتھونی سپاٹ لہجہ میں بولا۔ ”یہ ایک ناممکن بات ہے۔ کوئی بھی ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو اپنے وجود سے جدا نہیں کر سکتی۔ اگر اس بات کا یقین بھی دلا یا جائے کہ بچے کی نگہداشت اور مستقبل پر کسی بھی قسم کی آنچ نہیں آنے پائے گی۔ تب بھی کوئی ماں ایسا قدم اٹھانے سے پہلے سوچے بغیر انکار کر دے گی۔ یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہے۔ نگہداشت اور رہنے کا کام ایک ایسی سوچ کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ جو ٹھوس اجسام کو چھونے کے بھی قابل نہیں ہے۔ یقیناً بچہ کچھ ہی دنوں میں موت کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

ڈوئی بات کا نکتہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال کے مطابق این سے بہتر ماں اور کوئی بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ رہی ہوا پر مشتمل ردحوں کے ہونے کی بات..... تو وہ ٹھوس اجسام بخوبی اختیار کر سکتی ہے۔ اور ٹھوس جسم میں منتقل ہونے کے بعد بچے کی بہترین پرورش کر سکتی ہے۔“

سارجنٹ انتھونی نے طنزیہ نگاہوں سے ڈوئی کی جانب دیکھا۔ پھر گھمبیر لہجہ میں پوچھا۔

”فرض کر دو۔ اگر تمہاری دودھ پیتی اولاد ہو۔ تو کیا تم قربانی کی بھینٹ چڑھانے کے لئے اسے این کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔“

”شاید.....“ ڈوئی نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ ”اگر مجھ پر ایسا وقت آتا۔ تو میں اتنے لوگوں کی خوشی کی خاطر قربانی دینے کے لئے بخوشی اختیار ہو جاتا۔“

سارجنٹ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہاری اولاد ہوئی۔ تب تم یقیناً انکار کر دیتے۔ چونکہ نہیں ہے اس لئے تم ہیرو بننے کے لئے ایسا کہہ رہے ہو۔ بہر کیف تم ٹاؤن کے باقی افراد سے بھی مسئلے کے حل کے لئے بات چیت کر سکتے ہو۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ کوئی بھی ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو جبر کر دوحوں کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگی۔

نیل اور این کو اپنی شرائط کے متعلق سوچ و بچار کرنی چاہئے۔ یہ ناممکن بات ہے۔“

ڈوئی نے طویل سانس لیتے ہوئے نیل اور این کی جانب دیکھا۔ پھر مت بھرے لہجہ میں بولا۔

”کیا ایسا ممکن ہے کہ تم دونوں اپنی شرط میں رد و بدل کر دو۔ تم ٹاؤن کے کسی بھی گھر میں موجود دودھ پیتے بچے کی جانب اشارہ کر دو۔ ہم ان گھروالوں سے اجازت لے کر تمہیں بچے کے پاس آنے کی اجازت دلوادیں گے۔ تم دن کے کسی بھی پہر وہاں آ کر بچے کے ساتھ اپنا دل بہلا سکو گے۔ میرے دماغ میں اس مسئلے کا اس سے بہتر مزید حل موجود نہیں ہے۔“

این نے انکار میں سر ہلانا شروع کر دیا۔ پھر استہزائے لہجہ میں بولا۔

”ایسا ممکن نہیں ہے بچہ بلا غیر و شرکت چاہئے۔ میں اس معاملے میں کسی دوسرے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہیں مزید کچھ سوچنا ہوگا۔“

ڈوئی نے ہار مانتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”آخری حل“

کمرے کے ماحول میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر ڈوئی گلے کو کھنکھارتے ہوئے بولا۔

”میرے دماغ میں مزید اور آخری حل موجود ہے۔ اگر قابل قبول نہیں ہوا۔ تب شاید میں ہار مان لوں

گا۔ بچوں کے والدین سارجنٹ انتھونی اور دونوں روٹیں بے چین نگاہوں سے ڈوئی کی جانب دیکھنے لگیں۔ ڈوئی مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہمیں کسی ایسی موت کا انتظار کرنا ہوگا۔ جس میں سر نے والا دودھ پیتا ہے اور اس کی موت قدرتی طور پر واقع ہوئی ہوگی۔ یاد رہے ہمیں صرف ایک نسخہ منے اور مردہ وجود کی ضرورت ہے تاکہ اس کے جسم میں کوئی بھی روح گھس کر اسے جیتے جاتے بچے کی صورت مہیا کر سکے۔ صرف تھوڑے سے انتظار کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سب مل کر این کی روح سے درخواست کریں۔ تب شاید وہ ہمیں اتنی مہلت دے کہ ہم پراسان کر سکیں۔ اور ہمیں کچھ وقت دے کہ شرط پوری کرنے کے لئے انتظام کرنے کا موقع دے۔“ سارجنٹ انتھونی اچانک ہی چنگی بجاتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ پھر پر جوش لہجے میں بولا۔ ”انتظار کی مہلت مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ ٹاؤن میں کل ہی ایک دودھ پیتے بچے کی موت واقع ہوئی ہے۔ میرے خیال میں سروی کی بدولت لاش ابھی گلی نہیں ہوگی۔ ہم با آسانی قبر کھود کر لاش کو حاصل کر سکتے ہیں۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ ڈوئی مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہم ابھی قبرستان کا رخ کرتے ہیں تاکہ لاش کو خراب ہونے سے پہلے وہاں سے نکال کر دکان میں لایا جاسکے۔ لیکن اس سے پہلے میں مل سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ایسا ممکن ہے۔ گزشتہ روز میں نے یہاں دکان میں موجود درجنوں کے جھوم میں چند ایسے بچوں کی روٹیں بھی دیکھی تھیں۔ ان میں سے کوئی لاوارث بچے کی روح ہمارے حاصل کردہ مردہ وجود میں گھسنے کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یوں ہمارا مسئلہ حل طلب صورت اختیار کر سکتا ہے۔“ ٹل نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

”ایسی لاوارث بچے کی روح ہمارے درمیان موجود ہے اور میرے خیال میں وہ با آسانی مردہ بچے

کے وجود میں بھی گھس سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بچے کے جسم کو مکمل تر دمازہ ہونا چاہئے۔“

ڈوئی بات کا نٹے ہوئے بولا۔ ”پھر ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو۔ قبرستان کا رخ کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں بچے کی لاش کو چھوٹے تابوت میں بند کر کے دفنایا گیا ہوگا۔ اگر ایسا ہوا۔ تب یقیناً بچے کی لاش اچھی حالت میں دستیاب ہو جائے گی۔“

سارجنٹ بولا۔ ”وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ انہوں نے بچے کو چھوٹے تابوت میں بند کر کے دفنایا تھا۔ پھر بھی ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے اور جلد از جلد لاش کو نکال کر دکان میں لے آنا چاہئے۔“ ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا اور سارجنٹ انتھونی بچوں کے والدین کے ہمراہ دکان سے باہر نکل کر قبرستان کی جانب چل دیا۔

”لاش کا حصول“

اس رات مطلوب بچے کی لاش دستیاب نہ ہو سکی۔ جس بچے کی لاش قبر کھود کر باہر نکالی گئی۔ اس کی لاش کے کچھ حصے گلے سڑنے لگے تھے۔ اس لئے اسے تابوت میں ڈال کر دوبارہ دفن کر دیا گیا۔ لیکن پھر دوسرے دن شام کے وقت ایک ایسے بچے کی لاش دستیاب ہوئی گئی۔ جو ناقص صحت مند تھا بلکہ لاوارث ہونے کے علاوہ اس کی لاش تازہ بھی تھی۔ ڈوئی کی دکان میں ایک دفعہ پھر سارجنٹ انتھونی اور بچوں کے والدین کو بلایا گیا۔ این اور ٹل کی روح کے علاوہ وہاں ایک ایسے بچے کی روح بھی موجود تھی۔ جس کی عمر کم و بیش چھ سات سال کے قریب تھی۔ ٹل کے کہنے کے مطابق مطلوب بچہ کی لاش کو ایک بڑی میز کے اوپر رکھ دیا گیا۔ اب ٹل اور چھ سالہ بچے کی روح کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ مذاکرات کا یہ سلسلہ سرگوشیوں پر مشتمل تھا۔ اس لئے دکان میں موجود وہاں افراد کچھ بھی سننے یا سمجھنے نہیں پاتے۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ٹل بچے کو

دودھ پیتے بچے کے مردہ جسم میں گھسنے کی ترغیب دے رہا ہوگا۔ گفت و شنید کا یہ سلسلہ تقریباً پانچ منٹ تک مسلسل تواتر کے ساتھ جاری رہا۔ پھر ٹل کے کی روح نے اثبات میں سر ہلانا شروع کر دیا۔

ٹل نے ڈوئی کی جانب دیکھتے ہوئے خوشخبری سنائی۔ اور ٹیشوں کے آگے بھی پردے سرکا دیے جاسیں۔“

ڈوئی نے لائٹ آف کر دی جبکہ سارجنٹ نے ٹیشوں کے آگے پردے سرکا دیے۔ دکان میں گنگا اندھرا پھیلنا چلا گیا۔ اب وہاں موجود تمام افراد ہلکے سائوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ٹل دوبارہ بچے کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ پھر اس نے بچے کی روح کو اٹھا کر میز کے اوپر بیٹھا دیا۔ وہاں مردہ بچے کی لاش موجود تھی۔ بچے کی روح نہایت آہستہ کی آہستہ سرے ہوئے بچے کی لاش کے اوپر لیٹ گئی اور حیرت انگیز طور پر اپنے جسم کو کم کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دودھ پیتے بچے کی جسامت اختیار کر چکی تھی۔

اس کے فوراً بعد دکان کا ماحول نئے نئے بچے کے رونے کی آواز سے گونج اٹھا۔ این کی روح بے اختیار آگے بڑھی اور اس نے بچے کو اٹھا کر گلے سے لگانے کی کوشش کی۔ لیکن مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ صرف ہوا میں ہاتھ ہلا کر رہ گئی۔

ڈوئی نے آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ ماحول یکدم روشن ہوا اور وہاں موجود تمام افراد کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ تب انہوں نے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ دکان کے درمیان سانتا کلازا اور بوڈھی عورت کا مجسمہ موجود تھا۔ بوڈھی عورت میز پر لیٹے ہوئے بچے کو سینے سے لگائے چوم رہی تھی۔ منظر رقت آمیز تھا۔ بہت سے ٹاؤن والوں کی آنکھیں آنسوؤں کی بدولت جھلملانے لگیں اور وہ رومال سے آنکھیں پونچھنے لگے۔

ڈوئی نے طویل سانس لیتے ہوئے سارجنٹ کی

جانب دیکھا۔ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آخر کار ہم مقصد میں کامیاب ہو ہی گئے۔ میرے خیال میں کل میچ ٹاؤن والوں کے بچے بھی ٹاؤن واپس پہنچ جائیں گے۔ پھر ٹاؤن والوں کی کرسی کی خوشیاں دو بالا ہو جائیں گی۔“

سارجنٹ بولا۔ ”تم ٹل سے بات چیت مکمل کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بچوں کو واپس کرنے سے مکر جائے۔ اگر ایسا ہو گیا۔ تب ہمارے لئے مزید مشکل پیدا ہو جائے گی۔“

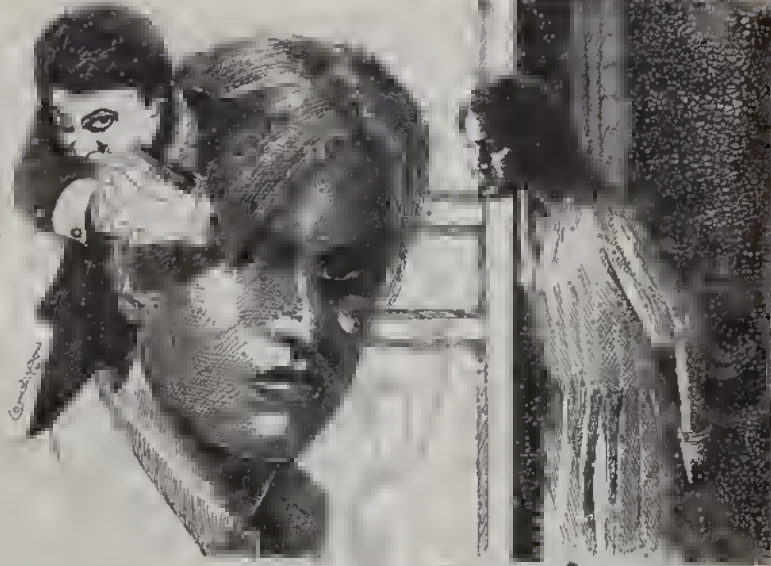
ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور این کے پاس کھڑے خوشی سے معمور چہرہ لئے ٹل کی جانب چل دیا۔ ٹل نے اسے اپنی جانب آتے دیکھا۔ تب بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم بچوں کے لئے پریشان ہو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ساتھی روٹیں بچوں کے ہمراہ ٹاؤن میں داخل ہونے والی ہیں۔ آج ٹاؤن والے دوبارہ کرسیاں منائیں گے۔ جس میں ہم بھی شرکت کریں گے۔“ ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہو پائی تھی کہ باہر بازار بچوں کے شور اور پٹاخوں سے گونج اٹھا۔

ٹاؤن کے لوگوں اور سارجنٹ انتھونی نے گھبرا کر باہر کی جانب دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن دروازوں اور کھڑکیوں پر لگے پردوں کی بدولت باہر نہیں دیکھ سکے۔

ٹل نے ہاتھوں میں موجود ہینول کا رخ دکان کی چھت کی جانب کر کے ٹریگر کو دبا دیا۔ دھماکے کے ساتھ رنگ برنگے شعلے دکان کے اندر پھیلنے چلے گئے۔ اس نے پٹی کرسی کا نعرہ لگایا اور کمر پر لاوے ہوئے سرخ رنگ کے تھیلے کو اٹھائے دکان کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ٹاؤن کے لوگ جوق درجوق بازار کا رخ کر رہے تھے۔ ایسا تقریباً پڑھ بیٹھنے کے بعد ہو رہا تھا کہ لوگ رات ہونے کے باوجود گھروں سے باہر نکل کر بازاروں کا رخ کرنے کی جستجو میں تھے۔ ٹل سانتا کلازا



فرار

ناصر محمود فرار - فصل آباد

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا کار کے انجن کی آواز قریب آتی جارہی تھی مگر ابھی تک کار کی روشنیاں نظر نہیں آرہی تھیں کہ اچانک روشنیاں نظر آتے ہی گولیوں کی تڑتڑاھٹ سے پورا علاقہ گونج اٹھا اور پھر اچانک ایک ہولناک منظر سامنے آیا۔

مغرب کی فضاؤں میں جنم لینے والی ایک تیز راگیز حیرت انگیز لرزہ براندام کرتی کہانی

میں نے گنگاری تھی۔

میں نے ڈیش بورڈ میں لگی روشن گھڑی کی طرف دیکھا تو یہ چلا کر دات کے سوا گیارہ بج رہے تھے۔ میں اس وقت سانا آلا کے دامن کے قریب پہنچ چکا تھا جب کار کے ریڈیو پر بھتی موسیقی کی بارگی غیر متوقع طور پر ختم گئی اور نیوز کاسٹر کی آواز ابھری۔ اس وقت میری نظریں سیاہ سڑک پر پنی سفید لکیر پر گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں جمی ہوئی تھی میں نے ریڈیو کی طرف دیکھے بغیر ایک ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کی آواز قدرے اونچی کر دی۔

میں گزشتہ دو گھنٹے سے سڑکوں پر کار کو آوارہ دوڑا رہا تھا۔ اب میں پہاڑی علاقے سے تقریباً نکل آیا تھا اور نیچے وادی میں مجھے چھوٹے سے قصبہ سانا آلا کی روشنیاں بھی نظر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سیاہ سڑک کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی ایسی حسرت کی طرح بل کھاتی بھڑاتی بجلی کی طرح کے بل یہاں آ کر ٹک گئے تھے اور وہ اب بالکل سیدھی ہو چکی تھی۔ میرے پاؤں کا دباؤ ایک سیلینڈر پر بڑھتا جا رہا تھا۔ بخ بستہ دھندلی سرسراتی ہوا میرے کانوں

شرط خود غرضانہ فطرت کی عکاسی نہیں کرتی تھی۔ کیا ٹاؤن والوں کا پاگل خانے کے باہر تھانے کے چپ چاپ کھڑے رہنا خود غرضانہ عمل نہیں تھا۔ اگر ٹیک کی شرط کو پورا کرنے کے لئے ہم نے یتیم خانے میں موجود بچے کو اپنی غرض کے لئے استعمال کر کے بہت سے والدین کو ان کے بچوں سے ملانے کا ذریعہ بنادیا۔ تب میرے خیال میں یہ کوئی بد فعل نہیں ہو سکتا۔ تم ذرا بازار میں موجود ٹاؤن والوں کے چہروں کی جانب دیکھو۔ کتنی خوشیاں ان کے چہروں پر رقص کر رہی ہیں۔ ابن کی جانب دیکھو۔ وہ کتنی مطمئن و پر مسرت ہے۔ مجھے تو ان سب کو دیکھ کر نہایت اطمینان بخش احساس دل میں اٹھتا محسوس ہوتا ہے۔ اگر ایک انسان کے دنیا سے چلے جانے کی بدلت لوگوں کی اتنی خوشیاں میسر آ سکتی ہیں تو میرا نہیں خیال کہ خدا ہم سے ناراض ہوگا۔ ڈوٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کوئی بھی جواب دیئے بغیر دروازہ کھول کر دکان کے اندر داخل ہو گیا۔

”پاگل بنی کا اعتنا“

یہ وہ پاگل بنی تھی۔ جو مجھے ڈوٹی کی بدولت دستیاب ہوئی۔ ڈوٹی کو مزید کریدنے پر مجھ پر حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ اپنی آدمی سے زیادہ زندگی پاگل خانے میں گزار چکا تھا۔ یعنی وہ ایک پڑھا لکھا پاگل رہ چکا تھا۔ علاج کے بعد اس نے ٹاؤن میں تھلونوں کی دکان کھولی۔ جو آج کل بہت اچھی چل رہی ہے۔ لیکن وہ چیک اپ کے لئے اکثر اوقات پاگل خانے آتا رہتا ہے۔ اور جہاں اس کی اور میری ملاقات ہوتی۔

میری تحریر مکمل ہو گئی تھی۔ اب صرف اسے پبلشرز کے حوالے کرنا باقی تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری پچھلی تحریر ”پاگل خانہ“ کی طرح اسے بھی خدا کا میا بیوں سے ہمکنار کرے گا۔ آپ بھی دعا کیجئے گا۔ خدا حافظ۔



کے وجود میں کر پر موجود کھلونے سے لدے ہوئے تھیلے کے ساتھ بچوں میں کھلونے تقسیم کر رہا تھا۔ کچھ منچلوں نے آتش بازی کے سامان سے بھرے ہوئے تھیلے بچوں کو جھمانے شروع کر دیئے اور پھر آسمان رنگ رنگی روشنیوں سے منور ہونے لگا۔ اس تمام ہجوم کے درمیان ابن بچے کو اپنے سینے کے ساتھ لگائے نہایت خوش و شادمان کی۔

ڈوٹی سارجنٹ کے ہمراہ دکان کے برآمدے میں کھڑا لوگوں کے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پر سوچ کی لکیریں نمودار تھیں۔ سارجنٹ انفونی کی نگاہوں میں خوشی و اطمینان کا تاثر تھا۔ ڈوٹی خوابیدہ لہجے میں سارجنٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا ہم نے ایسا کر کے صحیح کیا ہے؟ مجھے نہیں لگتا کہ ہمارا خدا ہم سے خوش ہوگا۔ ہم نے مکمل خود غرضی کے ساتھ صورت حال کو اپنے حق میں ڈھالنے کے لئے نہایت جالا کی سے کام لیا ہے۔ لیکن کسی اور کی زندگی کا خیال نہیں کیا۔“

سارجنٹ بولا۔ ”میری رائے تم سے مختلف ہے۔ بہت سے لوگوں کی خوشیوں کے لئے اگر کسی ایک ننھے منے وجود کے جسم کی قربانی دے دی جائے۔ تب میرے خیال میں خدا ہم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ اور پھر ہم نے ایسا اپنی غرض کے لئے نہیں کیا بلکہ دوسروں کی خوشیوں کے لئے کیا ہے۔ اگر نہ کرتے تو بچوں کی دستیابی کے علاوہ قتل و غارت کا نہ رکھنے والا سلسلہ چلتا رہتا۔ جس میں ایسے کئی اور بچے قربانی کی جھینٹ چڑھ جاتے۔“

ڈوٹی سر آہ بھر کر بولا۔ ”لیکن ہم نے جس ننھے منے وجود کو قربانی کی جھینٹ چڑھانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ وہ لاوارث اور یتیم وجود تھا۔ وہ تو ہماری ہمدردیوں اور حسن سلوک کا حقدار تھا۔ لیکن ہم نے اسے اپنی خود غرضی کے لئے استعمال کیا۔“

”جیسا تم سوچ رہے ہو۔ ایسا نہیں ہے۔“ سارجنٹ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا ٹیک کی

اس کو دیکھنا ممکن نہ تھا۔

کار کا انجن اور روشنیاں بند کر دیں اور نیچے اتر آیا۔
باہر قدرے ٹھنڈک تھی، بلکی ہوا چل رہی تھی اور آسمان
پر پورا چاند چمک رہا تھا مگر اس وقت وہ کالے بادلوں کے
ایک بڑے سے نکلے کے پیچھے چھپ رہا تھا۔

کار سے اتر کر میں سڑک پر آیا، اس کو پار کیا
اور دوسری طرف آ گیا۔ اس طرف کھلے میدان میں کہیں
کہیں چٹانیں سر اٹھنے لگی تھیں ان کے پیچھے ایک
خطرناک ڈھلوان تھی جو تقریباً پینتالیس درجے کے
زاویے پر نیچے کی طرف جاری تھی۔

میں میدان کے سرے پر اتر کر گیا۔ سڑک کا
موڑ اس ڈھلوان کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا۔

میرے اندازے اور اطلاع کے مطابق وہاں نیچے
میرین کو موجود ہونا چاہئے تھا۔ وہ وہاں درختوں کے جھنڈ
میں چھپی ہو سکتی تھی۔

میں نے میدان کو پار کیا، تیزی سے چلتے ہوئے
میری نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں، میں نے ڈھلوان
پر اترنا شروع کر دیا۔ میرا دل میرے سینے میں اچھل رہا تھا۔
میں کافی دن بعد میرین سے ملنے والا تھا۔

میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا نیچے اتر رہا تھا
مگر اس سے پہلے کہ میں ڈھلوان کے نیچے پہنچتا، میں پھسل
کر گر پڑا۔ خوش قسمتی سے کوئی چوٹ نہ لگی کیونکہ وہاں زمین
نرم تھی۔ میں کپڑے جھاڑ کٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی جیب کو ٹوٹل
کر پستول کی موجودگی کا یقین کیا اور مطمئن ہو گیا۔

سڑک اوپر سے گھوم کر ڈھلوان کے ساتھ ساتھ
نیچے آ گئی تھی۔ اس وقت یہ سڑک دور دور تک خالی نظر آ رہی
تھی۔ یقیناً میرین کی کار وہاں سڑک کے کنارے درختوں
کے جھنڈ میں تھی۔

میں چند قدم دبے پاؤں چل کر درختوں کے جھنڈ
کے قریب آ گیا وہاں سے مجھے ایک کانٹا نظر آ رہی تھی۔ میں
نے دور سے کار کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ کار کے
اندروں رانڈرنگ سیٹ پر ایک سایہ نظر آیا۔ مگر اندھیرے
اور فاصلے کے باعث کہنا مشکل تھا کہ وہ میرین تھی یا کوئی

”کئی آدمیوں کے قاتل اور مفرد قیدی فرینک
وارنر کی تلاش پوری ریاست میں جاری ہے۔۔۔۔۔ پولیس اس
کے پیچھے ہے۔“ اناؤنسر کہہ رہا تھا۔

”وارنر جس پر بینک کو قتل کا الزام ہے آج سہ پہر
اس نے کولن میں ایک پولیس انسٹرکٹوریٹ ماری اور چوری کی
گاڑی میں خزا ہو گیا۔ یہ آفیسر اسے ایک جیل سے دوسری
جیل میں منتقل کر رہے تھے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ سائنٹا
آلٹا کی طرف جانے کا کہاں اس کی بیوی رہائش پذیر
ہے۔ کیونکہ پولیس کی اطلاع کے مطابق مسز وارنر جس کا
اصل نام ”میرین“ ہے اپنے گھر سے غائب ہو چکی ہے
غائب ہونے سے پہلے اس نے اپنے بینک کے کھاتے
سے تقریباً چار ہزار ڈالر نکلائے تھے۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا
جب اس کا شوہر فرینک وارنر پولیس کی حراست سے فرار
ہوا تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ اس کا کسی طرح اپنی بیوی
سے رابطہ تھا اور وہ اس کے فرار سے آگاہ تھی۔ وارنر سب سے
اور وہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ سائنٹا آلٹا کے رہائشیوں
کو شوہر دیا جاتا ہے کہ۔۔۔۔۔“

بانی اعلان پر میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ میرے
ہاتھ اسٹیرنگ ویگل پر مضبوطی سے تھے وہے تھے مگر میں
اپنے کوٹ کی جیب میں پستول کا بوجھ پوری طرح محسوس
کر رہا تھا۔

”سائنٹا آلٹا“ کی حدود میں داخل ہوتے ہی میں
نے اپنی کار کی رفتار دھبی کر دی۔ اس وقت میں دریا کے
کنارے صنعتی علاقے سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں
تھبے کو جانے والی سڑک پر آ گیا جو ایک طرف کو پہاڑوں
کے دامن میں سے گزرتی تھی۔

میں اس سڑک پر تقریباً سات میل تک چلتا چل
گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے ایک اور چھوٹی ذیلی سڑک ایک
طرف کوڑتی دکھائی دی۔ میں نے کار کو اس سڑک پر
موڑ دیا۔ اس ٹکڑے سڑک پر تقریباً ایک میل آگے جا کر سڑک
اک دم مڑ گئی تھی یہ ایک خطرناک موڑ تھا میں نے اس سے
پہلے ہی سیدھا کو ایک طرف روک لیا اور وہاں ایک طرف
گئے درختوں کے بیچ اس طرح چھپا دی کہ بادی آنظر میں

اور۔۔۔۔۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس
کار کی طرف آگے بڑھنے لگا۔ میرا ایک ہاتھ حفاظت انداز میں
جیب میں موجود پستول پر تھا۔

وہاں درختوں کے نیچے چھٹی جھاڑیاں تھیں میں ان
کے اندر دیک گیا۔ کار مجھ سے تقریباً پندرہ فٹ دور تھی۔
اب میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا کہ کار کے اندر میرین ہی
تھی۔ وہ ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

میں چند لمحے خاموشی سے جھاڑیوں میں دبکا رہا۔
چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور مجھے صرف
چیتنگروں کے گانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے دھیرے سے اپنا سر اٹھایا اور ہلکی
آواز میں سرگوشی کے انداز میں میرین کو پکارا۔ اس نے
شاید میری آواز سنی نہیں کیونکہ اس کی طرف سے کوئی جواب
نہ ملا نہ ہی اس نے کوئی حرکت کی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے
دوبارہ پکارا اس دفعہ میری آواز قدرے اونچی تھی۔ آواز سننے
ہی اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بے تابی سے
اپنے پاس دیکھا وہ میری آواز پہنچاتی تھی۔

”ڈرائنگ!۔۔۔۔۔ اوہ میرے خدا!۔۔۔۔۔ میں سمجھی تم
نہیں آؤ گے۔۔۔۔۔“ وہ بے تابی سے بولی۔ اس کے انداز میں
گھبراہٹ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

”کیا تم تنہا ہو۔۔۔۔۔؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔
میں نے جواب میں اس کے سر کو اثبات میں ہلٹے
دیکھا۔ سر ہلانے کے سبب اس کے سنہری بال اک
انداز دلربائی سے ہلے۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ یہاں
صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی۔۔۔۔۔“ تھوڑی دیر بعد اس کے
ہونٹوں سے سرگوشی برآمد ہوئی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اب
میں آ گیا ہوں۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔“ میں نے
اسے تسلی دی۔

”مگر۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ کہیں
سے ایک ہلکی سی آواز ابھری تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک دم کھٹکے کی آواز سنائی دی
تو میں چوکنا ہو گیا۔

”یہ کیا۔۔۔۔۔؟“ میرین نے گھبرا کر پوچھا۔

”سنو۔۔۔۔۔“ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ
کرتے ہوئے اپنے کان آواز کی سمت لگا دیے۔

دور سے آتی ہوئی آواز اب بلند ہوتی جا رہی
تھی۔ یہ ایک کار کے انجن کی آواز تھی جو سڑک کے اوپری
حصے سے آرہی تھی۔ اس طرف سے جدھر سے میں آیا تھا
اور جہاں میں نے اپنی کار چھپائی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا
ایک یادو میل آگے جا کر یہ ذیلی سڑک بڑی شاہراہ سے
مل جاتی تھی۔

میرین نے بھی کار کے انجن کی آواز سنی تھی۔
میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا وہ پیلا پڑ رہا تھا اور اس کی
آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ان میں خوف در آیا تھا۔ وہ بری
طرح گھبرا گئی تھی۔

”میرین۔۔۔۔۔“ میں نے اسے سرگوشی میں
پکارا۔ ”مت گھبراؤ، خاموشی سے بیٹھی صرف سامنے
دیکھتی رہو، تم سمجھ رہی ہو نا۔۔۔۔۔“

چند لمحے بعد وہ اگلی ہوئی آواز میں بولی۔
”ہاں۔۔۔۔۔“

کار کے انجن کی آواز قریب آتی جا رہی تھی
مگر ابھی تک کار کی روشنیاں نظر نہیں آتی تھی۔ پھر یہ آواز
بھی معدوم ہو گئی۔

میں نے اپنا پستول ہولسٹر سے نکال کر اس
کو سیدھے ہاتھ میں تھام لیا اور خود جھاڑیوں میں اچھی طرح
چھپ گیا۔ میری نظریں میرین کی کار پر جمی تھیں۔

وقت رک سا گیا تھا۔ میرے پیٹ میں ہلچل
ہونے لگی تھی۔ میری آنکھیں اندھیرے میں کسی حرکت
کو دیکھنے کے لئے بالکل تیار تھیں۔ مگر وہاں کچھ نہ تھا۔

اچانک مجھے چٹوں کے چرمرانے کی بہت بلکی سی
آواز سنائی دی۔ کوئی میرین کے کار کے عقب میں تھا جہاں
شاہ بلوط کا ایک بڑا سادرخت تھا۔ میں نے اپنی نگاہیں اس
درخت کی طرف ہٹا دیں۔ وہاں ایک سایہ حرکت کر رہا تھا



موکل کا کرشمہ

رفعت محمود۔ پنڈ مہورا ولپنڈی

اچانک کمرے میں ایک موکل نمودار ہوا اور بولا۔ جیسی گندی کھیتی کی خواہش تو نہ کی ہے ویسے ہی پھل تجھے ملیں گے۔ تجھے دولت ملے گی، ہر تعیش زندگی گزارے گا مگر پل پل مرتا بھی رہے گا کیونکہ کوئی بھی قانون قدرت سے بچ نہیں سکتا۔

حرص و لالچ کی ایک عجیب و غریب ذہن پر نقش ہونے والی پراثر اور سبق آموز کہانی

اور آٹکھیں کھلیں مگر اب کیا ہو سکتا تھا جب چڑیاں چک نکلیں کھیت۔ نہ کوئی لیاقت تھی نہ سلیقہ تھا جسم محنت مشقت کا عادی نہ تھا نوکری ملتی تو کس بابر۔ اور اگر مل بھی جاتی تو پرانی تابعداری کون کرتا۔ شرافت کا جھوٹا غرور انسان کو پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ انسان اپنی پستی کو سمجھے لے اور پرانی کہانیاں بھول جائے تو پھر عمارت تعمیر ہو جاتی ہے لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا دولت اور عیش کا اثر تھا ہوا نشہ ساری زندگی کو برا بد کردیتا ہے اور ان کی جگہ سستی کاہلی اور کم ہمتی پیدا ہو جاتی ہے عالم اسباب میں زندگی بسر کرنے کی قابلیت نہیں رہتی۔

سلیم جدی پشتی امیر تھا۔ بچپن ہونے چاندی کے چمچوں سے کھاتے پیتے گزرا۔ دولت اس کے لئے بے معنی تھی۔ جوان ہوا تو باپ دادا کا پیسہ بے فصول اڑایا تنگ بازی، سرخ بازی اور کوئی بازی ایسی نہ تھی جس کا اسے شوق نہ ہو، کئی صدیوں کا باہوا گھر تھا گھڑا معلوم نہ ہوا۔ اپنی کمائی ہوتی تو خرچ کرتے ہوئے کچھ خیال بھی آتا۔ مال مفت دل بے رحم۔

آخر کہاں تک! پرانی امیری ٹھیکروں میں دم توڑنے لگی زیور گئے گھوڑے تیل سب پر پانی پھر گیا مکان بوجھل سرا کہلاتا تھا رشتہ داروں نے خرید لیا۔ ہوش آیا

اپنے ہاتھ کے ساتھ چپکالیا۔
”کیا یہ.....؟“ اس نے سوالیہ انداز میں سر موٹی کی۔

”ہاں.....“ میں نے جواب دیا۔
میرین کے ہاتھ مضبوطی سے میری کمر پر جم گئے اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے بلکنا شروع کر دیا تھا۔

”میں نہیں جانتی میں تمہیں پہلے خبردار کیوں نہیں کر سکی.....“ وہ پتکیوں میں پوی۔ ”اگر مجھے وقت مل جاتا تو میں تمہیں فون پر اطلاع دے دیتی.....“
”سب ٹھیک ہے میرین.....“ میں نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ ”سب ٹھیک اور وقت پر ہو گیا۔“

”.....جب اس نے مجھے فون کیا تو میں خوف زدہ تھی۔ پھر میں نے اس کے کہنے پر مجبوراً سب کام کیا۔ بینک سے رقم نکلوئی اور یہاں آ گئی اور تمہارا انتظار کرنے لگی۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کے کہنے پر عمل نہ کیا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ اس نے کہا.....“

”آرام سے ہنی.....“ میں نے اس کو تسلی۔
”.....اب تو سب ختم ہو گیا۔ اب حالات ہمارے قابو میں ہیں۔“

”اوہ.....“ میں نے نہیں جانتی میں نے پچھلے چند مہینے کیسے گزارے۔ اگر میں تم سے نہ ملتی تو..... میں نہیں جانتی تھی وہ جب واپس آئے گا تو.....“

میں نے بے تابی سے اس کا ہوسہ لیا۔ پھر ہم وہاں واپس آئے جہاں میری کارر کی ہوئی تھی۔ ہم فرنٹ سیٹ پر اکٹھے بیٹھ گئے پھر میں نے اپنی کار کے ڈیش بورڈ کے نیچے سے وائر لیس فون اٹھایا اور پولیس ہیڈ کوارٹر فون ملائے لگا۔
”میں FBI کا آئیٹل ایجینٹ ہوں رہا ہوں۔“ رابطہ ملنے ہی میں بولا۔ ”تو تم فریک وائر کی تلاش ختم کرنے کا اعلان کرو۔ وہ مر چکا ہے۔“



اور پلی کی مانند دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا۔
میری انگلیاں پستول کے ٹریگر پر دبے کو بے تاب تھیں۔

اسی لمحے چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور مجھے وہ سایہ صاف نظر آنے لگا۔ وہ ایک جگہ بے حس و حرکت جھکا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آگے کی طرف پھیلا ہوا تھا جیسے وہ کسی کا نشانہ لے رہا ہو۔ پھر وہ ایک قدم بڑھا کر آگے آیا اور میرین کی کارر کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ عقب سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ رہا تھا۔

چاند کی چمکتی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں ایک آٹو پیک گن تھی۔

میری سانس رک گئی۔ میں آنے والے کو روک نہیں سکتا تھا۔ مگر جو بھی وہ تھوڑا اور آگے آیا میں اپنے قدموں پر اچھلا اور اپنی ہندو تانے ہوئے چیخا۔

”رک جاؤ..... جہاں ہو دو ہیں رک جاؤ.....“
میری آواز سن کر وہ پکلی کی سی تیزی سے گھوما اور اس کی پستول کی ٹانگی سے شعلہ اگلا۔ گولی میرے قدموں سے چند انچ دور زمین سے ٹکرائی۔

روغل میں یکے بعد دیگرے میں نے دو فائر کر دیے۔

گولیوں کی آوازیں کر میرین ہذیبانی انداز میں چیخنے لگی۔ آنے والا نیچے زمین پر گر گیا اور میرین کی کارر کے پچھلے پہیوں کی طرف لڑھکھکے لگا وہ شاید پھینکا چاہتا تھا۔ اس کی گن اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی اور پھر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے ایک جست لگائی اور سیدھا اس تک پہنچا۔ گٹھنوں کے بل اس پر چھکا اور پنا ایک ہاتھ اس کی چھاتی پر رکھا۔ اس کی سانس رک چکی تھی۔

میں اوپر اٹھا، اس دوران میرین بھی دروازہ کھول کر کارر سے اتری اور میری طرف بھاگی۔ آتے ہی میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ میں اس کے جسم کی کیکپا ہٹ صاف محسوس کر سکتا تھا اس لئے میں نے اس کو مضبوطی سے

کسی کی تلاش میں خاک چھانتا ہے یا دنیا طلبی میں قدرت کی پوشیدہ طاقتوں کو قابو کرنے میں زندگی برباد کرتا ہے تاکہ حاکم وقت زمین میں جیسے خزانے اگل دے کوئی مہکل روزانہ ایک اچھی رقم دے جایا کرے۔

لیکن بد نصیب یہ نہیں جانتا کہ پوشیدہ دولت کے خزانے اور دست غیب صرف محنت، بلند خدائی کسب حلال میں پھنسا ہے ایسے ناکارہ اور قانون الہی کی خلاف ورزی کرنے والے تو ساری زندگی بھٹکتے رہتے ہیں۔

سلیم نے بھی پوشیدہ طاقت کو قابو کرنے کے لئے کوششیں کرنی شروع کر دیں۔ دن اور رات مزاروں پر ناتھ پڑھنے، درگاہوں میں چلہ کرنے، عاملوں، فقیروں اور درویشوں کی تلاش میں مہینے گزرنے لگے۔

سلیم کو یقین تھا کہ اگر کوئی وظیفہ یا موکل پوری شرطوں کے ساتھ ہاتھ آگیا تو پوری دنیا کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ یہ بھی نہ ہوسکا تو کم از کم دست غیب تو کہیں گیا ہی نہیں۔

خدا کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف خواہش اور احکامات کو درہم برہم کرنے کی کوشش سنگین جرم اور ناقابل معافی گناہ ہے۔ اس کا رحم و کرم آڑے نہ آجائے تو ایسے لوگ سزا کے حق ہیں۔

سلیم بھی اب دنیا بھوکرو دین کھونے کی فکر میں تھا، خدا کو وہ یاد کرتا تھا محض لوگوں کو کھانے کے لئے، شش کشی ہو رہی تھی مگر صرف حصول عیش کی غرض سے مگر اس میں اپنی حسرت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی وہ اندرونی طور پر ہمت ہار چکا تھا کاش وہ خدا کو خدا کے لئے ہی یاد کرتا جو کر دین و دنیا کا خالق و مالک اور سب سے بڑا ہے اور اس کی یاد دہانی جہان کی دولت کا مالک بنادیتی ہے۔

سلیم نے سخت سے سخت ریاضتیں کیں دریا میں کھڑے ہو کر وظیفے کئے پہاڑوں کے غاروں میں چلہ کشیاں کیں کئی کئی ماہ انسانی صورت نہیں دیکھی ہڈیوں کے ساتھ چمڑا لگ گیا آدی سے ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا مگر کوئی رزلٹ نہ نکلا آخر پڑھ لہو کے قبرستان کی مسجد میں ایک بزرگ شاہ بابا سے ملاقات ہوئی شاہ بابا نے ترس کھا کر اسے

ایک وظیفہ بتایا کہ یہ دعوت درویش کے متعلق ہے۔

”شاہ بابا۔“ سلیم ایک دم بولا۔ ”اگر اجازت ہو تو میں اسے شروع کر دوں۔“

”بسم اللہ پڑھ کر اسے نو چندی جمعرات سے شروع کر دو اور جلد ہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمہیں کامیابی مل جائے گی۔“ شاہ صاحب نے کہا۔

”باباجی کیا میرے تمام مطالبات پورے ہو جائیں گے؟“ سلیم جلدی سے بولا۔

”تمہارے مطالبات کا پورا ہونا خدا کی مرضی پر ہے۔“

”کیا یہ موکل خدا کی مرضی کو نہیں بدل سکتے؟“ سلیم انھیں شکا کر بولا۔

”توبہ توبہ۔“ شاہ بابا۔ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے۔ ”موکل کی کیا طاقت ہے کہ خدا کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اٹھائیں۔ بلکہ ہم جیسے درویش تو اس کی پوشیدہ قوتوں کو موکل کہتے ہیں۔“

”پھر آپ مجھ سے یہ مشقت کس لئے کرنا چاہتے ہیں۔“

”صرف اس لئے کہ تم برگشتہ ایمان ہوتے جا رہے ہو۔ تم نے اسم الہی کی برکات نہیں دیکھیں، تمہاری غلطیوں نے تمہیں کفر کے دروازے پر لاکھڑا کیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ میں زندہ درگور نہ ہو جاؤ۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم خدا کے صرف ایک نام کی دعوت کا کرشمہ دیکھ لو۔“

”باباجی! آپ نے درست فرمایا ہے۔ مگر اس اسم کی وجہ سے میری کوئی آرزو بھی پوری ہو سکے گی؟“

”دینی رخصت ہے وہی عظیم ہے ہی کو اس کا علم ہے۔“

یہ کہہ کر شاہ صاحب خاموش ہو گئے۔

سلیم نے ہر چند ان سے اور کوئی بات کرنی چاہی مگر شاہ صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئے۔

نو چندی جمعرات آگئی، سلیم نے زعفران کستوری اور کچھ دوسرا سامان منگو کر وظیفہ شروع کر دیا ایک ہفتہ

گزر گیا دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا تیسرا ہفتہ آیا مگر ایسی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوئی جس سے اس دعوت کی کامیابی کا خیال ہوتا سات گھنٹے کی سخت محنت اور پرہیز و نہی بھر کا روزہ ہر طرف خاموشی اور تنہائی سلیم گھبرا گیا اس کا دل چاہا کہ چلہ توڑ دے لیکن شاہ بابا نے ایسے تیروں سے یہ عمل بتایا تھا کہ توڑنے کی ہمت نہ دہی اور یہ بات بھی اس نے ہی ہوئی تھی کہ اگر بعض اعمال توڑ دیئے جائیں تو ان کے اٹنے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے عمل جاری رہا۔

چالیسواں دن تھا اور چار گھنٹے پڑھتے ہوئے گزرے تھے کہ ساری مسجد بٹنے لگی ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وزلہ آگیا ہو۔ حجرے کے دروازے ٹوٹ رہے تھے میرب سی آواز سنائی دینے لگیں۔ ایسا شور تھا جیسے آسمان سے ہزاروں سیلیں برس رہی ہیں ریل گاڑیاں زمین کی چھاتی روند رہی ہیں ہولناک منظر۔ کچھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور سلیم بے چارہ سہا سنا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔

آنکھیں بند تھیں اور بیچ چل رہی تھی کہ یکایک حجرے کے دروازے کو ایک سخت دھکا لگا دھوئیں دروازے اڑ کر پاش پاش ہو گئے۔ سلیم کی جان خوف کے مارے نکلنے کے قریب تھی کہ آہٹ سی معلوم ہوئی اب وہ شور غل کم ہوتا جا رہا تھا سنا اور خاموشی سلیم نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی کیا دیکھتا ہے کہ ایک قوی سیکل خوبصورت جوان نہایت بارعب ہتھیار لگائے اندر داخل ہوا حصار کے گرد تین چکر لگائے اور نکواریاں سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔

سلیم نے وظیفے کے کوڑا تیز کر دیا۔ چند منٹ تک ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ کہنے کے بعد اس آنے والے نے تیوری پر بل وال کر سلیم سے کرخت لہجے میں کہا۔

”قتلہ قدرت سے مذاق کرنے والے بول کیا چاہتا ہے۔ کیوں ہمیں پریشان کیا ہے تو نے۔ ہمیں حاضر کرنے سے تجھے کس فائدے کی امید ہے؟“

سلیم کی جان میں جان آئی۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ عمل کامیاب ہو گیا۔ اور یہ وہی درویش موکل ہے جس کا شاہ بابا نے مجھے بتایا تھا اب میری ساری تمنائیں پوری

ہو جائیں گی یہ موکل میرے سارے کام کر دے گا۔

”آپ کا نام ورد نیل موکل ہے؟“ سلیم مسکرا کر بولا۔

”ہاں۔“ موکل بولا۔

”اللہ اللہ۔“ سلیم خوش خوشی بولا۔ ”کیسی کیسی زبان گھسی ہے کہاں کہاں ہاتھ رگڑا ہے جب آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔“

”ان فضول باتوں کو چھوڑ اور مطلب کی بات کر۔“ موکل غصے سے بولا۔

”جلد بازی نہ کریں حضور۔“ سلیم عاجزی سے بولا۔ ”ابھی تو آپ حاضر ہوئے ہیں۔“

”حاضری کیسی۔“ یہ تو صرف اسم پاک کی برکت ہے جو ہم آگئے ورنہ دنیا کے بندوں سے ہمیں کیا واسطہ۔“ یہ جملہ موکل نے ایسے کڑک کر کہا کہ سلیم پر ہیبت طاری ہو گئی۔

”اچھا آپ توبہ بتائے کہ آپ اپنے عامل کی کیا خدمات کر سکتے ہیں۔“ سلیم ڈرتے ڈرتے بولا۔

موکل بولا۔ ”قرآن کے ہر حرف اور ہر اسم میں لازوال طاقت پوشیدہ ہے جس اسم کی طاقت سے میں حاضر ہوا ہوں اور جس کا نام تم نے درویش مقرر کر لیا ہے۔“

”بہت خوب، لیکن کیا آپ، اسم کے عامل کی اطاعت نہیں کریں گے۔“

موکل ترش لہجے میں بولا۔ ”عملیات سے ہمارا اور عاملوں کی اطاعت جیسے لوگ سمجھتے ہیں وہ صرف دنیا کی طلب اور دھوکے باز عاملوں کا جال ہے۔ کچھ عامل دولت کی خاطر عمل کرتے ہیں لیکن ہمیں ان دناوی چیزوں سے کیا واسطہ۔ مگر اسم کی طاقت برکت کے زیر اثر ہم عاملوں کی اطاعت کرتے ہیں اور اس بزرگ شاہ بابا کی وجہ سے جس نے تم کو یہ اسم بتایا ہے روحانی طاقت ہے جو ہم آگئے ہیں۔“

”تو اب آپ کا کیا کام ہے؟“ سلیم بولا۔

”صرف تمہیں سیدھی راہ دکھانی ہے۔ اللہ کا خوف دلانا ہے۔ تم کہو تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو کوئی خزانہ مل جائے
جدھر نظر ڈالوں مجھے دولت ہی دولت دکھائی دے۔“
موکل تیز لہجہ میں بولا۔ ”یہ سب نامعقول
مطالبات ہیں جن کے سبب ہمیں عملیات کی اطاعت سے
گزرنا پڑا ہے۔ سونے چاندی کا ڈھیر لگانا کسی خزانے کی
جگہ کا بتانا ہمارے نزدیک کچھ مشکل نہیں لیکن اس قسم کے
کام قدرت الہی کے خلاف ہیں۔“
”اچھا مجھے کسی ملک کی ریاست کا بادشاہ بنادو تاکہ
زندگی عیش و آرام سے گزرے۔“ سلیم آہستہ سے بولا۔
موکل نفرت خیز لہجہ میں بولا۔ ”ہوس کی شکار گاہ
میں تم کو چھوڑ دوں کیا خوب کہا ہے تم نے پہلے ہی تمہارے
ملک بھیڑیے غریب عوام کے لئے کیا کم ہیں کہ آپ کا
بھی اضافہ کر دیا جائے۔“
”یہ بھی تو کم از کم سونے چاندی کا اچھا سا
نسخہ ہی بتا دو میں خود ہی سونا چاندی بنالیا کروں گا۔“
موکل بولا۔ ”اس کے معنی تو یہ ہیں کہ تم کو خدا کی منشا
کے خلاف یہ کار اور سونے کا جھوٹا بادشاہ بنادوں تم سونے کا
نمونہ لے کر مخلوق خدا کو گمراہ کر دو اور ہندوگان الہی تم سے
سونے کا دھوکھا کر رہا ہوں۔“
”میں تو دولت کا طلب گار ہوں۔“ سلیم
بولا۔ ”اسی کی خاطر ساری مشقتیں اٹھائی ہیں دولت سے
تمام خواہش پوری ہو سکتی ہیں اور آپ اس مدد کے لئے
تیار نہیں۔“
موکل غصے میں آکر بولا۔ ”تمہارا یہ خیال غلط ہے
کہ دولت سے خواہش پوری ہو سکتی ہیں دولت تو انسان کے
لئے آگ ہے جس کا آخرت میں حساب بڑا سخت ہے
۔ اے ناقص الفطن انسان تو اس چیز کی کیوں طلب کرتا ہے
جو فانی ہے جس کا زوال تو نے اپنی آنکھوں سے اپنے گھر
میں دیکھا ہے جس سے آج تک کسی کوئی سکون میسر
آیا ہے اور نہ روحانی سکون ملا ہے یہ شیطانی دوسہ ہے دل
سے نکال اور اس کا طالب بن جس کے قبضہ قدرت میں
ایک یہ کیا ساری دنیا کے آرزو دار کل کا نجات ہے۔“
”وہ کیا قادر کن کا خزانہ یا کسی ملک کی بادشاہت

ہے۔“ سلیم بھولے پن سے بولا۔
موکل تعجب سے بولا۔ ”وہ خدا کی محبت اور رسول کی
اطاعت ہے۔ نماز اور قرآن پڑھ تیری آخرت سنو جائے
گی تجھے روحانی سکون ملے گا۔ نماز پڑھ تیرے سارے گناہ
دھل جائیں گے تیری بخشش ہو جائے گی۔ یہی تیرا خزانہ
ہے یہی تیری آخرت کی دولت ہے۔“
”لیکن میں تو دولت کا آرزو مند ہوں مجھے دولت
مند بننے کی خواہش ہے نماز روزہ تو بعد کی باتیں ہیں۔“
سلیم بولا۔
موکل غضب ناک ہو کر بولا۔ ”تو قدرت الہی کی
توہین کرتا ہے خیر اگر تجھے دولت دینا سے ہی لگاؤ ہے تو دنیا
کے قانون کے مطابق جیل کوئی ایسا کام اختیار کر جس سے
مالدار بننے کا راستہ کھل جائے۔“
”دولت کے لئے تو میں نے عملیات کے باوجود
پس ان ریاضتوں کا تو یہ پھل نہیں ملنا چاہئے پھر کام کرنے
کی ہمت ہوتی تو آپ کی دعوت میں جان کیوں بھجاتا۔“
موکل آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایسے
پست ہمتوں دنیا والوں کے لئے قانون قدرت میں کوئی
دفعہ موجود نہیں ہے دنیا میں بغیر ہاتھ پاؤں ہلانے کچھ
نہیں ملتا۔ اس دنیا میں محنت اور کوشش سے تقدیر بنتی ہے۔“
آپ تقدیر تو بدل سکتے ہیں مگر مجھ سے آپ کو خند
ہو گئی ہے خیر وہ کام ہی بتا دیجئے جس سے دولت ہاتھ
آجائے مگر زیادہ محنت میں نہیں کر سکتا۔“
موکل بولا۔ ”جیری مریدی قوی پیشوا کی اور فرقہ
داریت داعظ کوئی ایسے پتے ہیں کہ جتنی چاہو دولت سمیٹ
لو ان میں سے جس فن کو اختیار کرو گے میں مدد کرنے
کو تیار ہوں۔“
”آپ اچھے موکل ہیں۔“ سلیم بولا دولت آپ
نہیں دے سکتے۔ بادشاہت دینے سے آپ نے
انکار کر دیا سونا آپ بنانا نہیں چاہتے۔ مگر مجھ میں اتنا
صبر نہیں ہے اور کیا ان پیشوں میں دھوکہ نہیں ہے۔“
”تمہاری کم ہمتی نے جب مال مفت کو ہی اپنی
تقدیر سمجھ لیا ہے تو تمہیں ایسے ہی مکر فریب سے دولت

اصل ہو سکتی ہے۔“
”ان کاموں کے لئے بھی تو ہر مندی درکار ہے۔
میں اپنے میں نہ حکیم بننے کی قابلیت پاتا ہوں۔ نہ جیری
مریدی کی اور جلی مذہب کا پیشوا ہونا تو بڑی چیز ہے نہ بابا
نہ یہ تو بیکار اندازوں کی باتیں ہیں۔“
موکل دھیرے سے بولا۔ ”اگر تم ان آسان پیشوں
پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو دنیا میں دھکے اور ٹھوکریں کھاتے
رہو خلقت انسانی کو سوار کرنے والے ہندے آخرت سے
ناخال ہوتے ہوئے انسانی دنیا کے لئے نمونہ بن جاتے
ہیں۔“
”میں مانتا ہوں کہ حکیم بننے کے لئے کچھ نہ کچھ
قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے تھوڑا بہت روپیہ بھی چاہئے
دعظ گوئی اور دنیا داری بھی ذرا مشکل کام ہے۔ دوڑتے
ہوئے دماغ اور جلتی ہوئی زبان کے بغیر یہ دکانیں نہیں
چلتیں سیاسی دور میں جہاں مال آنے کا قوی امکان
ہے۔ وہاں پولیس کی سختیاں جیل کی مشکلیں اٹھانے کی
جرات ہونی لازمی ہے تم جیسے شخص کے لئے تو بہترین کام
جیری مریدی جس میں نہ کسی ساز و سامان کی قید ہے نہ کسی
قابلیت کا خرچہ بہت سی مسجدیں خانقاہیں پرانے مقبرے
دیران پڑے ہیں جہاں جی چاہے جا کر بیٹھ جاؤ۔
جتنی زیادہ سنان جگہ اختیار کرو گے لوگ اسی
قدر زیادہ گرویدہ ہوں گے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری
شہرت کے لئے کوشش کروں گا اور تھوڑے دن بعد تمہیں
ہر صاحب کا سرکار جی ہشاہ صاحب، وردیش بابا، پیر
جنوں والا اور جو کچھ تم چاہو گے بنادوں گا لاکھوں بوڑھے
بزرگوں مردوں بزرگوں ہی پر ہندو سر لڑکیاں عورتیں تمہارے
ہاتھ چومیں گی اور تم مرنے کرنا۔“
رنگ رنگ کی دنیا تمہارے پاس آئے گی۔
مراویں لینے کے لئے فقیر بادشاہ کہلاؤ گے اس بیٹے میں
دولت کمانے کی ساری خواہشیں تمہاری پوری ہو جائیں گی
اب بولو تمہارا کیا ارادہ ہے۔؟“
”کام تو ٹھیک ہے۔“ سلیم بولا۔ ”لیکن میرے
میں کا نہیں۔ جگہ کی قید ہر شخص سے نئے طرز کی گفتگو کرتا

ہر روز کا علاج ہر خواہش کی دوا۔ نہیں مجھ سے یہ ہو سکے
گا۔ آپ تو اللہ کے واسطے دست غیب کا انتظام کر دیں۔
زیادہ نہیں تو دس ہزار روزانہ ہی سہی۔ صبح ہوئی اور سہانے
کے نیچے سے اٹھائے۔“
موکل بولا۔ ”تو پیر فقیر یا وردیش صاحب کرامت
مشہور ہو جائے گا آنکھوں میں سرسوں پھول جائے گی
دست غیب کیا چیز ہے دنیا کے سارے چھپے ہوئے خزانے
نظر آنے لگیں گے جب سہائیں ہندی لگے ہاتھوں سے
پاؤں دباؤ باکہ مراویں مانگیں گی اور آنسوؤں کی زبان سے
اپنے اخلاص کا اظہار کریں گی۔ تو ان حسینوں سے آنکھ
ملائے کو تیرا دل نہیں چاہے گا طرح طرح کے نذرانے
نیازیں عورتیں لے کر آئیں گی۔ اب بولو کیا کہتے ہو۔“
”آپ بڑے ضدی ہیں۔“ سلیم بولا۔ ”اچھا مجھے
منظور ہے۔ عملیات کے شوق اور روایتوں کی محبت کے
سبب میرے لئے یہ زندگی بالکل نئی بھی نہیں ہے۔“
موکل نے عقارت آمیز نگاہ سے سلیم کو دیکھ کر کہا۔
”جا اپنا کام شروع کر۔ جیسی گندی بھتیگی کی خواہش تو نے کی
ہے۔ ویسے ہی پھل تجھے ملیں گے۔ خدا کی حقیقت سے
تو نے گریز کیا ہے اس لئے وہ بھی ہمیشہ کے لئے تجھ سے
روپوش رہے گا۔“
یہ کہہ کر موکل غائب ہو گیا سلیم نے چار برس میں
کئی روپ بدلے۔ پیر بنا، عامل بنا، خوب شہرت پائی
پورے پورے عیش اڑائے۔
چاروں کی چاندنی کے بعد جواندھیرا شروع ہوا۔
تو سارے کمالات خاک میں مل گئے، دنیا بے دشت
ہو گئی اور ایک مدت سے بازاروں میں کپڑے بھاڑے
ہوئے پھرتا رہتا ہے کوئی کچھ بہتا ہے کوئی کچھ بھٹکتا ہے۔
لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ خدا کے
دھمکارے ہوئے نہ گھر کے نہ گھاٹ کے رہتے ہیں،
نا قابل یقین، عبرت ناک اور نفرت آمیز یہی ان کی سزا
ہوتی ہے۔



وہ واقعی پر اسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

بلگشتہ قسط کا خلاصہ

خیردار۔ حدود سے آگے بڑھنا عیب ختم ہوا۔ اب تو اپنی من مانی نہیں کر سکتا اور پھر کسی نادیہ ہاتھ نے روشاک کو پشت سے پکڑ کر اوپر کو اٹھا لیا اس کے بعد خود بخود دروازہ کھلا اور روشاک ہوا میں معلق دروازے سے باہر نکلا چلا گیا۔ دروازہ سے نکلنے ہی خود بخود دروازہ بند ہو گیا اور اب روشاک بڑی تیزی سے ہوا میں معلق ایک طرف کو بڑی تیزی سے اڑتا چلا جا رہا تھا اس نادیہ ہاتھ نے اسے بڑی مضبوطی سے اپنے گھٹنے میں پکڑ رکھا تھا۔ اور پھر جب وہ ایک دیرانے میں پہنچا وہ ویرانہ تاحد لگا پھیلا ہوا تھا۔ اس ہاتھ نے روشاک کو اوپر سے نیچے بڑی بے دردی سے پھینک دیا۔ روشاک نیچے گر کر اور پھر اس کی ٹلک شکاف چھتیاں پورے دیرانے کو دھلا گئیں۔ کافی دیر تک وہ بے سندھ پڑا سوچو سوچو سے بے خبر رہا۔ پھر جب اس سے ذرا ہوش آیا تو اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا لیکن لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ کچھ نہ سکا کہ وہ کون سی نادیہ قوت ہے جس نے اسے اس طرح اپنے گھٹنے میں پکڑنے کے بعد مجھے اس دیرانے لایا۔ خیر وہ تھوڑی دیر بعد اپنے قدموں پر پڑ کھڑا ہوا اٹھا اور اپنے قبیلے کی جانب اڑاں بھری۔ قبیلہ میں موجود اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ اپنی بے آب کی طرح تڑپے لگا۔ اسے خوشبو سے دوری تیار ہی تھی، خیر اس کے اپنے دل کو سمجھایا کہ کوئی بات نہیں، میں اس نادیہ قوت کو دیکھوں گا اور اسے بھانک انجام تک پہنچا دوں گا۔ روشاک کی شرانگیزی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی جس کے پیش نظر رولوکا نے کئی مرتبہ اسے روکا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز رہے مگر وہ اپنی ضد کے آگے اشتعال میں آتا گیا اور وہ رولوکا کی طاقت کو بھی بھانپ گیا کے والد کے پاس پہنچ گیا، رولوکا کو اپنے قبیلہ میں دیکھ کر جنوں کا سردار مناش حیرت میں پڑ گیا اور وہ رولوکا کی طاقت کو بھی بھانپ گیا اور پھر رولوکا نے اپنی شکایت سردار کے آگے گوش گزار کر دی۔ جسے سن کر سردار بولا۔ معزز مہمان آپ اپنا اصل دعایان کریں۔ تو رولوکا بولا۔ سردار محترم! آپ کے قبیلہ کا ایک نا فرمان اور ضدی جن ہے جس نے ایک آدم زادی کی عزت پامال کر دی ہے اور اس آدم زادی پر اپنا تسلط جہا بیٹھا ہے اور وہ نا فرمان جن ہے آپ کا بیٹا روشاک!! یہ سنتے ہی سردار کے تیور بدل گئے اس کا چہرہ غصے سے تھما اٹھا اور غصہ غصہ کی حالت میں حرکت اور گرجدار آواز سنائی دی۔ ”رو..... شا..... ک.....“

(اب آگے پڑھیں)

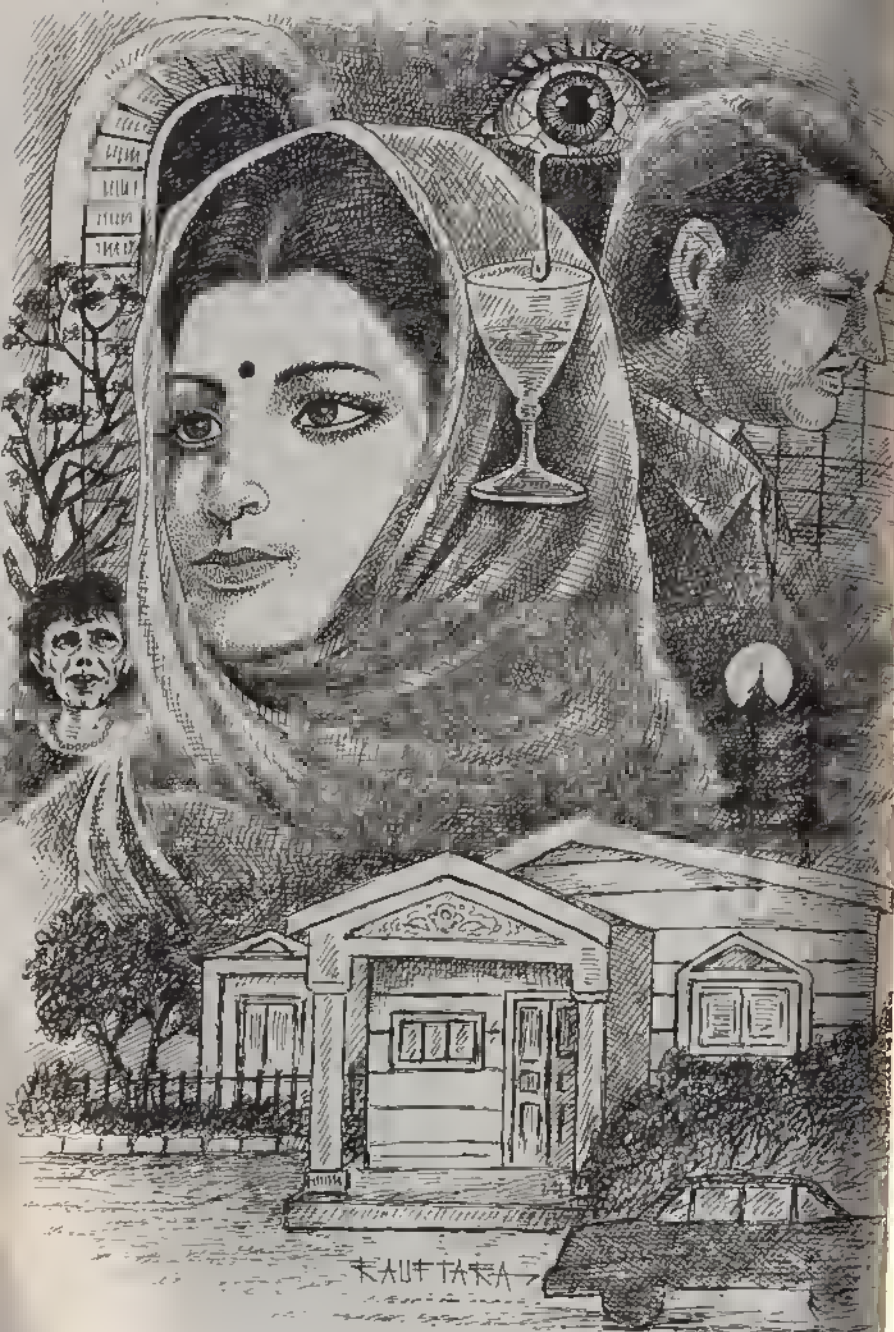
سردار کی آواز پوری محفل میں دینگ

طریقے سے گونج گئی۔ اچانک روشاک اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سہا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ محفل میں بیٹھے تمام جنات نے اپنی نظر اس پر مرکوز کر دیں۔ سردار کی تہہ برساتی نگاہیں اس پر جم گئی تھیں۔

روشاک نے سردار کی تہہ برساتی آنکھوں کی طرف دیکھا تو ان آنکھوں میں غضب اور نفرت کا سمندر ٹھانٹیں مارتا نظر آیا۔ روشاک اندرونی طور پر پکپکا نے لگا۔ اچانک سردار کی غصیلی اور گرجدار آواز سنائی

دی۔ ”روشاک اگر کچھ کہنا ہے تو کٹھنرے میں جا کر کہو۔“
روشاک غڈ محال اور لڑکھڑاتے قدموں سے کٹھنرے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔
مگر یہ کیا۔ ایک بجلی کا کوندا سا لپکا اور روشاک کٹھنرے سے غائب تھا۔

محفل میں بیٹھے سارے جنات اچنبھے کی حالت میں کٹھنرے کو گھور رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سردار بھی اچنبھے کی حالت میں کٹھنرے کو گھورے جا رہا تھا۔
سردار کے قریب ہی ایک بہت ضعیف بارش جن



کھڑا تھا جسے سردار کی مرتبہ استاد محترم کہہ کر مخاطب کر چکا تھا۔ سردار مخاطب ہوا۔ ”استاد محترم! ردشاک فرار ہو چکا ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ردشاک مجرم ہے۔ انہی یعنی مجرم رولو کا کی ساری باتیں حقیقت ہیں، اگر ردشاک قصور وار نہیں ہوتا تو یقیناً اپنی صفائی میں کچھ کہتا۔ استاد محترم اب آپ کی کیا رائے ہے؟“

”سردار! آپ کی بات درست ہے اور ردشاک کی یہ حرکت اسے مجرم ثابت کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ردشاک گیا کہاں ہے؟ اسے ہر حال میں اپنے قبیلے میں آنا ہے اور اگر ردشاک خود نہیں آتا تو اسے زبردستی لانا پڑے گا۔ یہ قبیلے کے قانون کے خلاف ہے کہ ہمارے قبیلے کا کوئی جن قبیلے کے قانون کو فراموش کر کے قبیلے سے فرار ہو جائے اور جو ایسا کرتا ہے وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ فرار ہونے والا ہماری پہنچ اور نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور ایسا کرنے والے جذبات میں ایسا قدم اٹھاتا ہے۔“

آپ چند چٹاؤں کو فوراً درڑائیں جو کہ پتہ کریں کہ ردشاک گیا کہاں اور پھر یہ محافظ زور زبردستی اسے قبیلے میں لے آئیں تاکہ حقیقت کا پتہ چلے۔ استاد جن یہ بول کر خاموش ہو گیا۔ سردار نے چار جنوں کو آواز دی اور بولا۔ ”فورا جاؤ اور یہ معلوم کرو کہ ردشاک کس طرف اور کہاں گیا ہے، اگر وہ آرام سے آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ زور طاقت لے لے اور اگر زور زبردستی کرے تو بالکل ہچکچائے بغیر طاقت کا استعمال کر کے ہر حال میں لے آنا۔“

”جی سردار! آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ ہر حال میں ہم اسے ضرور لے آتے ہیں۔“ ان چاروں محافظوں میں سے ایک بولا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے غائب ہو گئے۔

چاروں محافظوں کے جانے کے بعد سردار رولو کا سے مخاطب ہوا، رولو کا ابھی تک غائب حالت میں اپنی جگہ موجود تھا۔

”محترم رولو کا! ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں اور جو کچھ بھی ہوا آپ کے سامنے ہے، آپ کی تمام

باتیں درست ہیں اور ہم آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے اپنے محافظوں کو آپ کے سامنے بھیج دیا ہے تاکہ وہ ردشاک کو ہر حال میں اس جگہ لے آئیں۔

ردشاک کے اس جگہ آتے ہی اس نے جو حرکت کی ہے اور پھر جو اس نے قبیلے کا قانون توڑا اسے اس بنا پر اسے قانون کے مطابق قریباً سزا دی جائے گی اور جو بھی سزا اسے دی جائے گی آپ کے سامنے دی جائے گی۔ ہم جب بھی کسی کو سزا دیتے ہیں قبیلے کے تمام لوگوں کے سامنے اور جو سزا کا مستحق پایا جاتا ہے اسے اپنی صفائی میں بولنے کا پورا پورا حق بھی دیا جاتا ہے۔ ہم ہمیشہ احکام خداوندی کا خیال رکھتے ہوئے انتہائی قدم اٹھاتے ہیں۔

اب میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنے ٹھوس اجسام میں آکر ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ آپ کی خدمت کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔ ہم نے جان لیا ہے کہ آپ واقعی اچھے دل دماغ اور احکام خداوندی کو مد نظر رکھتے ہوئے شریعت کے پابند ہیں۔ اگر آپ ایسے نہ ہوتے تو ردشاک کو اب تک آزاد نہ چھوڑا ہوتا۔ اور پھر آپ یہاں تک آنے کی تکلیف نہ اٹھاتے، اچھے لوگ ہمیشہ مستقل مزاجی اور برابری کا ثبوت دیتے ہیں۔ میں ہی نہیں، بلکہ ہمارا پورا قبیلہ آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کا مستحق ہے۔ آپ ہماری خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے برائے مہربانی کچھ تو خدمت کا موقع دیں۔“ سردار بولا۔

”قابل قدر سردار! آپ کو اور آپ کے قبیلے کے تمام لوگوں کو میں سلام پیش کرتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اصول اور شریعت کے بہت پابند ہیں۔ قانون کی پاسداری آپ لوگوں کے لئے بہت اہم ہے۔ میں آپ کو اپنی خدمت کا موقع ضرور دوں گا لیکن اس وقت میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ردشاک اس وقت یہاں سے فرار ہونے کے بعد کسی ایسی جگہ جائے گا جو کہ آپ لوگوں کی پہنچ سے دور ہو۔ اگر اس کے دماغ میں ایسا نہ آتا تو کسی صورت بھی وہ فرار نہ ہوتا۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ آپ سے بچ نہیں سکتا بلکہ ہر حال میں وہ آپ کی گرفت میں آجائے گا۔ خیر اس وقت میں ایک کام کے

تحت جا رہا ہوں۔ مگر یہ میرا وعدہ ہے کہ جب وہ آپ کی گرفت میں آجائے گا تو اس وقت میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔

اور اگر آپ کو کسی قسم کی کوئی بھی دشواری پیش آئے اسے اپنے قبیلے میں لانے کے لئے تو میری خدمات حاضر ہیں، آپ ہمیشہ مجھے اپنے قریب پائیں گے، ابھی تو میں جا رہا ہوں اور بہت جلد ہماری ملاقات دوبارہ ہوگی۔

میں ایک مرتبہ پھر آپ کو یاد دلانا ہوں کہ میری ضرورت پڑے تو آپ بغیر کسی تردد کے میرے پاس اپنا پیغام بھیج سکتے ہیں۔ میں فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ یہ بول کر رولو کا اپنی جگہ سے جہاں وہ موجود تھا غائب ہو گیا۔

اور ردشاک قبیلے سے فرار ہو کر سیدھا خوشبو کے پاس پہنچا۔ اس کی حالت بہت ہی بدحواس ہو رہی تھی اس وقت خوشبو چھت پر اپنے کمرے میں موجود تھی اور سر پر تاجہ رکھے اپنی سوچوں میں غرق تھی۔ وہ ایک تک خوشبو کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ جس حالت میں تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ اندرونی طور پر اس پر کچھ طاری تھی۔

اسے یہ تو پتہ تھا کہ اس کے قبیلے والے اسے پکڑنے کے لئے آئیں گے ضرور اور کسی حال میں بھی وہ بچ نہیں سکتا مگر وہ اپنے تئیں ایسے اقدام اٹھا کر یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ اسے بولنا دو بھر ہو رہا تھا۔ مگر بہت مشکل اور کوشش کے بعد اس کے منہ سے نکلا۔ ”خوشبو!“

خوشبو نے جیسے ہی اپنا نام نا تو پٹ سے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھر ردشاک کو اس حال میں دیکھ کر وہ جھٹ اٹھ بیٹھی۔ اور اپنی نظریں ردشاک پر مرکوز کر دیں وہ بھی ایک تک ردشاک کو دیکھے جا رہی تھی۔ خوشبو اچنبھے میں تھی کہ اس وقت ردشاک کبھی آیا نہیں اور آج خلاف توقع اس وقت آنا اور پھر اس بگڑتی ہوئی خستہ حالت میں۔ ”آپ اور اس وقت!“ اس کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا۔

ردشاک لڑکھڑائی زبان سے بولا۔ ”خوشبو! جلدی چلو! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تمہیں اس وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ فوراً اٹھو۔ نہیں تو میں تمہیں زبردستی لے جاؤں گا، تمہیں حاصل کرنے کے لئے میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہوں۔“

میرا کوئی اندیکھا دشمن تمہاری ذات کے مد نظر میرے قبیلے تک پہنچ چکا ہے اور اس نے تمہارے لئے میرے میل جول کو میرے والد کو بتا دیا ہے اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے در بدر ہو چکا ہوں، میں دنیا چھوڑ سکتا ہوں مگر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“

ردشاک کو ایک تک دیکھتے ہوئے خوشبو بھی ہوئی تھی، وہ شش و پنج میں تھی، وہ جان چکی تھی کہ یہ بد بخت کوئی بھی خطرناک قدم اٹھا سکتا ہے اور اس کے اٹھائے ہوئے قدم کو وہ بھی کبھی صورت روک نہیں سکتی اور نہ ہی خود کو وہ اس کے چنگل سے بچا سکتی تھی۔

ردشاک کی گھبراہٹ مزید بڑھتی جا رہی تھی، اس نے حتی الامکان فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر صورت وہ خوشبو کو اپنے ساتھ ضرور لے جائے گا۔

اور جب ردشاک اپنے قبیلے سے فرار ہوا تو فوراً رولو کا کے دماغ میں یہ بات آگئی تھی کہ ردشاک سب سے پہلے خوشبو کے گھر ضرور جائے گا خوشبو سے ملنے کیونکہ رولو کا کو یہ بھی پتہ تھا کہ ردشاک جنوں کی حد تک خوشبو کو چاہتا ہے۔

اس بنا پر ردشاک کی کوشش ہوگی کہ وہ خوشبو کو بزر طاقت اپنے ساتھ لے کر چلا جائے۔

یعنی سوچ کر رولو کا نے فوراً اپنے کئی کارندوں کو ردشاک کے پیچھے خوشبو کے گھر تک روانہ کر دیا تھا۔ اور کارندوں کو حکم دیا تھا کہ اگر ردشاک خوشبو کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت کرے یا پھر خوشبو کو زور زبردستی اپنے ساتھ لے جائے یا کوشش کرے تو پھر پور مزاحمت کر کے اسے ایسا کرنے سے روکا جائے اور اگر وہ آرام سے اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے۔ اور پھر بھی وہ زیادہ زور آزمائی کرے یا پھر اپنی

جنتی قوت کو سامنے لائے تو اس کا کسی قسم کا بھی خیال نہ کیا جائے اور اسے قید کر کے اس کے قبیلے میں لایا جائے اور اگر وہ اسے ناپسند کرے اور اوجھے ہٹکندوں پر اتر آئے تو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے۔

رولوکا کے کارندے خوشبو کے کمرے میں موجود تھے اور روشاک کی ہر حرکت کو دیکھ رہے تھے اور اس کی تمام باتیں بغور سن رہے تھے۔ کارندے بالکل چوکے تھے کہ کسی بھی بل روشاک کے غلط قدم کو روک سکیں اور وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے اسے وہ نہ کرنے دیں۔

خوشبو کے سامنے کمرے میں موجود روشاک ہر ایک لمحہ کو نوٹ کر رہا تھا۔ وہ اس قدر بدحواس اور ڈرا ہوا تھا کہ اسے کمرے میں موجود رولوکا کے کارندوں کا بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ وہ تو کمرے میں موجود رولوکا یا پھر اس کے کسی کارندے کو کسی مرتبہ محسوس کر چکا تھا اور پھر ایسا محسوس کرتے ہوئے اپنی جنتی طاقت کا استعمال بھی کر چکا تھا۔ وہ کسی کارندہ یا پھر رولوکا پر قابو نہ پا سکا تھا مگر ہر مرتبہ کوشش اس نے ضرور کی تھی۔

آج اس کو اپنی جان کی پڑی تھی تو اسے کسی اور کا احساس کیونکر ہو سکتا تھا کمرے میں اسے آئے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اس پر مزید گہرا ہٹ سوار ہو رہی تھی۔ وہ زور سے چیخ پڑا۔ "خوشبو کیا میری بات نہیں سناتی نہیں دے رہی، میں تمہارے لئے مرنے کے لئے تیار ہوں اور تمہارے کانوں میں جوں تک نہیں رینگ رہی ہے۔ اٹھو! اور چلو میرے ساتھ!"

یہ بولتے ہی اس نے خوشبو کی کلائی زور سے پکڑ لی کہ اچانک ایک زوردار تھپڑ اس کے دائیں گال پر پڑا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اس کے ہاتھوں سے خوشبو کی کلائی چھوٹ گئی اور وہ خود بڑی تیزی سے کسی چکر گھوم گیا۔ لیکن اس کے بعد وہ کمرے میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہرا نہیں اور پلک جھپکتے ہی خوشبو کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

خوشبو پر جیسے سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ روشاک کا اچانک اس وقت آنا، اس کی بدحواسی کی حالت، ڈر اور

خوف میں ڈوبی ہوئی آواز، اس کی زبان بھی آج اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی، یہی سب باتیں اور پھر اچانک کلائی پکڑ کر یہ کہنا کہ فوراً میرے ساتھ چلو۔ یہ ساری باتیں خوشبو کی سمجھ سے بالاتر تھیں اور پھر اچانک اس کے گال پر زوردار تھپڑ کا پڑنا، جس کی آواز خوشبو نے صاف سنی تھی تھپڑ مارنے والی نادیہ ہستی کون تھی اور اس نے اسے زوردار تھپڑ روشاک کو کیوں مارا تھا، خوشبو واقعی سکتے کی ہی کیفیت میں تھی۔

اتنے میں نیچے سے سیڑھیاں چڑھتی اس کی چھوٹی، بہن کھکشاں خوشبو کے کمرے میں آئی اور اس نے بے سندھ بیٹھی خوشبو کو دیکھا تو چونک گئی۔ کیونکہ کھکشاں کے کمرے میں آنے پر بھی خوشبو کو پتہ نہ چلا تھا کہ کھکشاں کمرے میں آ کر اس کے سامنے کھڑی ہے۔

کھکشاں گھبراتے ہوئے زور سے بولی۔ "باجی کیا ہوا ہے آپ کو؟"

کھکشاں کی آواز سن کر خوشبو یکدم چونک پڑی اور چمکاتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا۔ "آ۔۔۔۔۔"

آ۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ اور کھکشاں پر نظر پڑتے ہی خوشبو نے فوراً تکیہ پر اپنا سر رکھ کر زوردار رون شروع کر دیا۔ وہ بلند آواز سے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے رد رہی تھی۔

خوشبو کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے کھکشاں کے منہ سے زوردار آواز نکلی۔ "ای۔۔۔۔۔ ای۔۔۔۔۔"

کھکشاں کی آواز اتنی زوردار تھی کہ جھٹ اس کی امی دوڑتے ہوئے فوراً کمرے میں آ گئیں۔ اور پھر ان کی نظر خوشبو پر پڑی جو ابھی تک روئے جاری تھی۔ اب تو اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ کھکشاں خاموش کھڑی تھی۔ وہ بھی خاموش کھڑی خوشبو کو دیکھنے لگیں۔

اتنے میں کھکشاں کی آواز سنائی۔ "ای جی جب میں کمرے میں آئی تو دیکھا کہ باجی تک بے سندھ سی دیوار کو دیکھ جا رہی تھیں۔ کمرے میں میرے آنے کا بھی انہوں نے محسوس نہ کیا، اور پھر جب میں نے باجی کو کہہ کر آواز دی تو یہ چونک پڑیں اور پھر بچھ پر نظر پڑتے

ہی تھیں۔ پر منہ رکھ کر زوردار قطار رونے لگیں اور اب یہ حالت۔"

ای آگے بڑھیں اور انہوں نے خوشبو کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ خوشبو فوراً امی اور امی پر نظر ڈالتے ہوئے بستر سے نیچے کھڑی ہو کر امی کی گردن میں جیسے جھول گئی۔

"ای۔۔۔۔۔ ای۔۔۔۔۔ میں بچ گئی۔ میری قسمت اچھی تھی ورنہ میں۔۔۔۔۔" اور وہ مزید ہچکیوں میں زور زور سے رونے لگی۔

"ارے بیٹا! بتاؤ تو سہی ہوا کیا۔۔۔۔۔ چلو بتاؤ، روئے نہیں؟" وہ خوشبو کے بالوں میں ساتھ ہی ساتھ انگلیاں بھی پھیرتی جا رہی تھیں۔ پھر وہ بولیں کھکشاں جلدی سے گلاس میں پانی لاؤ۔

یہ سن کر کھکشاں فوراً نیچے دوڑی پانی لینے کے لئے اور چند لمحوں میں ہی ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئی اور امی کے ہاتھ میں پکڑ دیا۔

"خوشبو! جلدی سے پانی پی لو۔۔۔۔۔ چلو جلدی کرو۔ پانی پی لو، جی ہلکا ہو جائے گا۔۔۔۔۔ پھر مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟" پھر انہوں نے خوشبو کا سر اپنے سینے سے الگ کیا۔ رو کر خوشبو کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ "لو پانی پی لو۔"

اور انہوں نے گلاس خوشبو کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گلاس کا ہونٹوں سے لگنا تھا کہ خوشبو نے ایک لمبا سانس کھینچا اور غناغت پورا گلاس خالی کر دیا۔ امی نے خوشبو کو بستر پر بیٹھا دیا اور خود بھی اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

"ہاں۔۔۔۔۔ تو اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟"

"ای۔۔۔۔۔ ای تھوڑی دیر پہلے وہ اچانک کمرے میں آیا۔ اس کی حالت بہت بگڑی ہوئی تھی۔ اس پر کچھ طاری تھی، وہ بہت گھبرایا ہوا بدحواس ہو رہا تھا۔ آتے ہی بولا۔ "خوشبو میں تمہارے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا، میں ہر قیمت پر تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ چلو فوراً اس حالت میں اٹھو

اور میرے ساتھ چلو۔" اور پھر اس نے میری کلائی پکڑ لی اور مجھے کھینچنے لگا کہ اچانک کسی نادیہ ہستی نے اس کے گال پر اتنے زوردار تھپڑ مارا کہ وہ کسی چکر گھوم گیا اور پھر پلک جھپکتے ہی کمرے سے غائب ہو گیا۔ ای! ہم اس نادیہ ہستی کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ کرم ہے کہ آج اللہ نے مجھے بچایا۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ آج وہ مجھے لے جا چکا ہوتا۔۔۔۔۔ اگر وہ ہستی نہ آتی تو میں آج آپ کے سامنے نہ ہوتی۔ ای۔۔۔۔۔ ای۔۔۔۔۔ اور یہ بولتے ہوئے خوشبو پھر زوردار قطار رونے لگی۔

"خوشبو بیٹا! مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی رحم و کرم ہے۔ اللہ اپنے بندوں کی ضرورت سناتا ہے۔ اس کے گھر دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ چلو روئے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور وضو کر کے فوراً دو رکعت شکرانے کی نفل پڑھ لو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ چلو نیچے چلو۔" خوشبو امی نے کہا۔

"خوشبو نیچے آئی اور وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھنے لگی۔

ادھر رولوکا کے خفیہ کارندوں نے رولوکا کو پوری روادو سنا دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جیسے ہی روشاک کے گال پر زوردار تھپڑ لگا تو وہ چکر کر رہ گیا اور فوراً خوشبو کے کمرے سے آندھ کی طرح نکلا اور شمال کی سمت بڑھتا چلا گیا۔ اس کی رفتار بہت زیادہ ناقابل بیان حد تک تیز تھی۔ اس جگہ سے کافی دور ایک پہاڑی علاقے میں پہنچ گیا۔ وہ علاقہ پورے کا پورا پہاڑوں کے درمیان ہے۔ وہ آٹا ناس قبیلہ کی حدود میں گھستا چلا گیا۔

لیکن ہم آخری حدود تک جا کر رک گئے اور اسے جاتا دیکھتے رہے۔ وہ قبیلہ بھی جتانوں کا ایک قبیلہ ہے لیکن جہاں تک ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ قبیلہ غیر مذہب کا فوجوں کا قبیلہ ہے۔ اپنے علاقے کے حدود میں بے شمار جن اور اصرار جاتے نظر آ رہے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو ان پر ظاہر نہیں کیا۔ ہم تھوڑی دیر تک روشاک کا انتظار کرتے رہے مگر کافی وقت تک وہ پلٹ

کر واپس نہیں آیا تو ہم نے اپنی راہ لی۔ اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“ ایک کارندہ نے پوچھا۔
”تم لوگ ایسا کرو کہ اس قبیلہ سے دھرم کر روڈشاک کو چپک کرو، ہو سکتا ہے کہ کچھ وقت کے بعد وہ وہاں سے نکلے۔“

لیکن یہ خیال ضرور رکھنا کہ اس قبیلہ کے جنوں پر تم لوگوں کی موجودگی ظاہر نہ ہو۔ اور پل جلی کی خبریں مجھ تک پہنچاتے رہتا۔“ روڈشاک بولا تو اس کے کارندوں نے کہا۔ ”جی! بہت اچھا۔“ اور یہ بول کر وہ جدھر سے آئے تھے اس طرف کارخ کر لیا۔

کارندوں کے جانے کے بعد روڈشاک نے اپنا پیغام ہوا کی لہروں کے ذریعہ جتا توں کے سردار کے پاس پہنچایا۔ ”سردار! میں روڈشاک بول رہا ہوں۔ کیا روڈشاک کی کوئی خبر ملی کہ وہ کہاں ہے یا ایسا تو نہیں کہ وہ قبیلہ میں واپس آ گیا ہو؟“

اس طریقہ سے سردار نے بھی اپنا جواب روڈشاک تک پہنچا دیا۔ ”محترم و معزز روڈشاک صاحب! ہم نے اپنے تئیں یہ معلوم کر لیا ہے کہ روڈشاک نے غیر مذہب کا فر جنوں کے قبیلہ میں جا کر پناہ لے لی ہے۔ ان جنوں سے ہماری کبھی بھی نہیں، ہمارے اور ان کے قبیلہ کی ایک طویل عرصہ سے دشمنی چلی آ رہی ہے اور پھر ویسے بھی غیر مذہب والوں سے ہمارا کیا واسطہ۔“

لیکن ان کا اور ہمارا ایک معاہدہ ضرور ہے کہ چاہے ان کا یا ہمارا کوئی بھی جن جرم کر کے ایک دوسرے کے قبیلہ میں پناہ لے لیتا ہے تو باہمی مشورہ سے وہ مجرم جن ہم ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لہذا مجھے قوی امید ہے کہ روڈشاک ان کے پاس زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتا۔ روڈشاک کو ہم اپنے قبیلہ میں ضرور لے آئیں گے۔“

اور اگر انہوں نے ہٹ دھرمی کی تو پھر جنگ آمد جنگ آمد۔ یہ بول کر جنوں کا سردار خاموش ہو گیا۔ روڈشاک بولا۔ ”سردار صاحب! آپ نگر نہ کریں، اگر آپ کے مخالف قبیلہ والوں نے مطالبہ پر روڈشاک کو واپس نہ کیا تو

مجھے بھی آپ اپنے شانہ بشانہ پائیں گے۔ لیکن میرا ایک مشورہ ہے کہ آپ نگر نہ کریں جنگ و جدل میں دونوں طرف کا جانی نقصان ہو گا اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھ پر یقین رکھیں میں کوشش کر کے روڈشاک کو اس قبیلہ سے بخیر و عافیت نکال لاؤں گا۔ آپ کے حوالے کر دوں گا۔ یہ میرا آپ سے یہاں سے پہلے آپ اپنے تئیں اپنے معاہدہ کے تحت بارہ کریں۔“

ادھر جب روڈشاک کا فر جنوں کے قبیلہ میں پہنچا تو اس قبیلہ کے سردار جن نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور روڈشاک سے بولا۔ ”تم فطری نگر نہ کرو، میں کسی بھی حال میں تمہیں تمہارے والد کے حوالے نہیں کر دوں گا۔ تمہارے والد کے اصول، پابندی، سبے جانتی، سبے سر حکم، چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں اور سب سے زیادہ پابند شریعت یہ سب فضول باتیں ہیں، ہر جن کو اپنی مرضی سے جیسے کا حق ہے اور اگر کوئی جن کسی آدم زادی سے دل بہلاتا ہے تو اس میں کوئی قباحیت نہیں۔“

بلکہ ایسا کرنے والا جن آدم زادی کی خواہشات کا بھی احترام کرتا ہے اس کی ضروریات زندگی کا بھر پور خیال کرتا ہے اور اس کے لئے آدم زادی کے آسے دولت کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔ جس سے آدم زادی اپنی اپنے گھر والوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور اس طرح زندگی عیش سے گزرنے لگتی ہے۔ ویسے بھی اگر دیکھ جائے تو کوئی آدم زادی کسی بھی آدم زادی کے ساتھ زیادہ کرتا ہے، اسے اغوا کر لیتا ہے، اس کے ساتھ دست و پازی اور زیادتی کر کے آدم زادی کی عزت کو پامال کر دیتا ہے، اگر ایسا کرنے والا آدم زادی اور رسوخ ہوتا ہے تو اس کے لئے تمام قانون آدم زادیوں کے دھرم کے دھرم رہ جاتے ہیں، اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ آدم زادی پر بدچلتی کا الزام لگا دیا جاتا ہے کہ آدم زادی نے خود اپنی مرضی اور خواہش کے تحت قدم باہر نکالا تھا۔ دنیاوی عدالتیں امیروں، دولت مندوں، اثر رسوخ والوں اور بڑے بڑے تعلقات والوں کا ساتھ دیتی

ہیں اور قصور وار کو بری کر دیتی ہیں۔ صرف غریب اور بے یار و مددگار لوگ تختہ دار پر چڑھا دیے جاتے ہیں۔ میری نظر میں روڈشاک تم نے کوئی جرم نہیں کیا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم نے ایک آدم زادی سے دل بہلا لیا۔ میں ہر طرح سے تمہارا تحفظ کر دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے، تم فطری بے فکر ہو جاؤ۔ قبیلہ میں تم ازادی سے محسوس پھر دو، کھاؤ پو اور خوش رہو۔ میں تمہارے والد اور ان کے قانون سے نمٹ لوں گا اور میری یہ بھی کوشش ہوگی کہ وہ آدم زادی بھی تمہیں مل جائے۔“

سردار کی باتیں سن کر روڈشاک بہت خوش ہوا اور بولا۔ ”سردار صاحب! میں آپ کی بہادری اور ذہانت کی قدر کرتا ہوں۔ آپ کی تمام باتیں سو فیصد درست ہیں، میں ساری عمر آپ کا احسان مند ہوں گا اور آپ کے زیر سایہ اپنی عمر گزار دوں گا۔ میں اکثر آپ کی بہادری کے جہ سے مستحکم آج میں نے خود اپنی آنکھوں سے آپ کو دیکھ لیا۔“

سردار اپنی تعریف سن کر پھول گیا اور بولا۔ ”روڈشاک اب تم آرام سکون کے ساتھ مہمان خانے میں رہو، میں غلام کو بلا کر تمہیں مہمان خانے میں بھجوا دیتا ہوں، مہمان خانے میں رہو اور عیش کرو۔“ یہ بول کر سردار نے آواز دی تو ایک جن حاضر ہوا تو سردار نے روڈشاک کو اس کے ساتھ کر دیا اور بولا۔ ”انہیں لے جا کر مہمان خانے میں چھوڑ آؤ۔ اور مہمان خانے کے سرپرست سے بولنا کہ سردار کا حکم ہے۔ ان کو کسی قسم کی شکایت نہ دوان کے آرام کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔“

روڈشاک کے جانے کے بعد سردار خود بڑبڑانے لگا۔ ”اصول کے پابند سردار! اب میں تمہاری ساری اکثریت کو دل میں لے گا، اب تمہارا بیٹا میرے قبضے میں ہے اور جس پر عشق کا بھوت سوار ہو جائے وہ باپ تو کیا پوری دنیا سے بھی ٹکرانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ میں اپنی چالاکی اور پالیسی کے تحت تمہارے بیٹے کو تمہارے سے لیس کر کے تمہارے سامنے لا کھڑا کروں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ تمہارے اصول کیا کہتے ہیں۔“ اور یہ بول کر مسکرانے لگا۔

ادھر روڈشاک کے باپ نے اپنے قبیلہ میں اپنے تمام سرکردہ جنوں کو اکٹھا کیا اور ان سے صلاح مشورہ کرنے لگا۔ ہر پہلو پر غور کیا گیا۔ تمام بزرگ جنوں کا فیصلہ تھا کہ ہر صورت میں روڈشاک کو واپس لایا جائے، چاہے اس کے لئے دشمن قبیلہ والوں سے لڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔

کیونکہ دشمن قبیلہ نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے اسے معاہدہ کے تحت روڈشاک کو واپس کرنا چاہئے اور ویسے بھی روڈشاک نے غلطی کی ہے، اسے اپنے باپ کی عزت کا بھی خیال نہ رہا، اسے اپنی صفائی میں کچھ نہ کچھ کہنا چاہئے تھا۔ لیکن اچانک اس طرح فرار ہونے کا مطلب ہے کہ معزز روڈشاک نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ تمام درست ہے۔

روڈشاک نے اپنے پورے قبیلہ کی بے عزتی کی ہے کہ بھاگ کر دشمن کے پاس چلا گیا۔ سردار! آپ نگر نہ کریں قبیلہ کا ہر جن اپنے سردار اور قبیلہ کی عزت کے لئے اپنا سر کٹا لے گا اور قبیلے کا اصول پامال نہیں ہونے دے گا۔“

سردار بولا۔ ”معزز ساتھیو! مجھے قبیلہ کی عزت زیادہ عزیز ہے چاہے میری جان چلی جائے۔ میں قبیلہ کے اصول اور عزت پر آج نہیں آنے دوں گا۔ قبیلہ کے اصول عزت اور انصاف کے تحت روڈشاک کو قربان کر دوں گا۔ یہ میں نے اٹل فیصلہ کر لیا ہے۔ میری نظر میں قبیلہ کا ہر جن برابر کی کا حقدار ہے، کوئی چھوٹا بڑا نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ روڈشاک میرا بیٹا ہے تو وہ بچ جائے۔ اس نے ناقابل معافی غلطی کی ہے اور اس لئے وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔“

اور ہاں! یاد آ یا۔ محترم روڈشاک نے وعدہ کیا ہے کہ اگر دشمن قبیلہ نے پیار بھرت کا ثبوت نہ دیا تو وہ خاموشی سے روڈشاک کو ہمارے پاس لے آئے گا۔ اور مجھے امید ہے کہ روڈشاک کا وعدہ بکا ہے۔

خیر میری مرضی نہیں کہ ہم مہمان سے مدد لیں۔ ہم اپنے تئیں اور اپنے زور بازو سے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں قاصد جن کو بلا کر پیغام بھیجتا

ہوں کہ فی الفور روشاک کو واپس کریں ورنہ معاملہ آگے بھی جاسکتا ہے۔" سردار نے کہا۔

"سردار! ہماری طرف سے آپ کو اجازت ہے، قبیلہ کی بھلائی کے لئے آپ جو بھی قدم اٹھائیں وہ احسن قدم ہوگا۔ ہم سب کو آپ کی اور قبیلے کی عزت عزیز ہے۔" تمام محرم جنوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

سردار نے قاصد جن کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیا اور بولا۔ "یہ رقعہ سنگار قبیلہ کے سردار کے پاس لے جاؤ، پہلے آداب کرنا اور پھر یہ رقعہ اس کے ہاتھ میں دے دینا اور وہ جو بھی جواب دے اسے لے کر یہاں آجائے۔"

اور ہاں یاد آیا میں نے تو یہ رقعہ پڑھ کر آپ لوگوں کو سنایا نہیں کہ اس میں، میں نے کیا تحریر کیا ہے۔ میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے محرم اور بزرگوں کو سناؤں۔ اس میں لکھا ہے۔ "سنگار قبیلہ کے سردار کے حضور، یکیش قبیلہ کے سردار اور تمام جنات کی طرف سے آداب عرض۔ اصلی معاملہ جو ہے اور جس کے لئے یہ قاصد آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ قبیلہ کا ایک جن روشاک جو کہ میرا بیٹا بھی ہے، نادانی سے ایک جرم کر بیٹھا ہے اور سزا کے ڈر سے بھاگ کر آپ کی پناہ میں آ گیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہم دونوں قبیلوں کے معاملے کے تحت آپ روشاک کو فوراً ہمارے حوالے کر دیں۔ امید ہے کہ آپ شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔ خیر خواہ سردار مناش۔"

رقعہ کا متن جان کر اس جگہ موجود تمام جنوں نے کہا۔ "سردار آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔" اس کے بعد قاصد جن وہ رقعہ لے کر مخالف قبیلہ سنگار کی طرف پرواز کر گیا۔

چند لمحے میں قاصد جن سنگار قبیلہ کی حدود میں پہنچ گیا اور حدود کے باہر کھڑا ہو کر محافظ جنوں سے بولا۔ "میں یکیش قبیلہ کے سردار کا پیغام لے کر آپ کے سردار کے پاس آیا ہوں۔ آپ لوگ اجازت دیں تاکہ میں قبیلہ میں داخل ہو سکوں۔"

محافظ جنوں نے جب اسے سردار کا نام سنا تو جن آگے بڑھے اور بولے۔ "ٹھیک ہے تم ہمارے ساتھ چلو! ہم تمہیں سردار کے پاس لے چلتے ہیں۔" یہ بول کر وہ دونوں قاصد جن کے ہمراہ اپنے سردار کی جانب روانہ ہو گئے۔

سردار کے پاس پہنچ کر وہ تینوں مکان کے باہر نہر گھر گئے اور پھر ایک جن اندر گیا اور سردار سے اجازت لے کر قاصد جن کو سردار کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سردار نے قاصد جن سے رقعہ لیا اور پڑھنے لگا۔ رقعہ پڑھ کر سردار مسکرایا اور بولا۔ "ٹھیک ہے میں بھی اپنا جواب دیتا ہوں۔" یہ بول کر سردار نے کاغذ پر لکھا۔

"سردار یکیش قبیلہ کے لئے عرض ہے کہ ہم صورت بھی روشاک کو واپس نہیں کریں گے۔ یہ ہمارا پہلا اور آخری فیصلہ ہے۔ اگر طاقت ہے تو روشاک ہمارے قبیلہ سے لے جاسکتے ہو۔"

اور رقعہ قاصد جن کے حوالے کر دیا۔ قاصد جن نے رقعہ لیا اور واپس اپنے قبیلہ میں آ گیا۔

قاصد نے واپس آ کر جواب سردار کے ہاتھ میں دے دیا۔ سردار نے رقعہ کھول کر پڑھا اور پھر طش ٹپ آ کر کھڑا ہو گیا اور غضب ناک آواز میں بولا۔ "گلا جا۔" سردار پھر اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہوا۔ معزز ساتھیو! گلا جانے میرے رقعہ کے جواب میں صاف لکھا ہے کہ "میں کسی صورت بھی روشاک کو واپس نہیں کر دوں گا، یہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے۔"

سردار کی باتیں سن کر سارے جن آپس میں مشورہ کرنے لگے پھر ایک محرم جن جو کہ قبیلہ کا بہت رسیدہ تھا جسے سردار استاد کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ اٹھا اور بولا۔ "سردار آپ فکر نہ کرو گلا جا کو بھیا تک نتائج پہنچے پڑیں گے۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔" "استاد! آپ قبیلہ میں اعلان کرادیں کہ کل ہمارا گلا جا کی طرف پیش قدمی کریں گے۔ تمام نوجوان جو تیار ہو جائیں اور دو چار اور قبیلہ جو کہ ہمارے خیر خواہ ہوں ان کے پاس بھی پیغام بھجوادیں۔ اور ان کی بھی رہائی

لے لیں اور یہ بھی کہلا دیجئے گا کہ اگر وہ ہماری مدد کرنا چاہیں تو بخوشی ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سردار! استاد جن نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر سارے جن چلے گئے۔ سب کے جانے کے بعد سردار اپنی منگیاں بھینچنے لگا اور بولا۔ "روشاک تم نے اچھا پیغام کیا تم نے جس طرح ذلت و رسوائی سے مجھے دو چار کیا ہے، اس کا خیا زہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ اور گلا جا تم نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس کی سزا بھی تمہیں ضرور ملے گی۔"

تین دوسرے قبیلوں میں جب سردار مناش کا پیغام پہنچا تو اس قبیلے کے سردار بھی سنگار قبیلہ کے سردار گلا جا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، وہ سب کے سب مشتعل ہو گئے اور وہ بھی مناش کی مدد کے لئے تیار ہو گئے۔ سب نے وعدہ کیا کہ ہم کل یکیش قبیلہ میں حاضر ہو جائیں گے، گلا جانے وعدہ خلافی کر کے اچھا نہیں کیا، اسے افہام و تفہیم سے سوچنا چاہئے تھا، گلا جانے اپنی طاقت کے ذم میں جواب دیا۔ ہم احکام خداوندی کے پابند ہیں اور کسی سے جنگ و جدل نہیں چاہئے۔ مگر ان کا فر جنوں کو بے بن سکھانے کا موقع آ گیا ہے۔"

ادھر سنگار قبیلہ میں بھی اعلان ہو چکا تھا کہ یکیش قبیلہ کے جن ضرور جنگ کی خاطر دوڑے چلے آئیں گے۔ لہذا اس قبیلہ میں بھی جنگ کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اور خفیہ طریقے سے انہیں خبر مل گئی تھی کہ کل کا دن بہت اہم ہوگا۔

صبح اندھیرے منہ ہی دونوں طرف کی جنات تو میں ایک بہت بڑے صحرا میں پہنچ گئیں۔ وہ صحرا خاص کر اس مسئلے کے لئے وقف تھا۔ جس تیاری سے سارے جنات آئے تھے۔ اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔

اگر دنیا کے عام انسان دیکھ لیں تو تمہارا کردہ آئیں۔ عجیب عجیب خوفناک شکلیں دیکھنے میں آ رہی تھیں۔ عجیب و غریب ناقابل یقین طرح طرح کے اھیاد۔ اتنے بڑے اور وزنی قسم کے اھیاد کہ کسی انسان سے اٹھانا ناممکن تھا۔ سردار گلا جا کی نظر جب اپنے

مخالفوں پر پڑی تو وہ تشویش میں پڑ گیا۔ کیونکہ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر مخالف سمت کی جنائی تو نہیں تھیں وہ سمجھ گیا کہ سردار مناش نے اپنے ہم خیال اور ہمدردوں سے بھی مدد طلب کر لی ہے مگر اب تو تیر ترش سے نکل چکا تھا۔

اس نے پالیسی کے تحت روشاک کو سب سے آگے کھڑا کیا تھا۔

دونوں طرف فوجیں صف آ رہیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ دونوں طرف کی کارروائی سے ردو کا پوری طرح باخبر تھا۔ اس کے کارندے بل بل کی خبریں ردو کا کے گوش گزار کر رہے تھے۔ ردو کا جان چکا تھا کہ سنگار قبیلہ کا سردار گلا جا کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے۔ لہذا خفیہ طور پر ردو کا نے بھی اپنے مضبوط اور طاقتور کارندوں کو سردار مناش کی مدد کے لئے روانہ کر دیا۔ اور خود بھی عائبانہ طور پر میدان جنگ میں موجود تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھمسان کارن پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے بے شمار اور لاتعداد پیراڑے جیسے لوہے کے انسان ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔

ردو کا کے کارندے بھرپور انداز میں یکیش قبیلہ والوں کی مدد کر رہے تھے۔ عجیب و غریب اھیاد کے علاوہ جنائی طاقتیں اور تو قی بھی استعمال ہو رہی تھیں۔ جس کا جو زور چلا وہ اس سے استعمال کر رہا تھا۔

سنگار قبیلہ کے جن گارمزوں کی طرح کھڑے گئے۔ ردو کا کے کارندے اپنے پسندیدہ جناتوں کی مدافعت کر رہے تھے۔ جو بھی مخالف جن ان کی طرف لپکتا تو ردو کا کے کارندے فوراً درمیان میں آ جاتے اور مخالف جنوں کا وارو کر لیتے اور اس طرح مخالف جن نیست و نابود ہو جاتا۔

سردار مناش ایک جگہ کھڑا اپنی فوجوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ وہ بہت جہاں دیدہ تھا اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی فوجوں کے علاوہ بھی اس جنگ میں ناویدہ ہستیاں ایسی ہیں جو کہ ان کی مدد کر رہی ہیں۔ مگر وہ یہ جاننے سے قاصر تھا

کہ وہ ہمدردنا دیدہ ہستیاں ہیں تو کون ہیں؟

جو دوسرے قبیلہ والے اس کی مدد کو آتے تھے انہیں سردار مناش نے سب سے پیچھے رکھا تھا کہ اگر میرے لوگ پسپا ہونے لگیں تو ہمدردوں کو آگے لایا جائے۔

وقت بڑی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مخالف فوجیں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ عصر تک گلا کی آدمی سے زیادہ فوجیں نیست و نابود ہو کر میدان جنگ میں پڑی تھیں۔

مغرب سے پہلے ایک وقت مقررہ پر جو وقت جتنا توں کی طرف سے مقرر تھا۔ دونوں طرف سے دو معر جوں اپنے ہاتھ میں ایک ایک سفید رنگ کا جھنڈا آفت پر نمودار ہوئے جسے دیکھ کر دونوں طرف کی فوجیں اپنی اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ دونوں جن نیچے ترے اور درمیانی دونوں جھنڈے جو کہا ایک بڑے ڈنڈے میں موجود تھا۔ میدان میں گاروڈیا۔ دونوں جھنڈوں کا زمین پر گڑا تھا کہ دونوں طرف کی فوجیں پیچھے کی طرف ہٹنے لگیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اب جنگ بند ہو چکی تھی۔ سنگار قبیلہ کی فوجوں میں سرا سبکی پھیل چکی تھی بے شمار جنتا اہلاد جو دکھو چکے تھے۔

کیا کاش قبیلہ کے چند جنتا کام آئے تھے۔ ابھی بھی مناش کے ساتھیوں میں بہت زیادہ جوش و خروش دیکھنے میں آ رہا تھا۔ مناش نے اپنے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی اپنے ہمدردوں کا بھی شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ کل دوپہر تک گلا جا، میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ مگر اسے چھوڑنا کسی صورت بھی نہیں۔ اور ہر حال میں ہمیں روٹاک کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔“

تھوڑی دیر میں مغرب کا وقت ہو گیا تو قبیلہ کے تمام جنتا نے نماز مغرب ادا کی اور اس کے بعد کھانا کھا کر آرام کرنے لگے۔

ہارے جنتا بے سدھ پڑے تھے لیکن کچھ جاگ رہے تھے جو کہ آنے والے وقت سے خوف زدہ تھے۔ سوچ رہے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کا دن ان کی زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔ ان کے دماغ میں بار بار آ رہا کہ ہمارے خدی ہٹ دھرم اور بے اصول سردار کی ہمارے کتنے بھائی ہند موت سے ہمکنار ہو گئے دشمنی کی بنا پر سردار کو اپنے لوگوں سے ذرا بھی رغبت نہیں خیر سارے کے سارے مجبور تھے، اپنے قبیلہ سے بے باور کر بھی نہیں سکتے تھے۔

ادھر روٹاک اپنے کمرے میں موجود ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ گھبر سچوں میں دبا پڑا تھا۔ وہ بھی نیچے چاہتا تھا کہ مزید خون خرابہ ہو کیونکہ ایک کی ہٹ دھری وجہ سے اس کے قبیلہ کے بے شمار جوان جنتا موت بھیٹ چڑھ چکے تھے۔ کسی بھی پارٹی، کسی بھی ملک یا کہ بھی قبیلہ کے سردار کا کیا جاتا ہے۔ بس اس کا حکم صلا ہوتا ہے اور بے شمار لوگ قہر اہل بن جاتے ہیں۔

روٹاک بستر پر بیٹھ بیٹھ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں ٹپٹپٹ لگا۔ وہ بار بار اپنا سر نیچے فرش پر چھت کی طرف کرتا۔ کافی دیر تک وہ اسی حالت میں رہا اور پھر اچانک اس نے اپنی دونوں ہتھیاں بچھنے لیں اور پھر دائیں ہاتھ کی مٹھی کو بائیں ہاتھ پر زور سے مارا۔ پھر اپنی گردن نیچے کر کے چند بل کچھ سوچتا رہا پھر اس ایک لمبا سانس کھینچا اور پلک جھپکتے ہی اپنے کمرے سے غائب ہو گیا۔

اپنے کمرے سے روٹاک سیدھا میدان جنگ میں آیا۔ تمام فوجی جنتا اور افسر جنتا و معمر جنتا اپنے خیموں میں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اندھیرے کا تسلط ہر طرف قائم تھا۔ اتفاقاً اندھیری راتیں شروع ہو چکی تھیں۔

روٹاک غائب حالت میں تھا۔ وہ خاموشی سنگار قبیلہ کے خیموں کی طرف بڑھا اور پھر چند خیموں میں جھانکنے کے بعد اپنے مطلوبہ خیمے تک پہنچ گیا۔ خیمہ میں روٹاک بے سدھ پڑا تھا۔

خیمہ میں ایک طرف کھڑے ہو کر روٹاک نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑھا اور اپنی دائیں ہاتھ کی پھٹی پر پھونک ماری تو اچانک پھٹی روشن ہو گئی اس کے بعد روٹاک نے اپنی پھٹی کا رخ روٹاک کی طرف کر دیا۔ پھٹی سے سبز رنگ کی شعاعیں خارج ہونے لگیں اور پھر ان شعاعوں نے چاروں طرف سے روٹاک کا احاطہ کر لیا۔ پھر وہ شعاعیں آہستہ آہستہ سنبھل گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام شعاعیں ایک بالکل چھوٹے گیند میں بدل گئیں۔ ان گیند نما شعاعوں میں روٹاک کا وجود بھی مٹ کر رہ گیا تھا۔

روٹاک نیچے جھکا اور خاموشی سے اس گیند نما شعاع کو اپنے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ روٹاک مسکراتے لگا اور پھر جس خاموشی سے غائبانہ طور پر آتا تھا اسی خاموشی سے اس خیمہ سے نکل گیا۔ اس کے بعد وہ سیدھا سردار مناش کے خیمے میں آیا۔ سردار اتنی رات گئے ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ اپنا سر اپنے ہاتھ میں لئے خاموشی سے بیٹھا تھا۔

اچانک روٹاک کی آواز سنائی دی۔ ”سردار!“

سردار نے چونک کر اوپر دیکھا تو دنگ رہ گیا کیونکہ اس کے سامنے روٹاک مجسم کھڑا تھا۔ فوراً سردار کے منہ سے نکلا۔ ”محترم روٹاک آپ اور اس وقت۔“

”ہاں سردار! میرے دل نے گوارہ نہ کیا کہ ایک جنتا سردار کی ہٹ دھری کی وجہ سے بے شمار جنتا موت سے ہمکنار ہو گئے اور نہ جانے کل اور کتنے اپنی زندگی ہار جائیں گے۔ تو میں نے سوچا کیوں نہ جھگڑنے کی اصل بڑ کوئی اکھاڑ پیچھا نہ جائے۔ میں روٹاک کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ آپ فوراً اس وقت میرے ساتھ چلیں اپنے قبیلہ میں۔“

”لیکن محترم روٹاک! یہ تو بتائیں کہ روٹاک ہے کہاں؟“ سردار بولا۔

”سردار! یہ پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔ آپ فوراً چلیں۔“ روٹاک بولا۔

”کھولیں۔“

سردار فوراً ایک طرف بڑھ گیا اور ایک کمرے کے دروازے پر رک کر کمرے کی کڑی کھول دی۔ روٹاک کمرے میں داخل ہوا اور پھر سامنے پڑے بستر پر روٹاک نے اپنے ہاتھ میں موجود روشنی نما گیند رکھ دی۔ اس کے بعد روٹاک نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو روشنی نما گیند بڑی ہونے لگی اور پھر ایک شخص کا وجود دکھار لیا۔ پھر روٹاک کے اشارے پر تمام شعاعیں یکسر غائب ہو گئیں۔ جنہوں نے کہ روٹاک کا احاطہ کر رکھا تھا۔ روٹاک نے بستر کی جانب اشارہ کیا۔

سردار! اچنبھے کی حالت میں بستر پر موجود روٹاک کو دیکھ رہا تھا۔

”سردار! یہ اپنے حواس میں نہیں۔ یہ رات بھر بے سدھ رہے گا۔ اس کے دروازے پر نورانی حصار قائم کر دیں۔ اور پھر میدان جنگ میں چلے جائیں۔ علی الصبح اعلان کر دیں کہ جنگ بندی کی جانی ہے کیونکہ جس مقصد کے لئے یہ جنگ مسلط ہو گئی تھی اس مقصد کو ہم نے پایا ہے۔ لہذا اب میں نہیں چاہتا کہ مزید خون خرابہ ہو۔ اگر شروع میں ہی گلا جا میری بات مان لیتا تو اتنے جنتا اپنی زندگی نہ ہار جاتے۔ جتنے بھی جنتا موت سے ہمکنار ہوئے ہیں نیچے ان سے ہمدردی ہے۔ گلا جا کے لئے میرا مشورہ ہے کہ اپنے قبیلہ میں واپس چلا جائے۔“

”جی محترم روٹاک! ایسا ہی ہوگا صبح کا اجالا پھیلنے ہی میں جنگ بندی کا اعلان کر دوں گا۔ آپ شریف رکھیں۔“ سردار بولا۔

”نہیں سردار! میں اس وقت بیٹھ نہیں سکتا۔ اور آپ بھی فوراً اپنے خیمہ میں پہنچیں کیونکہ اگر کسی نے آپ کو خیمہ میں نہ پایا تو وہ قتلش میں مبتلا ہو جائے گا۔ آپ جب بھی اپنی کارروائی شروع کریں مجھے اطلاع کرو دیجئے گا۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

”محترم روٹاک! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری وجہ سے تکلیف اٹھائی، میں تاحیات آپ کا احسان نامتا رہوں گا، اور مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی

وٹا فوٹا جھ سے ملنے رہیں گے۔

”ٹھیک ہے سردار! آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔ آپ آئندہ بھی مجھے اپنا ہمدرد پائیں گے۔ اب میں چل رہا ہوں۔ پھر ہماری ملاقات ہوگی۔“ اور یہ بول کر رولوکا اس جگہ سے غائب ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سردار بھی اپنے کمرے سے نکل کر میدان میں موجود اپنے خیمے میں آ گیا اور ستر پر لیٹ گیا۔ ابھی نماز فجر میں وقت تھا۔ نماز فجر کے بعد سردار مناش نے اپنی گونجدار بھاری آواز میں اعلان کیا۔ ”گلا جا! میں اپنی طرف سے جنگ بندی کا اعلان کرتا ہوں۔ تمہارے قبیلے کے تمام جن سن لیں کہ ہماری طرف سے پیش قدمی نہیں ہوگی۔ گلا جا! مجھے بہت ہی دلی طور پر دکھ اور افسوس ہے کہ تمہاری ضد کی وجہ سے تمہارے قبیلے کے بے شمار جن اپنی زندگی ہار گئے۔ میرا قطعی ارادہ جنگ کا نہیں تھا۔ مگر افسوس کہ تم جذبات کے روم میں بہہ کر اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں دھکیلا۔

میرا اصل مقصد روشاک کی واپسی تھی۔ روشاک مجھ تک پہنچ چکا ہے۔ لہذا میں بخوشی جنگ بند کرتا ہوں۔ تم بھی خاموشی سے واپس اپنے قبیلے میں چلے جاؤ اور آئندہ بھی کوشش کرنا کہ تمہیں اپنا تمہارے قبیلے کے افراد کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ بہت سے مواقع پر جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینا پڑتا ہے اور جو لوگ جذبات میں فیصلے نہیں کرتے وہ فائدہ میں رہتے ہیں۔“

اس اعلان کا سننا تھا کہ گلا جا کے جنوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مگر گلا جا پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑی وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ روشاک کو رات کے اندھیرے میں اغوا کر لیا جائے گا۔ یہ اس کی بہادری اور بہت دھڑی پر کاری ضرب تھا۔ وہ نادیم ہو کر تمللانے لگا۔ اس کا چہرہ یکدم مرجھا کر رہ گیا۔ اسے شرمندگی کھائے جا رہی تھی کہ اس کے قبیلے والے اس کے متعلق کیا سوچیں گے۔

وہ اپنے بے شمار ساتھیوں کو موت سے ہمکنار کرنے کے بعد بھی شکست سے دوچار ہو چکا تھا۔ ”میں اپنے ساتھیوں کی موت کا ذمہ دار ہوں اور

اب میرا زندہ رہنا بھی بے کار ہے۔ میں پل پل جینے اور مرنے سے دوچار ہوتا رہوں گا۔ مناش تم جیت گئے اور میں ہار گیا۔

میں اب سرداری کے قابل نہیں۔ میرے قبیلے والے اپنی پسند سے جسے چاہیں اپنا سردار منتخب کر لیں۔ آج میں اپنی سرداری سے دست بردار ہوتا ہوں۔“ اور یہ بولتے ہی گلا جا کے پورے جسم میں آگ بھڑک اٹھی اور چند لمحوں میں ہی اس کا وجود مل کر راکھ ہو گیا۔

گلا جا کے ساتھیوں نے جب اپنے سردار کا انجام دیکھا تو افسردہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ ”میرے کا انجام ہمیشہ برابری ہوتا ہے۔ کاش! یہ سردار! شروع میں دانشمندانہ قدم اٹھاتا تو آج اس انجام کو نہ پہنچتا اور نہ ہی قبیلے کے بے شمار جن موت کے منہ میں جاتے۔“ خیر چند بزرگ اور محترم جنات آگے بڑھے اور اپنے لوگوں کو لے کر نڈھال طریقے سے اپنے قبیلے کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک طرح سے سارے جنات خوش بھی تھے کہ چلو! ہٹ دھرم اور ضدی سردار سے جان تو چھٹی۔ اس کے بعد کیکاش قبیلے والے اپنے سردار کی سربراہی میں واپس اپنے قبیلے میں آ گئے۔ ان کی جیت ہوئی تھی سارے جنات بہت خوش تھے۔

ادھر رولوکا کے پاس پل پل کی ساری خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس کے پاس اچانک ایک کارندہ ٹکلت میں آیا اور خبر دی کہ گلا جا کا بیٹا وادی سے کالی دور کی قبیلوں میں گیا ہے اور ان کو اپنی مدد کے لئے راضی کر رہا ہے، اس کا کہنا ہے کہ کیکاش قبیلے والوں نے ناحق اس کے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ وہ بہت بے بس اور مجبور ہے۔

اس کا قبیلہ اتنا طاقتور نہیں کہ کیکاش قبیلے سے بدلہ لے سکے۔ چونکہ وہ بے دین قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے ہم مذہب قبیلے والوں کے پاس گیا ہے اور سارے قبیلے والوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کل آدھی رات کے بعد اچانک کیکاش قبیلہ پر حملہ کر دیا جائے کیونکہ قبیلے والے جیت کی خوشی میں نیند میں سے سدھ بڑے ہوں گے۔ چونکہ غیر مذہب یعنی کافر جنات ویسے ہی

مسلمان جنات سے نفرت کرتے تھے لہذا انہوں نے اس موقع کو نیشہ جانا اور فیصلہ کر لیا کہ ہر حال میں کیکاش قبیلہ پر حملہ کیا جائے گا۔

رولوکا نے اپنے کارندے کو کہا۔ ”تم اب واپس جاؤ اور خبریں مجھ تک پہنچاتے رہنا۔“ اس کے بعد رولوکا فوراً سردار مناش کے پاس پہنچا اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ جسے سن کر سردار مناش بہت گھبرایا اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

سردار کی گھبراہٹ دیکھ کر رولوکا بولا۔ ”سردار آپ گھبراہٹیں نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کو چوکس کر دیں اور دشمنوں کو قبیلے سے کالی دور روکنا پڑے گا۔ مگر یہ بات خاموشی سے ہو۔ زیادہ شور شراب نہ ہونے پائے کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

کل آدھی رات سے پہلے ہی آپ مطلوبہ جگہ پر پہنچ جائیں میں بھی وہاں وقت مقررہ پر پہنچ جاؤں گا۔ گلا جا کے بیٹے نے اس بات کو اپنے قبیلے والوں سے بھی چھپایا ہے، اس بنا پر کہ کہیں قبیلہ کا کوئی جن بدحواسی کے عالم میں اس راز کو فاش نہ کر دے۔ اس کے اپنے قبیلہ کا ایک بھی جن اس حملہ میں حصہ نہیں لے گا۔

کم بخت مردانا بھی چاہ رہا ہے کہ دوسرے قبیلے والے مریں۔ اور یہ اس لئے ہوا ہے چونکہ کافر جنات آپ لوگوں سے نفرت کرتے ہیں اس لئے جذبات میں آپ لوگوں پر دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ خیر آپ لوگ بالکل بھی نہ گھبراہٹیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جیت آپ لوگوں کی ہی ہوگی۔

اور اپنے باپ کے انجام کو اس کا بیٹا بھی پہنچ جائے گا۔ خیر اب میں چلتا ہوں، آپ فکر بالکل بھی نہ کیجئے گا۔“ رولوکا نے کہا اور غائب ہو کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

دوسری رات آئی اور آدھی رات سے پہلے ہی رولوکا اس وادی میں پہنچ گیا جس طرف سے وہ کافر جنات حملہ کرنے والے تھے یعنی وہ واحد راستہ تھا جس

طرف سے انہوں نے آنا تھا۔

رولوکا نے اپنے سارے کارندوں کو چوکس کر دیا تھا۔ جاگتا اور بڑی ہوشیاری اور مستعدی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ رولوکا ایک جگہ کھڑا منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ کالی دیر بعد اس نے سامنے پھٹک ماری تو بے تحاشہ بجلیاں کوندنے لگیں۔ زمین سے لے کر آسمان کی وسعتوں تک بجلیاں کوند رہی تھیں۔ چند لمحے بعد بجلیوں کا کوندنا ختم ہو گیا اور پھر گھپ اندھیرا چاروں سمت مسلط تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ سردار اپنے ساتھیوں سمیت اس جگہ پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر رولوکا آگے بڑھا اور سردار سے بولا۔ ”سردار اپنے ساتھیوں سے یو لیں کہ درمیان سے ہٹ جائیں اور کنارے کھڑے ہو جائیں۔ اپنے درجو کو غائب ہی رکھیں تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ آپ لوگ یہاں موجود ہیں۔

سردار آپ لوگوں نے کچھ کرنا نہیں ہے صرف میرے اشارے کے منتظر رہنا ہے، صرف میزے اشارے پر آپ نے انتہائی قدم اٹھانا ہے۔ جب تک میں کوئی اشارہ نہ کروں آپ اپنے لوگوں سے بول دیں کہ ہر حال میں روپوش رہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے اپنی اپنی جگہ سے بلنا نہیں ہے۔

رولوکا کی بات سن کر سردار نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں بات کی اور انہیں لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ رولوکا بھی سردار کے قریب ہی موجود تھا۔

وہاں پر کھڑے تمام جنات پر ایک ایک پل صدیوں کے مترادف گزرنے لگا۔ سارے جنات دم ساوھے عاتبانہ طور پر کھڑے تھے۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے کہ اچانک کئی الودہاں سے بہت گریہ اور خوفناک آواز میں چیختے ہوئے گزر گئے۔ الودوں کی آوازوں کو سن کر جیسے سارے ہم گئے۔

سردار کی نظریں متواتر رولوکا پر مرکوز تھیں کہ نہ جانے رولوکا کب کیا اشارہ کر دے۔ کیونکہ رولوکا کے اشارے پر ہی سارے جناتوں نے قدم اٹھانا تھا۔

ہر سو گھنٹا ٹوپ اندھیرے کی چادر اوڑھے بڑی مہیب اور ساری وادی اندھیرے کی چادر اوڑھے بڑی مہیب اور ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔ اگر اس وقت انسانوں کا بھی جم غفیر ہوتا تو خوف اور ڈر کی وجہ سے ان کا پتا پانی ہو جاتا۔ اور جب یہ معلوم ہو کہ ان کے مد مقابل ان کا دشمن بہت قوی طاقتور اور خوفناک والا ہے تو ایسی صورت میں واقعی انسان کا ہارٹ ایک یا پھر اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے، مگر وہاں تو جنت موجود لیکن وہ بھی اپنے دشمن سے اندرونی طور پر خوفزدہ ضرور تھے کہ نہ جانے دشمن کتنا قوی اور طاقتور ہے، اور پھر نہ جانے اچانک کس طرف سے حملہ کر دے۔ کیونکہ حملہ آور دشمن اپنی تمام تر تیار یوں کے ساتھ دھندلتا ہوا بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے۔ رات کے ڈھائی بجے اچانک شمال کی جانب سے ایسا لگا کہ جیسے طوفان آگے کو بڑھ رہا ہے۔ فضا میں گوں..... گوں..... گوں..... کی آوازیں متواتر سنائی دے رہی تھیں۔

ہوا کے دوش پر آتی ہوئی آوازوں کو سن کر سردار نے خوفزدہ انداز سے ردولوکا کی طرف دیکھا اور آنکھوں کے اشارے سے ردولوکا سے پوچھنے لگا کہ کیا کرتا ہے۔ ردولوکا خاموش تھا اس نے سیدھے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر ہونٹوں پر رکھ کر اشارہ کیا کہ بالکل خاموش رہیں۔ کسی بھی حرکت سے گریز کریں۔ ہماری کوئی بھی حرکت دشمن کو چھین کر سکتی ہے۔

سردار نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں بھی اشارہ کیا کہ بالکل خاموش رہو۔

پل پل گزرتے ہوا کے دوش پر پرداز کرتی آوازیں متواتر قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی رات کی تنہائی میں کسی ناویدہ قوت یا پھر انسانوں کا جم غفیر کارواں کسی سمت رواں دواں ہوتا ہے تو ہوا کے دوش پر اس کے آگے بڑھنے یا دوڑنے یا پھر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں یا

پھر گاڑیوں کے گزرنے سے بھی آوازیں دور بہت دور سنائی دیتی ہیں۔

سارے جنت اپنی اپنی جگہ دم سا دھم کھڑے تھے ایک ایک پل ایک ایک لمحہ عجیب جان لیوا گزر رہا تھا۔ جوں جوں آوازیں قریب آ رہی تھیں وہاں پر کھڑے سب عجیب طرح کا اندرونی طور پر ایک انتخاب خوف انہیں اپنے شکلیں میں کس رہا تھا۔

اچانک ردولوکا کے سامنے روشنی کا ایک چھوٹا سا نقطہ نمودار ہوا، اور پھر چشم زدن میں روشنی کا وہ نقطہ غائب ہو گیا۔ اس نقطے کو سردار مناش نے بھی واضح طور پر دیکھا، اس کے بعد سردار، ردولوکا کی جانب آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگا۔

ردولوکا نے اس مرتبہ بھی اپنی انگلی کا اشارہ کیا۔ اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور پھر ایک گول سادارہ بنایا اور پھر اس دائرہ کے اندر اپنی انگلی کا اشارہ کر دیا جس کا معنی یہ تھا کہ ”دشمن سر پرچہ خنجرے والا ہے مگر دشمن شکلیں میں جکڑ جائے گا اور فرار کی صورت میں آسمان کی دستوں کی طرف پرداز کرے گا مگر اس وقت اس کے بھاگنے کے سارے راستے ختم ہو چکے ہوں گے۔“

ایک پل دو پل..... اور پھر پل پل گزرنے لگے..... گوں..... گوں..... کی آوازیں بالکل قریب آ گئیں۔ جلدی سے ردولوکا نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بند کی اور سردار کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ ”بالکل خاموش رہنا ہے ہر حال میں، ہماری ذرا سی بھی حرکت دشمن کو باخبر کر دے گی۔“

ردولوکا کے ہی انداز میں سردار نے اپنے ساتھیوں کی طرف بند مٹھی کر کے اشارہ کر دیا اور پھر سارے جنت بالکل چوکس ہو کر کھڑے ہو گئے کہ اتنے میں۔

اچانک پوری وادی میں ایک کان بھاڑ دینے والا زوردار دھماکہ سنائی دیا۔ ایسا لگا تھا کہ کسی انیم بم زمین پر پھینک دیئے گئے ہوں۔

آمدنی اور طوفان کی طرح آگے بڑھتے ہوئے سارے جنت کسی آہنی اور اندھکی دیوار سے ٹکرائے

تھے۔ اس جگہ پر زبردست طریقے سے بجلیاں کوندنے لگی تھیں۔ اس وقت دل دہلا دینے والا ناقابل بیان حد تک خوفناک منظر رونما ہو چکا تھا۔ جب نیچے سے بجلیاں اوپر کو اٹھتی تو اوپر سے بھڑکتے ہوئے شعلے ان پر آن گرتے۔ پوری وادی میں ایک حد متعین ہو گئی تھی۔ پورے علاقے میں بھڑکتے ہوئے شعلے اور کڑکٹی ہوئی بجلیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔

اس جگہ جتنے بھی جن موجود تھے سب کے سب دہشت زدہ تھے، انہیں یہ دھڑک لگ چکا تھا کہ کہیں بھڑکتے ہوئے شعلے اور کڑکٹی بجلیاں ان کی طرف نہ بڑھ جائیں۔

ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ بار بار زبردست قسم کے وجود آتے اور اس آہنی دیوار جو کہ عاتبانہ طور پر موجود تھی اس سے دھڑام دھڑام طریقے سے ٹکراتے تھے ان دھکی دیوار سے ان وجود کا ٹکرانے کا مقصد تھا کہ جو، ان دھکی دیوار ان کے راستے میں حائل ہے وہ کسی طور بھی پاش پاش ہو جائے مگر ان کا تمام حربہ ناکام ہو رہا تھا اس صورت میں ان کے وجود میں آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

پھر ایک اور ناقابل یقین منظر رونما ہوا۔ اچانک ایک بہت بڑا شعلوں کا بھڑکتا ہوا گولہ ان کے درمیان میں گرا۔ آگ کے گولہ کا گرنا تھا کہ ناویدہ قوتوں کی تیج و پکار کان بھاڑنے لگیں۔ وہ تمام دل دہلا تے مناظر انسانی دل و دماغ کے برداشت سے باہر تھے۔ اگر واقعی اس جگہ انسان ہوتے تو یقیناً وہ اب تک سارے اپنی زندگی سے بالوں ہو چکے ہوتے۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک آگ اور بجلیوں کا دلخراش منظر رونما ہوتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ منظر غائب ہونے لگا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ بھڑکتے شعلے اور کڑکٹی بجلیاں ختم ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد جب ردولوکا مطمئن ہو گیا تو اس نے اپنی انگلی کو اوپر آسمان کی جانب اشارہ کیا تو اس کی انگلی سے ایک باریک دو دھیرا رنگ کی روشنی کی ٹیکر نکل کر آسمان کی طرف کافی اونچائی تک گئی اور پھر وہ روشنی ایک

جگہ ٹھہر کر دوبارہ گول دائرہ میں تبدیل ہو کر واپس زمین کی طرف پلٹی اور اس جگہ پکڑنے لگی جہاں کہ تھوڑی دیر پہلے بھڑکتے ہوئے شعلے اور بجلیاں کوند رہی تھیں۔ تمام جگہوں پر پردہ روشنی کا دائرہ چمکراتا رہا پھر اس کے بعد وہ دائرہ زمین میں پیوست ہو گیا۔ تو ردولوکا نے پھر اپنے ہاتھ کا اشارہ کیا تو پورے علاقے میں سفید دو دھیرا روشنی پھیل گئی۔

دیکھنے والوں کی آنکھیں پتھر کر رہ گئیں کیونکہ اس جگہ پر بے شمار اور لاتعداد جنتی وجود چلے ہوئے پڑے تھے۔ وہ سب کے سب جل کر کوئلہ کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

ردولوکا آگے بڑھا اور سردار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تم بخت سارے کے سارے جل کر کوئلہ ہو گئے۔ سردار! آپ کے یہ دشمن ہیں جو آپ کے قبیلہ پر حملہ آور ہونے کے لئے آئے تھے، اگر میں انہیں اس طرح نہ روکتا تو یہ سب آپ کے قبیلہ کو نیست و نابود کر دیتے۔“

سردار صاحب! اب آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے قبیلہ میں چلے جائیں، آپ کے سارے دشمن اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں اور آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ آپ کے دشمن گلا جا کا بیٹا بھی جل کر خاستر ہو چکا ہے۔

قبیلہ والوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے سردار کا بیٹا بھی اپنے آخری انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اب قبیلہ والے اپنا نیا سردار چن لیں گے اور مجھے یقین ہے کہ ان کا نیا سردار سوچہ بوجھ اور باشعور ہوگا۔ کیونکہ ان لوگوں کو اپنے ضدی اور بے دھرم سردار کا انجام معلوم ہے جس نے لاتعداد جنوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

سردار! اب میں چلتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں، پھر ملاقات ہوگی اور ایک بات یاد رکھئے گا کہ ان معاملات کے متعلق اپنے قبیلہ والوں کے درمیان میرا پرچار مت کیجئے گا۔ بس آپ کو تمام حقیقت کا علم ہے یہی بہت ہے۔“ ردولوکا بولا۔

سردار مناش ردولوکا کی بات سن کر بولا۔ ”محترم

رہا! میں آپ کا یہ احسان تاحیات نہیں اتار سکتا، میں کس منہ سے آپ کا شکر یہ ادا کروں، میں تو میں بلکہ میری آنے والی تکلیفیں بھی آپ کے احسان تلے دبی رہیں گی، اس کا اجر تو آپ کو خدا ہی دے گا۔

ہاں! ایک بات یاد آئی کل جمعہ کا دن ہے میں آپ کے پاس بعد نماز جمعہ پیغام بھیجوں گا۔ آپ برائے مہربانی ضرور تشریف لے آئیے گا۔ کیونکہ بعد نماز جمعہ روشاک کا معاملہ سامنے لایا جائے گا۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی مصروفیات سے تھوڑا وقت ضرور نکال کر قبیلہ میں تشریف لائیں گے۔

”ٹھیک ہے سردار صاحب میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرور آؤں گا۔“ رولوکا بولا اور غائب ہو کر پلک جھپکتے ہی اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

ادھر سردار مناش نے روشاک کو اس کے کمرے میں بے سدھ کر کے قید کر دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر یہ ہوش دھوساں میں رہا تو یقیناً دوبارہ فرار کی کوشش کرے گا یا پھر بھروسہ کرے کہ کوئی اور حرکت کر بیٹھے۔

جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد معمول کے مطابق درس کے لئے محفل منعقد ہوئی۔ قبیلہ کے تمام جنات نے شرکت کی اور پھر سردار نے درس دینا شروع کیا۔ درس کے بعد روشاک کو لا کر کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اب وہ ہوش و حواس میں تھا۔ ندامت سے سر جھکا ہوا تھا۔ کٹہرے کے گرد آٹھ جنات کھڑے تھے۔ دیے بھی سردار نے کٹہرے کے گرد حصار قائم کر دیا تھا تاکہ روشاک اپنی کسی جتنائی قوت کے بل بوتے پر فرار نہ ہو جائے۔

سردار نے بہت مضبوط اور خفیہ حصار قائم کیا تھا کیونکہ سردار کو معلوم تھا کہ روشاک کتنی خفیہ طاقت کا مالک ہے۔ سردار نے آج اس کے فرار کے سارے راستے بند کر دیے تھے۔

روشاک کو یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ وہ جن، کافر جنوں کے قبیلہ میں جا کر پناہ لی تھی اور پھر کافر جنوں کے

ساتھ وہ میدان میں آیا تھا اور اپنے ہی قبیلہ کے خلاف حملہ آور ہوا تھا۔

اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کافر جنوں کا سردار سنگارا اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ یعنی وہ موت سے ہمکنار ہو چکا ہے اور پھر میدان جنگ سے کسی نہ کسی طرح اسے اغوا کرنے سے پہلے بے سدھ کیا گیا پھر اسے اٹھا کر یہاں لایا گیا۔

سردار کے پیغام ملنے پر حسب وعدہ رولوکا محفل میں آچکا تھا۔ آج وہ جسم سردار کے برابر ایک بڑی کرسی پر براجمان تھا۔ قبیلہ کے سارے جنات بڑی قدر کی نگاہ سے رولوکا کو دیکھ رہے تھے اور جو جن بھی اس کے قریب سے گزرتا تو قطعاً جھک کر سلام کرتا۔

کبھی کبھی روشاک اچانک تہہ بوسائی نظروں سے رولوکا کو دیکھ لیتا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ رولوکا کو کچا ہی چبا جاتا۔

جب سارے جنات آکر محفل میں بیٹھ گئے تو سردار کھڑا ہوا۔ سردار کی عیسیٰ اور گوہدار آواز سنائی دی۔

”روشاک تم پر الزام ہے کہ تم نے ایک آدم زادی کی عزت کو پامال کیا اور ایک طویل عرصہ سے اس کے گھر والوں کو بھی ہراساں کیا جبکہ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے قبیلے کا کیا اصول ہے اور پھر ہم سارے جنات شریعت کے پابند مسلمان ہیں۔ تم نے قبیلہ کا قانون توڑا۔ احکام خداوندی سے منہ موڑا، یہی نہیں بلکہ تم نے اپنے والدین کے بھروسے کو روند ڈالا۔

قبیلہ سے فرار ہونے کا تم نے جو قدم اٹھایا وہ ناقابل معافی ہے اور سب سے بڑھ کر غلطی تم نے یہ کی کہ تم نے کافر جنات کے قبیلہ میں پناہ لی اور یہ اسرار احکام خداوندی کے خلاف ہے کہ ایک مسلمان، کافر کو اپنا سپہارا اور محافظ بنالے۔

فرار ہونے کے بعد جن اذیت ناک اور جان لیوا مراحل سے پورا قبیلہ گزرا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے ایک عورت کے لئے تم نے اپنے قبیلہ اپنے والدین اور خدا کو ناراض کیا۔ تمہارے اقدام سے خونی جنگ شروع

ہوئی جس میں قبیلہ کے کئی جن اپنی زندگی سے گئے۔ جبکہ تمہیں اچھی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات پر انسان کو برتر بنایا ہے۔ یعنی انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود تم نے اشرف مخلوق کی عزت کی دھجیاں بکھیر دیں، تم جذبات میں اندھے ہو چکے تھے جس کی وجہ سے ناقابل یقین اور ناقابل برداشت مراحل سے سب کو گزرتا پڑا۔

اب اگر تم اپنی صفائی میں کچھ نہا جاتے ہو تو بلا جھجک کہہ سکتے ہو، مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہر حال اگر تم چاہو تو بول سکتے ہو۔“

سردار نے کہا۔

سردار کی باتیں سن کر روشاک نے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور ایک اچھٹی سی نظر پوری محفل پر ڈال کر گویا ہوا۔

”سردار! میں بلاؤر خوف یہ قرار کرتا ہوں کہ میں نے آدم زادی سے محبت کی۔ اسے چاہا بلکہ اتنا چاہا کہ میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرے لئے وہ آدم زادی بہت عزیز ہے، اور اس کے آگے میرے لئے تمام اصول، تمام پابندی اور تمام قانون کی کوئی حیثیت نہیں۔

روشاک یہاں تک ہی بول سکا تھا کہ اچانک سردار مناش غضبناک طریقے سے اچھی کرسی بے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دل دہلا دینے والی عیسیٰ آواز پوری محفل میں گونج گئی۔

”بد بخت خاموش ہو جا! تو جذبات کی رو میں بہہ کر سو جھو بوجھ اور شعور سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ تو دین اور دنیا دونوں کے لئے بوجھ بن گیا ہے، تو منافقوں اور کافروں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ احکام شریعت سے انکار پر میں تجھ جیسے بے شمار اولادوں کو بھی قربان کر سکتا ہوں۔ احکام خداوندی سے انحراف کسی صورت بھی ناقابل معافی ہے۔“

اور پھر جس کٹہرے میں روشاک کھڑا تھا اچانک زبردست بجلی کوئی شعلہ جھڑک اور روشاک کے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

نارنجی رنگ کا شعلہ اتنا زبردست تھا کہ روشاک کو

چپچپے کا موقع تک نہ مل سکا اور پلک جھپکتے ہی روشاک جل کر کوئلہ میں تبدیل ہو گیا۔ اب کٹہرے میں روشاک کی جگہ سیاہ رنگ کی تھوڑی سی راکھ پڑی تھی۔

پھر سردار کی آواز سنائی دی۔

”محافظو! کٹہرے میں موجود رکھ کو فوراً اٹھاؤ اور لے جا کر سمندر برد کر دو۔“

سردار کی آواز سننا تھا کہ تین محافظ فوراً کٹہرے کی جانب لپکے اور کٹہرے میں موجود رکھ کو ایک کپڑے میں رکھ کر پوٹی باندھی اور ایک طرف کو پرواز کر گئے۔

اب سردار کی حالت نارمل ہو گئی تھی۔ چہرے پر سے جلال ختم ہو گیا تھا مگر اب چہرے پر ملال نظر آ رہا تھا۔ دیے بھی چہرے پر ملال کیوں نہ نظر آتا۔ جو اس سال بیٹا موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ یہ تو فطری عمل ہے۔ اولاد کی موت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ والدین کے لئے۔ سردار اب کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ پوری محفل پر ایک طرح کا جیسے سکستہ طاری ہو چکا تھا۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔

رولوکا بھی اپنی کرسی پر خاموش گردن جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

اتنے میں سردار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان کی طرف اپنی شہادت کی انگلی اٹھائی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”اللہ پاک گواہ رہتا میں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، میری نظر میں یہی بہتر تھا۔ روشاک نے جذبات کے رو میں بہہ کر قانون شریعت سے منہ موڑا۔ اللہ تعالیٰ تو نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس کو اس نے اذیت دی اور اس کی عزت پامال کی، سب سے بڑا جرم کہ فرار ہو کر کافر جنات کے قبیلے میں پناہ لی، دشمن کو ہمارے مقابلے پر اکسایا، ہزار ہا سال کے قبیلے کے قانون کو زرا تیرا آن اور احادیث کی رد گردانی کی، مزید آگے شر پھیلاتا کہ اس کا نیست و نابود ہو جانا ہی بہتر ہوا۔

میرا دل مطمئن ہے کہ ایسی نافرمان اولاد سے بے اولاد رہنا ہی بہتر ہے۔ اس نے اپنے قبیلے کی نہیں بلکہ انسان کی بھی تذلیل کی اور قرآن میں بھی یہی لکھا

ہے کہ عزت پامال کرنے والے کو سخت سزا دی جائے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔ اللہ پاک اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو میں تیرے آگے سجدہ ریز ہو کر معافی کا خواستگار ہوں۔ میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو درگزر کر دینا۔“ اور سردار غدا حال طریقے سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔

اتنے میں رولوکا اپنی کرسی سے اٹھا اور سردار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”سردار! آپ بہت عظیم ہیں، اوپر والے مالک کے بنائے ہوئے قانون کی پاسداری کرنے والے اچھا اجر پاتے ہیں۔ روشاک کو مارنا یا مروانے کی میری اپنی مرضی نہیں تھی۔ اگر میرا منشا اسے ختم کرنا ہوتا تو میں بہت پہلے اسے زندگی سے دور کر دیتا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ خدائی ہی نہیں بلکہ بہت خود سر اور دین سے متفرق بھی ہو گیا تھا۔

اگر وہ اپنی غلطی پر پشیمان ہو جاتا تو میں خود بھی آپ سے بولتا کہ اسے ایسی سزا دیں کہ اسے تاحیات احساس رہے، اس سزا سے عبرت پکڑے اور آئندہ کبھی اپنی ہزار ہا سالہ زندگی میں احکام خداوندی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے مگر افسوس کہ.....“ اور رولوکا نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ سردار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

”محترم و معزز رولوکا! ہم آپ کی رحم دلی کے قائل ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ آپ روحانی طاقتوں پر کس قدر محترم رکھتے ہیں۔ مگر مجھے قطعی دکھ اور افسوس نہیں کیونکہ مجھے اولاد سے زیادہ اپنے پیدا کرنے والے کی خوشنودی چاہئے۔

محترم رولوکا! میں تاحیات قلبی طور پر آپ کا احسان انثار ہوں گا۔ کیونکہ آپ نے ہمارے قبیلہ کی مدد کی اور ہمیں ذلیل و رسوا بلکہ شکست فاش سے بچایا۔ ساتھ ہی روشاک کی شرارتگریوں اور گناہوں کو سامنے لا کر مجھے بچایا۔ نہیں تو پہلے یہیں روشاک کتنے عرصہ تک آدم زادی اور اس کے گھر والوں کو اذیت ناک حالات سے دوچار رکھتا۔ میری اور میرے قبیلہ والوں کی آپ سے التجا

ہے کہ آپ آئندہ بھی ہم سے ملاقات کرتے رہیں گے۔ میں اپنی ذات اور اپنے پورے قبیلہ والوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ ہمیں خدمت کا موقع دیں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔“ سردار نے التجائیہ انداز میں کہا۔

رولوکا بولا۔ ”سردار! میں خود بھی آپ کی قدر کرتا ہوں اور زندگی بھر آپ کو یاد رکھوں گا، آپ جیسے بہت کم ایسے ہیں جو حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں، میری نظر میں آپ بہت عظیم ہیں، اب میں اجازت چاہوں گا کیونکہ ایک اور ضروری کام نمٹانا ہے اور جیسے ہی موقع ملتا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ویسے آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔ آپ سے زیادہ دوری پر نہیں ہوں، میں آپ کے تمام قبیلہ والوں کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری جب بھی ضرورت پڑے آپ بلا جھجک مجھے یاد کر سکتے ہیں۔“ رولوکا نے سردار سے مصافحہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر قبیلہ کے تمام جنات کو الوداع کہا اور پلک جھپکتے ہی اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔

رولوکا وہاں سے نکل کر حکیم دقار کے مطب نہیں گیا بلکہ وہ سیدھا خوشبو کے گھر آ گیا۔ خوشبو کے گھر سے تھوڑی دور آ کر ایک بارغ میں نمودار ہوا۔ اس وقت کوئی بارغ میں موجود نہیں تھا۔ بارغ سے چلتا ہوا رولوکا خوشبو کے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

چند منٹ بعد ہی رولوکا خوشبو کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر ایک سات آٹھ سالہ بچہ اپنی مستیوں میں مست تھا۔ رولوکا بولا۔ ”بیٹا! آپ اندر جا کر ذرا دیکھیں۔ خوشبو کے والد عتیق صاحب گھر میں موجود ہیں۔ انہیں بتائیے کہ حکیم کامل آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

بچہ نے کہا۔ ”جی اچھا۔“ اور گھر کے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد ہی گھر کے دروازے پر حکیم صاحب باہر آئے اور رولوکا کو دیکھ کر فوراً مصافحہ کیا اور بولے۔ ”حکیم صاحب آپ اندر آئیں۔“ بیٹھک کا دروازہ پہلے ہی کھل چکا تھا۔

عتیق صاحب کے ساتھ رولوکا کمرے میں آیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ عتیق صاحب بھی رولوکا کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے۔

”حکیم صاحب میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ کا ہم پر اور ہماری آنے والی نسلوں پر بھی احسان رہے گا۔ چند دنوں سے ہم بہت ہی خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ کئی دن ہو گئے وہ جن پلٹ کر نہیں آیا، ورنہ وہ تو ہر روز بلا ناغہ آدھسکتا تھا۔

ہم آپ کا کسی صورت بھی احسان نہیں ادا کر سکتے۔ ہم اللہ کے حضور دعا ہی کر سکتے ہیں اور اس نیک کا صلہ آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔ آپ جیسے لوگ دنیا میں بہت کم ملیں گے، مجھے لگتا ہے کہ اس جن کو آپ نے اپنے تحفے میں جکڑ لیا ہے ورنہ آدھ ضرور۔

آپ شریف رہیں میں خوشبو کو بلاتا ہوں، باقی تفصیل وہ خود آپ کے کوش گزار کرے گی۔“ اور یہ بول کر عتیق صاحب اٹھے اور گھر کے اندر چلے گئے۔

چند لمحوں میں ہی خوشبو جیسے بھائی ہوئی کمرے میں آئی اور رولوکا کو سلام کیا۔

رولوکا بولا۔ ”خوشبو بیٹا جیتی رہو! اور تمہیں مبارک ہو۔“

”حکیم صاحب! آپ کس بات کی مبارک باد دے رہے ہیں، مجھے لگتا ہے کوئی اہم بات ہے، آپ کھل کر بتادیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“ خوشبو بولی۔

”اچھا تم اطمینان سے سنو! میں بتاتا ہوں۔“ یہ سن کر خوشبو رولوکا کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور رولوکا کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اچھا خوشبو بیٹا! یہ بتاؤ کہ وہ بد بخت جن آیا تو نہیں؟“ رولوکا نے کہا۔

خوشبو بولی۔ ”جی حکیم صاحب! چند دن پہلے دن کے وقت بدحواس گھبرا ہوا آیا تھا۔ حالت بہت خندوش تھی۔ اس پر عجیب طرح کی کپکپی مٹی ماری تھی۔ آتے ہی لڑکھائی آواز میں بولا۔ ”خوشبو اٹھو! چلو میرے ساتھ، تمہیں میں لینے آیا ہوں، فوراً اٹھو میرے پاس وقت

بہت کم ہے، اگر تم رضا مندی سے میرے ساتھ نہ گئیں تو میں تمہیں زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

میں خود اچنبھے میں تھی اور یک ناک اسے دیکھے جا رہی تھی، میرا حواس میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر جیسے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا، میں کیا کر سکتی تھی، میں تو جی کر کسی کو اپنی مدد کے لئے بلا بھی نہیں سکتی تھی۔ جب میں بے سمدھی بستر پر ہی بیٹھی رہی تو وہ طیش میں آ گیا اور فوراً میری کلائی پکڑ لی اور کرخت آواز میں بولا۔ ”چلو اٹھو، جلدی کھڑی ہو جاؤ ورنہ.....“

کہ اچانک کسی ناہیدہ ہستی نے اس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنا زبردست تھا کہ وہ چکر کر گھوم گیا اور پھر کمرے سے نکلنا چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا اور میں غدا حال ہی بیٹھی رہی کہ اس وقت میری بہن کپکپاش کمرے میں آئی تو اس نے میری حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور مجھے آواز دی تو پھر جیسے مجھے ہوش آیا۔

اتنے میں نیچے سے اسی بھی کمرے میں آ گئی تھیں۔ اسی کو دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور جھٹ ان کے گلے لگ کر زور و قہار رونے لگی۔ اسی نے بہت لمبی دی اور پھر آپ کا حوالہ دیا کہ حکیم صاحب نے یقیناً ہم پر نظر رکھی ہوئی ہے، وہ کسی صورت بھی غافل نہیں ہو سکتے اور جہاں تک میرا خیال کہ وہ ناہیدہ ہستی ضرور حکیم صاحب کی ہی مقرر کردہ ہوگی، تم فکر نہ کرو، اللہ تعالیٰ غفور الرحیم اور مسبب الاسباب ہے۔ اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔“ اس دن کے بعد اب تک وہ واپس نہیں آیا۔“

خوشبو نے یہیں تک بات کی تھی کہ اس کے والد کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک نگرے اٹھا رکھی تھی جس میں شربت سے بھرے ہوئے دو گلاس تھے۔ عتیق صاحب نے درمیان میں پڑی میز پر پڑے رکھ دی اور صوفے پر بیٹھ گئے۔

عتیق صاحب کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے رولوکا نے کہا۔ ”عتیق صاحب دراصل اس وقت

میرے آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ میں آپ لوگوں کو یہ بتا دوں۔

وہ جن زاوہ جس کا نام روشاک تھا اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا ہے۔ آئندہ وہ کبھی بھی آپ لوگوں کو تنگ کرنے نہیں آئے گا۔

بد بخت بہت ضدی اور ہٹ دھرم تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ بہت جلد وہ آپ لوگوں کے راستے سے ہٹ گیا، اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ مسلمان جنات قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو مسلمان جنات کے بڑے اہم بزرگ دین دار ہوتے ہیں یا اصول اور باشعور بھی ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی انسان کے ساتھ کسی جن کی ناحق شرارت کو برداشت نہیں کرتے اور جو جن اپنی من مانی کرتا ہے اسے اس کے بزرگ قرار دیتی سزا بھی دیتے ہیں۔

اس اصول کے تحت اور چونکہ اس کے والد قبیلہ کے سردار بھی ہیں۔ اس کی زیادتیوں، شرانگیزیوں، احکام خداوندی سے انحراف اور پھر خوشبو کے ساتھ زیادتی کا بہت اثر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اس لئے اگر کوئی جن کسی اشرف اور وہ بھی مسلمان کو تنگ کرے تو یہ ٹھیک نہیں، اور وہ ہر حال میں سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ خود اس کے والد نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا اور اس طرح اس کا وجود اس دنیا سے ختم ہو گیا اور پھر میں نے بھی آپ کے گھر کے چاروں طرف حصار قائم کرویا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لہذا اب آئندہ کوئی بھی مادیاتی مخلوق اس طرف کار نہیں کر سکتی۔

عقیق صاحب اب آپ لوگ کھائیں بیٹیں خوش رہیں، آگے کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور ویسے بھی آئندہ اگر میری ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں۔

نماز پڑھ کر آپ لوگ میرے حق میں بھی دعا کیجئے گا، اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ میں نے آپ کا شربت پی لیا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک اور بھی ضروری کام سے جانا ہے اب مجھے اجازت دیں۔

خوشبو بیٹا! خوش رہو اور بے فکر ہو کر نئی زندگی کی شروعات کرو۔

اس کے بعد رولو کا نے خوشبو کے سر پر ہاتھ رکھا، اور عقیق صاحب سے مصافحہ کر کے دلی حکیم دقار کے مطب کے لئے عقیق صاحب کے گھر سے نکل پڑا۔

☆.....☆.....☆

وقت مقررہ پر رولو کا صبح کے ساڑھے آٹھ بجے مطب میں پہنچا تو حکیم دقار سے دیکھ کر مسکرانے لگے اور ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ حکیم دقار بولے۔ ”حکیم صاحب اور سنائیں کئی دن تو آپ اس قدر مصروف رہے کہ میں تو ملاقات کے لئے بھی گھر سے نہیں آیا تھا۔“

”جی! میں کیا بتاؤں! ایک ضدی جن سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ کم بخت اپنی ہٹ دھرمی پر ازار ہا، حالانکہ میری خواہش تھی کہ وہ جس بچی پر عاقبت ہو گیا ہے اس سے منہ موڑ لے اور توبہ وغیرہ کر کے دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کرے مگر وہ تو مقابلہ کے لئے ڈٹ گیا، کسی صورت بھی بچی کی جان چھوڑنے پر راضی نہیں تھا۔“

لہذا آخر کار وہ اپنے انجام کو پہنچا یعنی وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب وہ بچی اور اس کے گھر والے خیریت سے ہیں۔ چونکہ میں پل پل اس کی خبر لیتا رہا تھا، اس لئے وقت نہیں ملا کہ آپ سے ملاقات ہو سکے، میں کیا بتاؤں آپ کو تو پتہ ہے کہ کبھی کبھار کوئی مسئلہ ذرا مزیدھا آ جاتا ہے تو وہ زیادہ محنت طلب ہو جاتا ہے۔

خیر آپ سنائیں، آپ ٹھیک تو ہیں ناں! اب آپ جلدی سے چائے منگوائیں، بہت دن ہو گئے آپ کے ساتھ چائے نہیں پی۔“ حکیم دقار نے ملازم کو بلا کر چائے کا ڈور دیا۔ چند منٹ میں ہی چائے آ گئی۔ دونوں چائے پینے لگے۔ اتنے میں حکیم دقار بولے۔ ”حکیم صاحب آپ کو یاد ہوگا کہ ایک صاحب آئے تھے غالباً ان کا نام تھا۔ پر تاب سنگھ، بہت بزرگ تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ آپ سے ملاقات کریں

مگر آپ ان دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف تھے لہذا انہوں نے اپنی ایک خود نوشت ڈائری دی تھی جس میں ان کے سارے تکلیف دہ حالات درج ہیں۔ اور وہ ڈائری میں نے آپ کو دے دی تھی۔

کل وہ صاحب دوبارہ آئے تھے۔ صبح دس بجے سے دوپہر ساڑھے تین بجے تک آپ کا انتظار کرتے رہے۔ بات کرتے کرتے مرتبہ توبہ آبدیدہ بھی ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ بے چارے بہت زیادہ پریشان ہیں کہہ رہے تھے۔ ”کاش! کہ میں نوجوانی میں مر گیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ روزانہ میں الیٹور سے پراہتھا کرتا ہوں کہ الیٹور اب تو مجھے اٹھالے، اب مجھ سے اپنا کرنا کدکھ جھیلنا نہیں جاتا۔“

ان کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی ساری کہانی ڈائری میں لکھ دی ہے، آپ حکیم صاحب سے بولنے کا کہہ کر دیا کریں اور مجھے اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا دلا دیں۔ میری ولی خواہش ہے کہ میں مر جاؤں۔ تاکہ اس دکھ سے میری جان چھوٹ جائے۔“

”ارے ہاں! یاد آیا، آپ نے وہ ڈائری مجھے دی تھی۔ اور میں نے اس کے چند صفحات پڑھے بھی تھے، مگر درمیان میں یہ عتیق صاحب کی بچی والا کیس آ گیا، اور میں اس میں مصروف ہو گیا۔ خیر میں آج رات میں اس ڈائری کو مفصل پڑھوں گا۔ پھر حالات کے پیش نظر کوئی تہی قدم اٹھاؤں گا۔“ رولو کا بولا۔

تھوڑی دیر میں دونوں نے چائے پی لی۔ حکیم دقار کے پاس سے رولو کا اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور ادبیت کے نسخے وغیرہ دیکھنے لگا۔ شام کے بعد وہ وقت مقررہ پر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کھانے وغیرہ سے وہ پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اسے خیال آیا۔ ”پر تاب سنگھ والی ڈائری نکالوں اور پڑھوں کہ دراصل مسئلہ کیا ہے؟“ رولو کا نے پر تاب سنگھ کی ڈائری نکالی اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

”میں گاؤں سے شہر کالج میں آ گیا اور بیٹے ہوئے حالات اور واقعات کو فراموش کر بیٹھا۔ وقت

کے ساتھ ساتھ میں پڑھائی میں مگن رہنے لگا۔ ایک کمرے میں ہم دو اسٹوڈنٹ رہتے تھے۔ میرے روممٹ کو ہارر واقعات اور خوفناک ڈرامائی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا بلکہ اکثر اپنی ڈائری میں وہ خوفناک واقعات بھی لکھتا رہتا تھا۔

ایک دن میں نے اس کی ڈائری اٹھائی۔ اس وقت وہ کمرے میں نہیں تھا۔ وہ دن کے لئے اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ ڈائری کی تحریر میں نے پڑھنی شروع کی۔ لکھا تھا۔

ایک شخص ایک جنگل سے گزر رہا تھا، رات کا وقت تھا چاروں طرف گھپ اندھیرا مسلط تھا، آسان پر کان لے بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوا بھندھی درختوں کے پتے بھی شاید دم سادھے بڑے تھے۔ سارے جنگل میں جان لیوا خاموشی غاری تھی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ رات کا اندھیرا اور خاموشی اس شخص کے دل پر آہستہ آہستہ اپنا اثر بھاری تھی اور ایک طرح کا انجانا خوف اس کے دل میں اترتا جا رہا تھا حالانکہ وہاں اس کے علاوہ کوئی اور نہ تھا لیکن پھر بھی وہ مسافر خوف بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگا کہ کوئی ہے جو کس اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

وہ سامنے چلتے چلتے رک گیا اور مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے اپنے بائیں طرف دیکھا تو اس طرف بھی کوئی نہ تھا مگر جب اس نے دائیں طرف دیکھا تو اس طرف کچھ تھا..... شاید کوئی عورت تھی۔ جو اپنے لمبے بال بکھرائے کھڑی تھی۔ مسافر کا دل ہولنے لگا۔ دفعتاً وہاں چلنے لگی اور پھر عورت پاگلوں جیسی سردھنے لگی۔

”اُدھ بھگوان! یہ تو چڑیل ہے۔“ مسافر دل ہی دل میں بولا۔

اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن اس کے پیروں سے جیسے کسی نے..... کٹی کٹی من کے وزنی پتھر باندھ دیئے ہوں۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ

بل سکا۔ وہ اپنی نظریں اس پر گاڑے رہا جو اس کے خیال میں کوئی چڑیل تھی۔ مسافر کی پیشانی سے موٹے موٹے پسینے کے قطرے پھینکے گئے تھے اور اس کا خون منجمد ہونے لگا تھا۔

”کیا بزدلی ہے!“ اس نے اپنے آپ سے کہتے ہوئے اپنی ہمت بندھائی۔ دنیا میں بھوت چڑیل جیسی کوئی چیز نہیں۔ خواہ وہ من گھڑت باتیں ہیں۔

وہ مسافر جانتا تھا کہ نہ وہ دنیا میں بھوت ہیں اور نہ چڑیلیں تاہم اسے وہ نظر آ گئے تھے وہ چڑیل سمجھے ہوئے تھا۔ وہ ایک بلند چھاڑی تھی جس سے ایک نبل لٹٹی ہوئی تھی۔ مسافر کا دل چاہا کہ قبعر لگا کر ہنس پڑے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا، وہ قبعر لگاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

دفعتاً ایک بڑا الور قریب کے درخت سے پھڑ پھڑا کر اڑا اور مسافر کے سر سے ٹکراتا ہوا نکلا چلا گیا۔

مسافر کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی، وہ دونوں ہاتھوں کی مضامیں سمجھ کر بھاگا وہاں سے اپنے گھر کی طرف اور جب اسے اپنے آپ کو بستر پر ڈالا تو اس کا بدن بخار میں چمک رہا تھا۔ وہ کئی روز تک بخار میں مبتلا رہا اور جب تک وہ پوری طرح سے تندرست نہ ہو گیا بھوتوں اور چڑیلوں کے متعلق بکثرت باتیں ہی بھیانک آواز میں چنچرنا جیسے کوئی اسے مار ڈال رہا ہو۔

بے شک وہ مسافر اور اس کا قصہ فرض ہے لیکن اس سے تو کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ ایسا جیسا کہ اس مسافر نے محسوس کیا۔ ”ایسا واقعہ تو زیادہ تر لوگوں نے اکثر مرتبہ نہیں تو ایک آدھ مرتبہ تو ضرور محسوس کیا ہوگا۔“

بھوتوں، چڑیلوں اور خبیثوں وغیرہ سے انسان نے اس وقت سے ڈرنا سیکھا ہے جب وہ غاروں میں رہتا تھا اور اسی وقت سے انسان اس ناقابل فہم مخلوق سے جس کا دراصل کوئی حقیقت نہیں مگر انسان اس وقت سے ڈرنا آیا ہے۔ چاہے سائنس جتنی ترقی کر لے انسان بھوتوں، چڑیلوں سے ڈرتا رہے گا۔ انسان میں اس خوف کی جڑیں بہت گہری ہوئی ہیں اور دنیا کے اس دور تک پہنچی ہیں جسے کہ تاریک دور کہتے ہیں۔ خوف! وہم

سے بڑھ کر حقیقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ افریقہ کے وحشیوں کی بات تو دور ہے کیونکہ یہ لوگ تو بھوتوں کی دنیا میں جیتے ہیں۔

لیکن مہذب دنیا والے بھی اس وہم میں ان وحشیوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

یہ بات مشہور ہے کہ کالی بلی اور کالا کتا بھوت ہوتا ہے اور ہندوؤں کے یہاں جب کوئی بے موت مرتے ہوئے وہ راکشش بن جاتا ہے اور زندہ انسانوں کو ستایا کرتا ہے اور بڑا وقت اپنے دشمنوں کا خون تک پی جاتا ہے۔ یہی راکشش انگریزی زبان میں ویسٹ رکھلاتا ہے۔

انسان کا وہم اب ہمیشہ رہا بلکہ یقین میں بدل گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندھیرے، بند کمروں، مدت سے خالی پڑے ہوئے مکانوں اور ستان کھنڈروں وغیرہ میں اکثر لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اگر ہر شہر میں نہیں تو اکثر دیہاتوں میں ایسے گھر موجود ہیں جہاں وہ رہتے ہیں چنانچہ ایسے خالی گھر دس میں رہتے ہوئے خوف کھاتے ہیں اور ڈرتے ہیں۔

زمانہ قدیم کے برے یا اچھے کے دیوتاؤں کو اگر راضی یا خوش نہ کیا جاتا تو وہ انسانوں پر تباہی نازل کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہیں خوش کرنے کے لئے انسان خود انسان کو ان پر بھینٹ چڑھا دیتا تھا۔ افریقہ اور کئی جگہوں پر اب بھی یہ رسم جاری و ساری ہے۔

برے یا شیطان دیوتا دراصل کسی کی بدروح ہوتے تھے اور چونکہ روح کی جان ہوتی ہے اور جان خون کے بغیر نہیں رہ سکتی اس لئے ان دیوتاؤں کو خون کی پیاس ہوتی ہے یعنی زندہ رہنے کے لئے انسانوں کو ان پر بھینٹ چڑھا کر ان دیوتاؤں کی پیاس بجھائی جاتی تھی یا بجھائی جاتی ہے۔

اگر بدروح کو خون نہ ملے تو ظاہر ہے کہ وہ خفا ہو جائے اور پھر اس کی فحش قحط، سیلاب یا طسعی و بائی امراض کی شکل میں ظاہر ہو کر انسانوں کو برباد کر دیتی۔ دریائے نیل کی جی بھی ایک بدروح تھی۔ جسے خوش رکھنے کے لئے مصری ہر سال ایک کنواری لڑکی کو دریا میں

غرق کر دیتے تھے۔ مصریوں میں یہ رسم اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ مسلمانوں نے مصر کو فتح نہ کیا۔ قحط سالی کا خوف سب سے بڑا خوف ہے چنانچہ انسان کو بھینٹ چڑھا گیا، رسم عموماً منج بونے کے موسم میں ادا کی جاتی تھی کہ دیوتا خوش ہوں اور غلہ خوب پیدا ہو۔ لہذا سرسبز اور شاداب وادی کی پر پیچ گھائیوں میں بے لگہ راگبیروں کو اغوا کر لیتے اور لے جاکر انہیں قتل کر دیتے تھے اور پھر جشن مناتے تھے کہ ہمارے اس اقدام سے دیوتا خوش ہوگا اور ہماری زندگی پر قبضہ گزرے گی۔

یہی نہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی فوجوان لڑکے کو اغوا کر لیتے تھے اور پھر اس لڑکے کو ایک جگہ کھڑا کر دیتے اور اس لڑکے کے جسم میں مختلف جگہوں پر چھید کر دیتے تھے جس سے لڑکے کے جسم کا سارا خون نیچے کی طرف بہنا شروع ہو جاتا۔ اس خون کو لوگ ایک بڑے برتن میں جمع کر لیتے تھے۔ اور پھر اس خون کو کھیتوں میں چھڑک دیا کرتے تھے تاکہ اس غلے سے دیوتا خوش ہو کر غلہ میں فراوانی کر دے۔ کئی ملک اور علاقوں میں بھینٹ چڑھانے کا رواج آج بھی ہے۔

لیکن انسانی بھینٹ چڑھانے کی رسم جس جگہ اور جس قبیلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ وہ بنگال کا ایک ڈراویدی قبیلہ کھنڈ ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ بھینٹ ایک دیوی پر چڑھائی جاتی تھی۔ بھینٹ کی شرط یہ ہوتی تھی کہ ایسا لڑکا یا ایسی لڑکی جو کہ بھینٹ کے لئے وقف ہو۔ بھینٹ چڑھانے سے پہلے اس لڑکے یا لڑکی کو انہوں کھلاتے تھے جس سے وہ اپنا حواس کھو بیٹھتا تھا اور ہاتھ پیر نہیں مارتا تھا۔ لہذا بھینٹ چڑھانے والا پیشوا ایک تیز دھار چھری سے اس کا شہرہ رگ کاٹ دیتا تھا اور یوں دیوی کو خون پیش کرنے کے لئے دیوی کو خوش کیا جاتا تھا۔

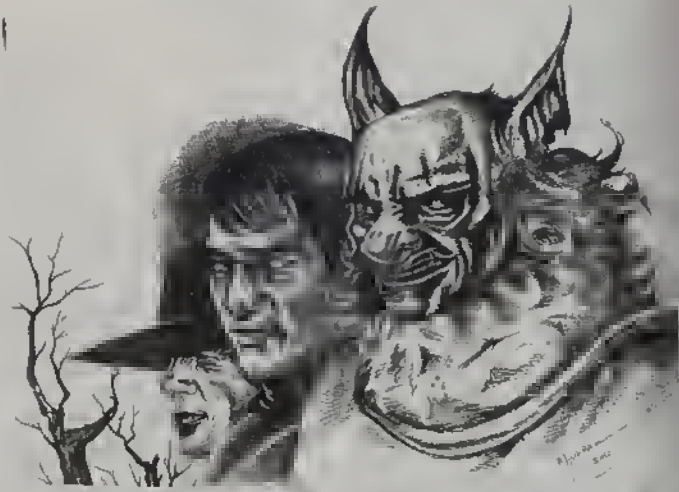
خونی آتما، آسب یا خونی بلا کون بنتا ہے۔ تو خونی آتما بلا چند خاص قسم کے مردے بنتے ہیں۔

یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خونی آتما بلا وہ بنتے ہیں جو کہ بے موت مرے ہوں۔ جس نے خودکشی کر لی

ہو، جو زندگی میں برے کام کرتا ہو اور ہر جائز دنا جائز طریقے سے اپنی خواہشات اور آرزوئیں پوری کرتا ہو۔ وہ جس کی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی ہو اور مرتے وقت جس کی جان کسی چیز میں لٹک رہی ہو اور جان بڑی مشکل سے نکلی ہو اور پھر بلا وہ لوگ بھی بنتے ہیں جو اپنے والدین کو خوش نہ رکھتے ہوں اور جنہیں والدین نے بد عادی ہو مثلاً بد عادی جاتی ہے کہ ”مک بخت کو مرنے کے بعد بھی چین نہ ملے اور اس کی روح بھٹکتی رہے گی۔“ تو ایسی ہی روہیں دراصل خونی بلا بن جاتی ہیں۔

آج بھی یونان کی سلائی اتوام میں خونی روح کا محکم یقین موجود ہے اور یہ لوگ آج بھی راتوں میں ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جو ان کے خیال میں خونی روح کو دور رکھ سکتی ہیں۔ جب کوئی سلائیوں میں مرتا ہے تو اسے دفن کرتے وقت خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ خونی روح نہ بنے پائے اور جب وہ خونی روح قبر سے نکل پڑتی ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے دشمن کا خون پیتی ہے چاہے وہ دشمن اس کے گھر کا ہی کیوں نہ ہو، اس کے بعد وہ اپنا دائرہ بڑھاتی ہے اور پھر اسے جو بھی اندھیری رات میں اکیلا لال جاتا ہے تو وہ اس کا خون پی جاتی ہے۔ سلائی لوگ خونی روح سے بچنے کے لئے طریقہ استعمال کرتے ہیں جب مردہ دفنایا جاتا ہے تو ایک خاص قسم کی لکڑی کا ایک ٹوکڑا کھونٹا جاتا ہے اور جب مردے کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے تو اس کھونٹے کو مردے کے دل کے اوپر والی جگہ پر رکھ کر اس زور سے اس کھونٹے پر ضرب لگاتے ہیں کہ وہ کھونٹا ایک ہی ضرب میں مردے کے دل کو چیرتا ہوا پشت پر نکل جائے۔

چین میں مشکوک لاشوں کو کھلی فضا میں سڑنے گھٹنے لوز خشک ہونے کے لئے رکھا دیا جاتا تھا اور اگر مردے کو دفن کر دیا جاتا تو ذرا سے خشک کی بنا پر قبر کو کھول کر لاشیں نکال لی جاتی تھیں اور پھر انہیں جلایا جاتا اس کے بعد ساری راہ دریا میں بہادی جاتی تھی۔ اور اکثر قبروں کے چاروں طرف چاول سرس مرچ اور لوہے کے ٹکڑے بکھیر دیئے جاتے تھے کہ خونی روح ان چیزوں کے اوپر سے



گمشدہ جزیرہ

ساجدہ راجا - ہندوواں سرگودھا

کمرے میں ملگجی روشنی پھیلی تھی اور ایک عجیب الخلقت وجود بھی موجود تھا خاتون کی کلائی سے بھل بھل بہتے خون کو اس عجیب الخلقت وجود نے اپنی زبان لمبی کر کے تیزی سے چاٹنا شروع کر دیا اور پھر اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

جسم میں گردش کرتی لہو کو نچھاور مار پر رزاقاری کرتی..... ایک خوف ناک کہانی

محسوس کرنے لگا۔ گرینی آنتی جو میرے پاس رہتی تھیں۔ مجھے ایک سڑک پہ نہایت سردی میں ٹھہرتی ہوئی ملی تھیں اور میں انہیں اپنے گھر لے آیا تھا جس سے میرا تنہائی کا احساس کچھ کم ہوا تھا اور میں اسے بڑے گھر میں خود کو اکیلا نہیں محسوس کرتا تھا۔

گرینی آنتی بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں میرے ساتھ وہ یوں گل گل گئیں جیسے برسوں سے ہمارا

میرا نام ایٹم ہے اور میں امریکہ نیویارک میں رہائش پذیر ہوں۔ مجھے سروسایات کا حد سے زیادہ شوق ہے۔ بیسیوں کی بیچہ کی نہیں کیونکہ نام اور ڈیل اپنی زندگی میں ہی میرے نام اتنا کچھ گھٹے تھے کہ میں ساری زندگی بیٹھ کے بھی کھاتا تو وہ ختم نہ ہوتا۔ پھر زندگی نے انہیں مہلت ہی نہ دی اور وہ ایک ٹریفک حادثے میں اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ میں اس بھری دنیا میں خود کو اکیلا

”حکیم صاحب دوست کی ڈائری میں یہیں تک لکھا تھا۔“

بہر حال ان تمام باتوں کو بڑھ کر میں یکدم سناٹے میں آ گیا اور پھر مجھے اپنے بھائی کے ساتھ پیش آنے والے حالات اور واقعات دماغ میں گردش کرنے لگے۔ جنگل میں ہرن کا نظر آنا، گولی لگنے کے بعد ہرن کا بھاگنا اور پھر بھائی نے کچھ دور جا کر اس ہرن کو دیوچ لیا، پھر بھائی کا بے ہوش ہونا، بھائی تک جب ہم پہنچے تو دیکھا کہ ایک عجیب الخلقت آدمی کا کتا ہوا سر ترےب ہی پڑا تھا۔ ہم کسی نہ کسی طرح بھائی کو گھر لے آئے۔ پتاجی نے پنڈت جی کو بلایا۔

پنڈت جی آئے تو انہوں نے کٹورے کے پانی پر کوئی منتر پڑھ کر بھائی کے چہرے پر چھڑکا تو اچانک بھائی غراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے منہ سے نکلا۔ ”او پنڈت تو ترنت بھاگ جائیں تو تیرا منکا توڑ کر رکھ دوں گا۔ تو نہیں جانتا میرا نام ”ماندرا“ ہے۔ اس بالک نے بہت بڑی غلطی کی ہے، میں ہرن کے روپ میں تھا کہ اس نے مجھ پر گولی چلا دی۔ پھر بھی میں بھاگا لیکن اس نے مجھے دیوچ لیا اور میری گردن پر چھری چلانا ہی چاہتا تھا کہ میں اپنی اصل چون میں آ گیا۔“

اس کے بعد بھائی کے منہ سے نکلا۔ ”میں اس بالک کو چھوڑ سکتا ہوں۔ لیکن ایک شرط پر۔ اور شرط یہ ہے کہ ترنت میں بکروں کی سمیٹ دی جائے۔“ اور جب میں بکروں کا سمیٹ دیا گیا تو بھائی بالکل ٹھیک ہو گئے۔

حکیم صاحب! اور پھر ایک وقت آیا کہ میرا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا اور میں پڑھائی چھوڑ چھاڑ فوراً گاؤں میں آ گیا۔ میں اکیلا کھیت کھلیاؤں میں گھومنے لگا۔ ایک روز میں ایک باغ میں اکیلا بیٹھا تھا کہ اچانک ایک ایسا اچھی سنندری سنندری میرے سامنے آ گئی اور میری آنکھیں جیسے اس کی سنندری میں گھو گئیں۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا اور جب ہوش آیا تو.....“

(جاری ہے)

نہیں گزرتی اور پھر مجبور ہو کر وہ خونی روح قبر سے باہر نہیں نکل سکتی بلکہ وہ قبر میں قید ہو کر رہ جاتی تھی۔

خونی بلا سے بچنے کے لئے چند خاص منٹروں، مقدس علامتیں مثلاً صلیب، ہلال، ترشول کا نشان، سونے چاندی اور پتھروں کے دانے یا سچے موتی، تعویذ گنڈے، آج بھی کئی ممالک میں استعمال ہوتے ہیں جہاں کے لوگ خونی بدروحوں سے ڈرتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے اور تسلیم کر لیا گیا ہے کہ دیکھا کسی جوان بیوہ یا کنواری لڑکی سے جتنی تعلق قائم کر سکتا ہے اور کر لیتا ہے۔ بادل دھوئیں یا کسی اور روپ میں اپنی خواہش پوری کرنے آتا ہے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں اکثر اپنے گھر میں اکثر عکلوں میں کسی بیوہ صاحب کو کسی مریدہ کے متعلق چند خاص باتیں یا خاص قسم کے فقرے کہتے ہوئے سننے میں آتے ہیں۔

”فلاں لڑکی پرانی کا بھوت آیا ہوا ہے۔“

”کنواریے پن میں عاشق ہوا تھا۔ ہائے بے چاری کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ جب اس پر عاشق نامراد آسب آتا ہے تو بے چاری کپڑے پھاڑ کرنگی ہو جاتی ہے۔

اور اگر آسب مرد نہیں عورت ہوتی ہے جسے عام طور پر چیل کہتے ہیں۔ تو وہ مردوں سے جتنی تعلقات قائم کرتی ہے۔“ اکثر ایسے فقرے سننے میں آتے ہیں۔

”بھلا چچا آ رہا تھا کہ راستے میں قبرستان کے قریب اسے وہ چٹ گئی۔ کون؟“

”ارے وہی اگلے بیروں والی۔“ یہ بات مشہور ہے کہ چیل کے پیر الٹے ہوتے ہیں۔ کیا کمزور جوان تھا۔ پہاڑ جیسا کزیل، کم بخت دیکھتے ہی دیکھتے اسے کھا گئی۔ سوکھ کر کاٹھا ہو رہا۔“ بھوت، چیل، آسب، خبیث، خونی، آتما، یا پھر دیکھا اس قسم کی تمام باتیں کمزور عقائد لوگوں کے ہیں۔ حقیقت سے ان کا درد کا واسطہ نہیں۔

ساتھ ہو مجھے نام ڈیل یاد تو آتے تھے لیکن ان کی یاد کی شدت کافی حد تک کم ہو گئی تھی گرنی آئی کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرنے لگا اور میں انہی کے کہنے پر انہیں گرنی آئی کہتا تھا۔

انہیں ہر چیز کے بارے میں اتنی معلومات ہوتیں کہ میں حیران رہ جاتا۔ جب مجھے کسی چیز کے بارے میں جاننا ہوتا تو میں انٹرنیٹ پر گزرتا تھا لیکن اب مجھے آنی سے اتنی معلومات مل جاتی تھیں کہ نیٹ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ آنی کی شخصیت میں کچھ نہ کچھ پراسراریت ضرور تھا جسے میں نے بہت بعد میں جانا تھا۔ اکثر جب میں رات کو گہری نیند میں ہوتا تو بغیر کسی وجہ سے میری آنکھ کھل جاتی اور پھر مجھے بہت عجیب سی آوازیں سنائی دینی شروع ہو جاتیں۔ جنہیں میں اپنی کم عمری کی وجہ سے انور کر دیا کرتا تھا۔

ایسی ہی ایک رات جب شدید پیاس سے میری آنکھ کھلی تو میں نے سائڈ ٹیبل پر پڑھ دوڑائی۔ پانی کا جگ خالی تھا۔ شاید آنی پانی رکھنا بھول گئی تھیں۔

میں یہ سوچ کر بیڈ سے اتر آیا کہ خود جا کر کچن سے پانی پیتا ہوں جب میں آنی کے کمرے کے پاس سے گزرا تو مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا لیکن میں غور کئے بغیر آگے بڑھ گیا، جب میں کچن سے واپس آ رہا تھا تو آنی کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے ایسی آواز سنائی دی کہ میں سر تالپا لرز گیا۔ بہت بھدی اور کرخت آواز تھی، الفاظ تو مجھے سمجھ نہیں آ رہے تھے لیکن اتنا محسوس ضرور ہوا تھا کہ کوئی بہت بدوب انداز میں آنی سے بات کر رہا ہے، اس کے باوجود اس کی آواز بہت ہیٹ ناک تھی وہ زبان میری سمجھ سے بالاتر تھی میں ڈرتے ڈرتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور ساتھ ہی کمرے کی طرف کر لیٹ گیا۔ شدید سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ نہ جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھا تو وہ واقعہ میرے ذہن سے تقریباً کچھ بچا تھا۔ بہر حال اس کے بعد میں روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا اور اس کے بعد میری زندگی میں بہت سے

ایسے واقعات رونما ہوئے کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میرے ساتھ کچھ نہ کچھ پراسرار حالات ضرور رونما ہو رہے ہیں اور یہ سب اسی رات کے بعد شروع ہوا تھا۔ جس رات میں نے گرنی آئی کے کمرے سے وہ پریسٹ آواز سنی تھی۔ وہ دن میرے لئے اس لحاظ سے اہم تھا کہ ہم تین دوستوں نے سمندر میں موجود اس جزیرے کی سیر کا پروگرام بنایا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جزیرا صدیوں سے یوں ہی دیران پڑا ہے، وہاں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا کہ کوئی وہاں جانا پسند نہیں کرتا تھا اور جو گیا وہ شاذ و نادر ہی واپس آیا۔

میرے دوستوں نے اس کے متعلق معلومات کیں تو انہیں اس جزیرے کے متعلق بہت ہی معلومات حاصل ہوئیں اور انہیں اس میں ایسا کچھ نظر آیا جو کسی مافوق الفطرت واقعات کی طرف اشارہ کرتا، ویسے بھی یہ سائنسی دور ہے اب ایسی باتیں تو ہم پرستی کی جانب مائل کرتی ہیں۔

بہر حال جانے سے پہلے میں گرنی آئی کو آگاہ کیا تو ان کا رد عمل شدید تھا وہ کسی صورت میرے اس جزیرے پر جانے کے حق میں نہیں تھیں، ان کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے لیکن میں بھلا کیا کر سکے والا تھا۔

دوسری صبح ہماری روانگی تھی اور اس سے ایک شام پہلے کی بات ہے۔ آنی سرشام ہی اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھیں، انہوں نے سختی سے مجھے منع کیا تھا کہ میں نہ تو انہیں ڈسٹرب کروں اور نہ ہی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کروں، میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

لیکن جب وہ کمرے میں بند ہوئیں تو اس کے چند لمحوں بعد ہی میں اس سے ملحقہ کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا اور اس کو آہستگی سے آگے کی طرف دھکیلا تو اس میں ہلکی سی درزیہ آہو گئی، اتنی کہ میں با آسانی نظر ڈال سکوں کہ کمرے میں کون کون موجود ہے۔

پھر اک بہت عجیب اور ڈراؤنا منظر میری آنکھوں نے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ گرنی آئی کے آگے ایک انسانی گوشت سے خالی کھوپڑی رکھی ہوئی ہے جس کی

آنکھوں سے آگ سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی اور اس کھوپڑی سے کچھ ہی آگے ایک ایسا آدی، جسے آدی کہنا بھی غلط ہے، موجود تھا اس کی شکل اتنی ڈراؤنی تھی کہ میں چند لمحوں میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ انجینی زبان میں آنی سے بات کر رہا تھا۔ آنی اس سے سخت لہجے میں کچھ کہہ رہی تھیں اور وہ انکار میں سر ہل رہا تھا۔

اچانک آنی نے اپنے پاس رکھی تیز دھار چھری اٹھائی اور اپنی کلائی پر کٹ لگایا۔ خون بھل بھل بہنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ خون کو دیکھتے ہی اس عجیب طاقت وحشی پر خون سا طاری ہو گیا، وہ آگے بڑھا اور چھٹ کر آنی کی کلائی پکڑ لی اور بہتا ہوا خون اس کے منہ میں جانے لگا اور پھر خون فرش پر گر گیا تھا اس کو بھی اپنی لہجی زبان سے چاٹ لیا۔ اس کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آنٹی نے زخم والی جگہ پر کس کر پٹی باندھی، اس کے بعد آنٹی نے اس ہیٹ ناک آدی سے جوابات بھی کی تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی میں جلدی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”کچھ ہی دیر گزرتی تھی کہ آنٹی میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ فحاشت ان کے چہرے سے ظاہر تھی، میں نے جلدی سے انہیں بیڈ پر بٹھایا اور انہیں پانی کا گلاس پیش کیا جنہیں وہ ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گئیں۔

جب وہ ڈاسکون سے ہوئیں تو میں نے ان سے طبیعت کی خرابی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹال ٹکیں جبکہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے اس جزیرے پر جانے سے روکا تو ہمیں لیکن نصیحتیں ضرور کیں اب ان کے چہرے پر مجھے کافی اطمینان نظر آ رہا تھا جیسے کوئی یو جین ان کے سر سے مل گیا ہو۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ پراسرار علوم پر بھی دسترس رکھتی ہیں لیکن اس کا مجھے پہلے کوئی علم نہیں تھا۔

بہر حال میں نے انہیں تسلی دی کہ ہم اپنی حفاظت کا مکمل بندوبست کر کے جا رہے ہیں انہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری بات پر انہیں اطمینان تو ہوا

لیکن یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ اتنی مطمئن کس بات پر تھیں۔۔۔؟

وقت مقررہ پر ہم تینوں دوست بوٹ پر سوار اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا بلکہ ٹھنڈی ہوا اور کھوپڑی کی بخشش رہی تھی۔ بوٹ کے آس پاس بہتا ہوا مینگوں پانی بہت حسین لگ رہا تھا۔ اس جگہ سمندر اتنا شفاف تھا کہ پانی کے نیچے موجود ہر شے واضح نظر آ رہی تھی چونکہ ہوا کا رخ بھی اسی طرف تھا جدھر ہم جا رہے تھے اس لئے ہم نے سوچا کچھ دیر بوٹ کو بند کر کے سمندر کے حوالے کر دیا جائے اور زیر آب مناظر سے لطف اٹھایا جائے۔ چنانچہ بوٹ کو بند کر دیا گیا تو وہ خراماں خراماں ہوا کے زور پر آگے بڑھنے لگی اور ہم تینوں مکمل طور پر انجوائے کر رہے تھے۔

سمندر کے شفاف پانی کے نیچے کے مناظر اتنے خوب صورت تھے کہ ہم تینوں ارد گرد سے مکمل بے نیاز تھے۔ اچانک میں چونک پڑا۔ میں نے پانی کے نیچے کوئی چمکتی ہوئی چیز دیکھی تھی۔ میں نے بانی دونوں دوستوں کو ادھر متوجہ کیا تو وہ بھی حیران ہو گئے۔ وہ گولی کوئی پتھر نما چیز تھی جو ایک سمندری جھاڑی کے پاس پڑی چمک رہی تھی۔ ہم تینوں متحسوس ہو گئے، آخر طے ہوا کہ چارلس آسکین ماسک پہن کر نیچے جانے لورہہ چیز لے کر آئے۔

چارلس نے ماسک پہن کر سمندر میں چھلانگ لگائی اور اس چمکتی ہوئی چیز کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اور سونگی اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ چارلس اس چیز کے قریب پہنچ گیا اور اسے ہاتھ میں اٹھا کر واپس بوٹ کی طرف آئے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بوٹ میں مجھے اور سونگی کو وہ چیز دکھا رہا تھا۔ نہ تو وہ کوئی ڈائنوسور تھا اور نہ ہی سچا موتی، وہ پتھر نما تھا لیکن بہت خوب صورت اور اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ ہم نے کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد اپنے سامان میں رکھ لیا تاکہ جزیرے سے واپسی پر اس کا اچھی طرح معائنہ کر سکیں۔

بہر حال رات ہونے میں ابھی وقت تھا۔ ہم نے بوٹ کا انجن خود کار پر سیٹ کر دیا، تاحہ نظر سمندر ہی سمندر تھا اور دور تک پھیلی عجیب سی دریاویں، ہم پہلی بار سمندر کے

اس دور دراز سفر پر روانہ ہوئے تھے جہاں آبی جہازوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ ہم تینوں اس ماحول کی دیرانی کو اپنے اندر اترا محسوس کر رہے تھے۔ اب ہمیں پتہ چلا تھا کہ شام کا وقت سمندر میں کئی اداسی لے کر آتا ہے۔

ہم تینوں خاموش تھے ماحول نہ جانے کیوں بوجھل سا ہو گیا تھا۔ دن کو حسین تر لگنے والا سمندر رات میں عجیب سی ہولناک خاموشی میں ڈوبا بہت پر اسرار لگ رہا تھا۔ بوٹ تیزی سے اپنے سفر پر رواں دواں تھی۔ نقشے کے مطابق ہمیں کل تک اس جزیرے پر پہنچ جانا تھا، شاید جزیرے کے مطابق کئی باقی ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی تھیں۔ اس وجہ سے ماحول بہت پر اسرار سا لگ رہا تھا۔ اب شام کا اندھیرا ہر سو چھایا رہا تھا۔

اس ہولناک خاموشی کو سو لگی کی آواز نے توڑا جو ہمیں کھانا کھانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے کے ساتھ ہی چارلس نے میوزک آن کر دیا جس نے ماحول کے بوجھل پن کو کافی حد تک دور کر دیا، کھانے کے بعد کافی کا دور چلا جس کے بعد ہمیں نیند آ گئی۔ انجن کو خود کار پر سیٹ کرنے کے بعد ہم سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائ نے ہمیں جلد ہی نیند کی وادی میں لا پھینکا اور ہم ارد گرد سے بیگانے ہو کر نیند کی وادی میں اترتے چلے گئے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب ہماری بوٹ کو ایک زور دار جھکا لگا ہم تینوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے پھر تو جھکوں کا ایک طوفان آ گیا۔ ہماری بوٹ کو مسلسل جھٹکے لگدے تھے اس کی وجہ ہمیں جلد ہی سمجھ آ گئی۔

ایک بہت بڑی شارک ہماری بوٹ کے آس پاس منڈلا رہی تھی اور ذرا ذرا دیر بعد اپنی دم اتنی زور سے بوٹ پر مارتی کہ بوٹ جھکا کھا کر رہ جاتی۔ میں نے چیخ کر سو لگی کو انجن سنبھالنے کا کہا اور خود اپنے میک سے ریو اور نکال لایا۔ سو لگی نے بڑی مشکل سے خود کو قابو کیا اور انجن کو سنبھالنے لگا۔ چارلس نے سو لگی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ انجن سنبھال لیا وہ ساتھ ساتھ پیچھے مڑ کر میری

طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ سو لگی نے بوٹ کی رفتار میں اضافہ کر دیا لیکن شارک بھی کم تیز نہیں تھی جب وہ کسی صورت واپس نہ مڑی تو میں نے فائر کھول دیا جو اس کی دم پر لگا۔ اس نے ایک جھکا ضرور رکھا لیکن اس کی رفتار میں کمی نہ آئی بلکہ وہ غصے میں اور تیزی سے بوٹ سے ٹکرا رہی تھی اور خطرہ تھا کہ بوٹ ان مسلسل لگنے والے جھکوں سے الٹ نہ جائے۔ میں نے چیخ کر سو لگی کو بوٹ کی رفتار بڑھانے کا کہا اور خود اپنے ریو اور سے دوسرا فائر بھی کروایا اور تیسرا بھی۔ شارک کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے اب اس کی رفتار میں کچھ تو کمی آ گئی تھی لیکن گولیوں کی وجہ سے اس کو جو تکلیف ہو رہی تھی اس کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنی دم کو بے چینی سے ادھر ادھر مار رہی تھی جو بوٹ کو بھی لگ رہے تھے اور بوٹ نہایت نازک پوزیشن میں تھی، ہم رفتار بڑھانے کے باوجود شارک کی ریٹش سے نکل نہیں پار رہے تھے۔ جو نہایت پریشانی کی بات تھی۔ ادھر شارک غصے میں پھر رہی تھی وہ ہماری بوٹ کو نہیں نہیں کرتا چاہتی تھی ہم بھی کسی صورت ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔

بوٹ کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی اور آخر دہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا شارک نے جانے جاتے اسے زور سے ہماری بوٹ کے ساتھ رگڑا کھایا کہ بوٹ تقریباً الٹ گئی یہ تو شکر تھا کہ جیسے ہی وہ بوٹ سے دور ہوئی بوٹ خود بخود سیدھی ہو گئی اور ہماری رک ہوئی سانسیں بھی بحال ہو گئیں۔ ہوا یوں کہ شارک نے واپس مڑنے کے لئے پلٹا کھایا اور ہماری بوٹ سے رگڑ کھاتے ہوئے دوسری طرف چلی گئی اس کے بوٹ کے ساتھ رگڑ کھانے سے وہ اٹھی ہوئی لیکن جیسے ہی شارک دور ہوئی اس کے وزن کا زور ختم ہوتے ہی بوٹ خود بخود سیدھی ہو گئی۔

صبح کا ملنگی سا اجالا ہر طرف پھیل رہا تھا اور اس وقت سمندر اتنا حسین لگ رہا تھا کہ ہم رات والی ساری تکلیف اور جھکوں بھول کر قدرت کی حسین صبح سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ویسے شارک سے یوں مقابلہ بھی ہماری زندگی کا سب سے مشکل نہایت خطرناک مقابلہ تھا اور اس میں ہم کامیاب رہے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ واپس

جا کر ہم نے نہایت مریح معاصر لگا کر اپنے باقی فریڈنڈ کو اپنا یہ کام یاد دلاتا تھا۔ ویسے اگر مریح معاصر نہ بھی لگاتے تو بذات خود یہ ایک نہایت دلزدہ واقعہ تھا جس کا سوچ کر مجھے آج بھی جھجھوری آتی ہے اگر ہم اس رات شارک کا شکار ہو جاتے تو.....؟ یہ سوال ہی مجھے الجھا کر رکھ دیتا ہے بہر حال ہم زندہ سلامت تھے اور اب ہم اپنی منزل کے بارے میں پرہیز تھے۔

جلدی ہی ہمیں جزیرے کے آثار نظر آنے لگ گئے تو ہمارے جوش و خروش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سو لگی انجن سنبھالنے میں مصروف تھا اور میں دور بین سے دور سے نظر آنے والے جزیرے کو دیکھنے میں مصروف..... اور چارلس حسب معمول لیٹا ہوا تھا۔ اس سفر کے دوران یا تو وہ سونے میں مصروف رہا یا پھر کھانے اور میوزک سننے میں۔ اس سفر کے دوران ہمیں معمولی نوعیت کے طوفانوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ سو لگی اور میں پوری طرح مستعد رہے لیکن چارلس کے کان پر جوں تک نہ رہ سکی۔ خیر جزیرے کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ہم پہر تک جزیرے پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے دور بین ہٹا لی اور چارلس کے پاس بیٹھ گیا۔ اب وہ ایک نیا دکھارہ دے رہی تھی، اسے اپنی گرل فریڈنڈ بہت یاد آ رہی تھی جو اس کے ساتھ آنا چاہتی تھی لیکن میں نے کسی خطرے کے پیش نظر اسے منع کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پتہ نہیں سفر کے دوران اور اس جزیرے پر نہ جانے کیسے حالات پیش آئیں۔ وہ لڑکی ہے برداشت نہیں کر سکے گی اور اب مجھے اپنا یہ فیصلہ درست لگ رہا تھا جبکہ چارلس بہت اداس تھا۔ وہ مجھ کو برا بھلا کہہ رہا تھا کیونکہ میں نے ہی اس کی گرل فریڈنڈ کو ساتھ آنے سے منع کیا تھا۔

میں نے اس کو ٹیلی دی اور کہا ”ہم ایک دو دن اس جزیرے پر رہیں گے اس کے بعد واپس آ جائیں گے۔“ میری بات سے وہ کچھ ناراض ہو گیا۔ میں نے اسے دور بین تھمائی کہ وہ بھی جزیرے کو دیکھ لے۔ چارلس دور بین کی مدد سے جزیرے کا جائزہ لینے لگا جبکہ میں سو لگی کے پاس بیٹھا ادھر کی باتیں کر رہا تھا کہ چارلس کا ایک بادلوں کے زور

دار گر بننے کی آواز نے ہمیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے آسان کی طرف نظر دوڑائی تو کالے بادل پورے آسان پر پھیلتے نظر آئے۔ سو لگی نے اس خطرے کے پیش نظر بوٹ کی رفتار بڑھا دی کہ خدا خواستہ اگر طوفان آ گیا تو جزیرے پر ہم محفوظ بھی ہوں گے اور بوٹ کو بھی کسی محفوظ جگہ پر کھڑا کر دیں گے۔ چارلس اور میرے چہرے پر بھی تشویش کے آثار تھے۔ سو لگی کے خیال میں ابھی مزید آدھے گھنٹے کا سفر رہتا تھا۔ اس نے بوٹ کی رفتار میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا۔ بادلوں کی رنگت سیاہ سے سیاہ ہوتی جا رہی تھی ساتھ میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک والوں پر عجیب سی ہیبت طاری کر رہی تھی۔ ابھی مکمل طور پر دو پہر بھی نہیں ہوئی تھی لیکن بادلوں کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے رات اب آئی کہ تپ آئی۔

سمندری سفر، بادلوں کی وجہ سے گھور اندھیرا، طوفان کا خطرہ اور ہم تینوں انسانوں سے قطعی الگ تھلک، ایسے میں ہمارے دلوں کا خوف کھانا کچھ ایسا عام بھی نہ تھا بے جا بھی نہ تھا۔ ایک جگہ بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ ہماری جینیں ٹپٹے ٹپٹے رہ گئیں۔ روشنی کی کثیر آسان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی اور ساتھ ہی چھما چھم بارش برسنے لگی۔

جزیرے کی حدود کافی قریب آ گئی تھی اس لئے سو لگی نے بوٹ کی رفتار میں کمی کر دی، بارش اتنے زور سے برس رہی تھی کہ ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سو لگی کو بوٹ کو کنٹرول کرنے میں بہت مشکل پیش آ رہی تھی اس کے باوجود وہ بہت مہارت سے بوٹ کو کنارے پر لایا جیسے ہی بوٹ رکی، ہم جلدی سے چھلانگ مار کر نیچا آئے اور سب سامان کو ایک محفوظ جگہ منتقل کرنے کے بعد بوٹ کو ایک محفوظ جگہ پر لنگر انداز کیا اور خود بارش سے بچنے کے لئے ایک گھنے درخت کے نیچے پناہ لے لی۔ تیز بارش کی وجہ سے دور تک دیکھنا ممکن نہیں تھا کافی تیز ہوا بھی چل رہی تھی جس کی وجہ سے تیز بارش ہمیں درخت کے نیچے بھی بھگور رہی تھی۔

اچانک میری نظر زمین پر پڑی تو میں حیران رہ

گیا، میں سوئی اور چارلس کو بھی ادھر توجہ کیا۔ وہ بھی حیران اور دہشت زدہ ہو گئے بات ہی کچھ ایسی تھی۔ جزیرے کی وہ زمین جہاں ہم کھڑے تھے وہاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں کیڑے مردہ پڑے تھے۔ ہم نے ارگرد جہاں بھی نظر دوڑائی وہاں ایسا ہی منظر نظر آیا۔ ہمارے دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہے تھے۔ نہ جانے اس جزیرے پر اتنے کیڑے کہاں سے آ گئے اور پھر وہ بھی سارے ہی مرے ہوئے.....؟

بات بہت خوفزدہ کروینے والی تھی پہلے ہماری توجہ چونکہ سامان کو اور بوٹ کو محفوظ کرنے کی تھی اس لئے ہم نے ادھر توجہ نہیں دی اب توجہ کی تو بہت وحشت سی ہو رہی تھی۔ ”یار ایڈم مجھے تو یہ جگہ واقعی بہت پراسرار لگ رہی ہے۔ دیکھ اتنے سارے کیڑے.....! زمین کا کوئی حصہ بھی خالی نظر نہیں آ رہا اور اوپر سے بارش۔ یار سوچو کبھی اتنی ڈراؤنی بارش ہم لوگوں نے کب دیکھی؟“ یہ چارلس تھا جس کے چہرے اور لہجے سے بھی خوف ٹپک رہا تھا۔ میں نے غور سے آس پاس نگاہ دوڑائی واقعی اس کی بات درست تھی واقعی وہاں عجیب سی وحشت ناک صورت حال تھی اور بارش کے زمین پر گرنے سے بہت ڈراؤنی سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ جسے میں کوئی بھی نام دینے سے قاصر ہوں۔ بہر حال اب اگر ہم ادھر آ ہی گئے تھے تو کچھ نہ کچھ تو سراغ تو لگانا ہی تھا کہ پوری دنیا اس جزیرے سے کیوں اتنی خوف کھاتی تھی.....؟

بارش کا کچھ زور و ثروت رہا تھا ہوا تیز ضرور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ سمندر میں طغلیاں آتی۔ آسمان اب بھی کالے گھنگھور بادلوں سے بھرا ہوا تھا اس کی تاریکی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بادلوں کی گرج ابھی بھی جاری تھی اور بجلی کی کڑک دلوں کو ہمار بھی۔

”تم لوگ بہت زیادہ خوف زدہ نہیں ہو؟“ میں نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے لیکن اندرونی طور پر زیادہ خوفزدہ نہیں تھے۔ میری بات پر انہوں نے نفی میں گردن ہلائی جبکہ چارلس میری توقع کے برعکس بولا۔ ”اب تو میں ہر چیز کا مکمل سراغ لگا کر جاؤں گا۔“

میں نے چراگئی سے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھڑکی اور جواب دہ بولا۔ ”میں نے اپنی گرل فرینڈ کو مریع بھی کرنا ہے، تمہیں تو پتہ ہے لڑکیاں بہادر لڑکوں سے زیادہ سٹار ہوئی ہیں۔“ اس کی بات پر میرے چہرے پر مسکراہٹ کھڑکی اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

بارش کا زور تو ٹھٹھا گیا تھا لیکن یوں باندی ابھی جاری تھی اب میراں بھرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے ہم نے اپنے اپنے بیکز اٹھائے اور جزیرے کے اندر چلنے کے لئے تیار ہو گئے اور پھر جہاں تک ہماری نظر گئی مردہ کیڑے.....

کراہیت تو بہت آئی یا کسا خوف بھی محسوس ہوا لیکن یہ سوچ کر دل کو دھارس تھی کہ وہ مردہ تھے اور ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے..... یہ بات ابھی تک ہمارے ذہنوں میں سوالیہ نشان کی طرح تھی کہ اتنے لاکھوں کی تعداد میں کیڑے مریع کیسے گئے، کیا کوئی آفت آئی تھی کوئی بیماری وغیرہ.....! ہم صرف سوچ ہی سکتے تھے کوئی اندازہ قائم کرنا بھی مشکل تھا۔

کچھ دور آگے اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ سنگلاخ پہاڑیوں کا سلسلہ.....! اور جو درخت تھے وہ سب سبز تو تھے لیکن ان کی ہیئت کچھ عجیب سی تھی ان کے پتے ہماری زمین کے درختوں کے پتوں سے اور طرح کے تھے بہت عجیب سے جن کی ساخت کے بارے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں.....!

اس جزیرے کے زیادہ تر درخت بھی انہی مردہ کیڑوں سے بھرے پڑے تھے لیکن چونکہ بارش بہت تیز ہوئی تھی اس لئے درختوں پر ان کی تعداد تھوڑی تھوڑی تھی۔ وہاں کوئی بھی درخت پھول دار نہیں تھا اور نہ ہی کوئی پانی کی ندی تھی۔!

جو بے چارے بھٹک کر اس جزیرے پر آتے ہوئے وہ تو بھوک پیاس سے ہی مر جاتے ہوں گے اور یہ کیڑے.....! نہ جانے یہ کب سے مردہ تھے ان کو دیکھ کر تو لگ رہا تھا جیسے یہ ڈراویر پہلے ہی مرے ہیں کیونکہ ان کے

مردہ اجسام بالکل ٹھٹک تھے ہم ارگرد دیکھتے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے تاکہ کسی صاف ستھری جگہ پر اپنا ٹھکانہ سرکیں لیکن ہمیں کوئی جگہ خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دور تک چلی پہاڑیاں بہت عجیب سی لگ رہی تھیں میں نے دور تک نگاہ دوڑائی سوائے ان پہاڑیوں کے اور کوئی جگہ اس قابل نہیں تھی کہ وہاں رات بسر کی جاسکتی۔

میں نے سب کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ بھی میرے خیال سے متفق ہو گئے ہم نے ایک نسبتاً کم اونچی پہاڑی کی طرف قدم بڑھائے اور اس کی چوٹی پر پہنچ کر جو ٹھوڑا بہت سامان ہمارے پاس تھا وہ ہم نے نیچے رکھ دیا اور خود بھی بیٹھ گئے، دور تک پھیلے اس جزیرے پر دیرینی ہی دیرینی تھی نہ کوئی جانور نہ کوئی پرندہ.....!

چوٹی بارے مجھے پتہ چلا کہ جانوروں اور پرندوں کی وجہ سے بھی کتنی روتی ہوئی ہے۔ شام ہو رہی تھی اور بادل ابھی تک موجود تھے جس کی وجہ سے کافی اندھیرا تھا۔ چارلس نے نارنج روشن کرنی جو اس نے اپنے پاس موجود بیک سے نکال لی تھی۔ نارنج کی روشنی سے آس پاس کا ماحول کافی حد تک روشن ہو گیا تھا لیکن دن کو محسوس کی جانے والی وحشت اب بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

بھوک بھی لگ رہی تھی اس لئے کھانا کھانے کے بعد ہم آپس کی گفتگو میں مصروف ہو گئے جو زیادہ تر چارلس کی گرل فرینڈ کے قصوں پر مشتمل تھی۔ جب ان قصوں سے ٹھٹک گئے تو سونے کے لئے لیٹ گئے، اچانک مجھے اس چیز کا خیال آیا جو ہم نے سمندر سے نکالی تھی وہ ہمارے بیک میں موجود تھی نہ جانے کیا سوچ کر میں نے اس کو سامان سے نکالا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ چارلس اور سوئی نیند کی وادیوں کی سیر کر رہے تھے۔ اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ٹھوس پتھر نما چیز اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ جزیرہ کی نسبت اب وہ اتنا نہیں چمک رہی تھی۔ میری نگاہ غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف اٹھی، نہ جانے کب بادل بچھے اور چاند نکلا آیا تھا۔ میں نے ارگرد نگاہ دوڑائی چاند کی پابندی میں وہ جزیرہ بہت پراسرار لگ رہا تھا۔ ہر سو پھیلی

خاموشی روح تک کولرزا رہی تھی۔ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا وہ بے سادہ پڑے تھے، میں آہستگی سے اٹھا اور پہاڑی پر آگے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ چیز میں نے جیب میں ڈال لی اور نارنج اٹھائے آگے بڑھنے لگا، چاند کی روشنی کی وجہ سے بھی ماحول کافی حد تک روشن تھا۔

میں آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں میں بلا ارادہ ہی آگے بڑھنے لگا چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی تو میں کھڑا ہو گیا اتنا زیادہ چلنے کی وجہ سے میں کافی تھکن سی محسوس کرنے لگا تھا اور جب میں نے ارگرد نگاہ ڈالی تو میں ٹھٹک گیا۔

بات ہی کچھ ایسی تھی میں اک ایسی جگہ موجود تھا جو انتہائی خوب صورت تھی، چاند کی دودھیا روشنی میں سامنے بہت اچھا چشمہ اور اس کے کنارے کے آگے جنگلی پھول اور بھی خوب صورت لگ رہے تھے۔ میں بہت حیران ہوا کہ کہاں وہ دیران وحشت ناک جزیرہ اور کہاں یہ حسین وادی.....؟ آس پاس اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں نے سوچا کہ وہاں جا کر چارلس اور سوئی کو بھی اس جگہ کا بتا کر ادھر ہی لے آتا ہوں۔ وہ دونوں بہت خوش ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے۔ جب مجھے چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی اور مجھے واپسی کا راستہ نہ ملا تو میں بہت پریشان ہو گیا۔ آخر تک ہار کر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں واپس کس طریقے سے جاؤں پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ میں تو دیر ہی جائے گی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے سلانا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں، میں بے سادہ ہو گیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی گئی میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چارلس اور سوئی تو کافی پریشان ہو گئے ہوں گے۔ میری پریشانی بڑھ گئی۔ میں پھر اٹھ کر اسی راستے پر جانے لگا جہاں سے رات کو آیا تھا لیکن کافی کوشش کے بعد بھی مجھے واپسی کا راستہ نہ ملا اور پھر میری بھی ڈھلنا شروع ہو گئی تھی، میں تقریباً نیم پاگل سا ہو گیا۔ راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری ہمت جواب دے گئی اور میں

تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا کیوں اس رات ان کو بتائے بغیر اتنی دور نکل آیا تھا۔ پیاس لگنے پر میں نے نزدیکی چشمے سے پانی پیا اور جھاڑیوں پر مجھے چھوٹے چھوٹے پھول نظر آئے وہ سرخ رنگ کے تھے، میں نے احتیاط سے انہیں پھلکا۔ وہ کسی ریلے پھل کی طرح مزیدار تھے میں نے انہیں توڑ کر کھانا شروع کروا دیا کیونکہ اور کوئی چیز کھانے کی موجود نہیں تھی۔ پتہ نہیں کتنے دن ہو گئے تھے مجھے ادھر بیٹھنے۔ راستہ کے نہیں دے رہا تھا۔ چارلس اور سونگی بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اس بات کا مجھے یقین تھا لیکن کیا انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہوگا؟ اس بات کا مجھے آہستہ آہستہ یقین آتا جا رہا تھا کیونکہ اسے دن میری غیر موجودگی کو انہوں نے یقیناً مجھے مردہ سمجھ لیا ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے وہ واپس چلے گئے ہوں۔

بہر حال میں صرف اندازے ہی لگا سکتا تھا۔ پہلے پہل مجھے تہائی سے کافی وحشت ہوتی تھی لیکن آہستہ آہستہ مجھے اس کی عادت ہوتی گئی اور مجھے تہائی کی اتنی عادت ہو گئی کہ کبھی بارش ہوتی اور بادل گر جتے تو مجھے وحشت نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ پرندوں کی چچہاہٹ بھی ہوتی تو مجھے اچھی نہ لگتی لیکن اچھی بات تھی کہ اس جزیرے پر جانور وغیرہ نہیں تھے ورنہ میں ضرور ان کی آوازوں سے پاگل ہو جاتا۔

نہ جانے کتنا عرصہ بیت گیا مجھے واپسی کا خیال مکمل طور پر بھول گیا۔ شاید گرینی آٹنی نے بھی مجھے مردہ سمجھ لیا ہو۔ چارلس اور سونگی اگر واپس پہنچے تھے تو یقیناً انہوں نے گرینی آٹنی کو میری پراسرار گمشدگی کے متعلق بتادیا ہوگا اور گرینی آٹنی کا جوحال ہوا ہوگا اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا میرے جسم پر جولیا نس تھا وہ بھی پھٹ گیا تھا اب تو ان کے چچہڑے بھی پتہ نہیں کہاں تھے۔ صرف واحد جائگہ میرے جسم کو مکمل برقی سے چھپائے ہوئے تھا اور جائگہ بھی نہ ہوتا تو میں پچھلے زمانے کے لوگوں کی طرح چوں کے لباس پہنتا یا پھر رنگائی رچتا کیونکہ وہاں مجھے دیکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ چمکتی ہوئی پتھر نما چیز اب بھی میرے پاس تھی میں نے بارش اور

خش موسم سے بچنے کے لئے کسی نہ کسی طرح ایک جھونپڑی بنالی تھی۔ واپسی کے تمام امکانات معدوم ہو چکے تھے اور میں نے بھی واپسی کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ کبھی اپنی دنیا کا خیال ضرور آتا لیکن پھر میں سر سے جھٹک کر اپنی دنیا میں گھس جاتا۔

اس دن میں یونہی لیٹا ہوا تھا میرے لیوں پر اچانک کوئی گیت آ گیا تو میں آہستہ آہستہ تنگٹانے لگا۔ تنگٹانے تنگٹانے میری آواز بہت بلند ہو گئی چونکہ وہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے کچھ بھی پرواہ کیے بغیر گانا اور پچی آواز میں جاری رکھا۔ جیسے ہی میری آواز بلند ہوئی اچانک جیسے پر سکون ماحول میں اتنا شور بلند ہوا کہ میں نے خوف زدہ ہو کر گانا بند کر دیا اور اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا، شور اتنا بھیاں کہ تھا کہ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹنے محسوس ہونے لگے حیرت انگیز طور پر جیسے ہی میں نے گانا بند کیا وہ شور یوں ختم ہو گیا جیسے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

میں بہت حیران ہوا۔ شاید یہ میرا دم ہو؟ میں نے سوچا اور پھر اونچی آواز میں گانا شروع کیا اور پھر وہی ہوا بھیاں کہ شور ابلتا تھا کہ میں نے بے اختیار اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور گانا بند کرتے ہی وہ شور بھی ختم گیا۔ بہت عجیب سی بات تھی۔ میں نے ارگردر دنگا دوڑائی تو سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ میں دل میں بہت خوفزدہ تھا کہ پتہ نہیں کیا معاملہ ہے؟

میرے ہاتھ میں وہ چمکتی ہوئی پتھر نما چیز تھی لیکن اندھیرے کے بجائے دھندلی میں چمکتی تھی جو بہت عجیب سی بات تھی۔ نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ میری طرف سے کئی دیر سوچا پھر عجیب سے احساس سے میری طرف آنکھ کھلی گئی ارگردر دنگا دوڑائی اور خوف سے کانپ گیا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں میرے آس پاس کیڑے بکھلا رہے تھے۔ دیسی کیڑے جو ہم نے اس جزیرے پر آتے وقت دیکھے تھے لیکن اس وقت وہ مردہ حالت میں تھے اور اب زندہ تھے۔ اتنے میں مجھے ایک عجیب سی آواز آئی، میں نے ادھر مڑ کر دیکھا تو ایک ساکت رہ گیا۔

وہ ایک کیڑا نما عورت تھی اور اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑی تھی، اس کے جسمانی ابھار کی وجہ سے لگ رہا تھا کہ وہ عورتوں کی ٹیکگری کی ہے باقی اس کا سارا جسم کیڑا نما تھا۔ اس بیت میں وہ بہت خوشنک لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا پتلا اور بدبیت باز داٹھا کر میری طرف اشارہ کیا اور جب بولی تو ایسا لگا جیسے ہزاروں ڈھول بج رہے ہوں میں نے کانوں پر ہاتھ رکھا بالکل دی آواز جو مجھے گانا گانے کے دوران سنائی دی تھی۔ اس کی جسامت کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی تو وہ بھاری بدن کی نہیں تھی جتنی اس کی آواز ڈراؤنی تھی۔ وہ اپنی بھدی آواز میں مجھے گانا سنانے کا کہہ رہی تھی اور جب میں نے گانا شروع کیا تو اس نے عجیب بے ڈھنگے انداز میں اچھلنا اور ساتھ ساتھ شور مچانا شروع کر دیا۔ شاید اپنی زبان میں وہ کچھ گارہی ہو لیکن وہ شور میری ساعتوں کو ناگوار لگنے لگا اور میں نے گانا گانا بند کر دیا۔

گانا رکتے ہی وہ بھی ایک جھٹکے سے رک گئی اور قہر آلود نظروں سے مجھے گھورنے لگی اور پھر مجھے گانا گانے کا کہنے لگی لیکن اب میں یہ غلطی کیسے کر سکتا تھا کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ ذرا دیر اور یہ شور ہوتا تو حقیقت میں میرے کانوں کے پردے پھٹ جاتے تھے، چپ رہنے میں ہی عافیت تھی جب میں کسی طریقے سے گانے پر راضی نہ ہوا تو اس نے اپنے ہاتھوں کو مخصوص انداز میں اشارہ کیا اور وہ کیڑے جو اب تک مجھ سے دور دور تھے اب میرے قریب آنے لگے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اب میری خبر نہیں یہ کیڑے تو مجھے منوں میں جٹ کر جائیں گے۔ میں نے دہشت سے ادھر ادھر دیکھا چاروں طرف سے کیڑے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میرے اعصاب تن گئے مٹھیاں ہنچ گئیں تب مجھے اپنے ہاتھ میں اس پتھر نما چیز کا احساس ہوا۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ میں سانسے کر لیا۔

جیسے ہی اس کیڑے نے نما عورت کی نظر پتھر پر پڑی تو اس کے منہ سے آواز نکلی جو نکلی اور وہ اسی طرف نکلی گئی جس طرف سے اچانک نمودار ہوئی تھی اور وہ

کیڑے جو میری طرف بڑھ رہے تھے وہ بھی حیرت انگیز طور پر پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ غار بہت زیادہ لمبا تھا بھاگتے بھاگتے میرے پاؤں ٹپ ہو گئے۔

خدا خدا کر کے غار کا دہانہ ختم ہوا، جیسے ہی میں دہانے پر پہنچا مجھے پتھر سے ایک ٹھوکر لگی اور میں غار سے باہر گرتا چلا گیا.....

دن، مہینے، سال گزرتے چلے گئے۔ جوانی وصل گئی، زبردیا پاد پے قدموں آ پہنچا لیکن میں واپس نہ جاسکا۔ عجیب گور کھنڈ تھا۔ اس دوران مجھے کھانے پینے کا مسئلہ نہیں ہوا اتنے سالوں میں، میں اتنا تو جان گیا تھا کہ کیا کھانے کا قائل ہے اور کیا نہیں!.....

وہاں بظاہر جو چیز عجیب لگتی درحقیقت وہی کھانے کے قائل ہوتی..... میرا حلیہ جانوروں سے بدتر ہو گیا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال اتنے بڑھ گئے تھے کہ میان سے باہر ہے۔ وہ بھی عام سے دنوں جیسا ایک دن تھا جب میں نے اپنے ارگردر کچھ ایسا محسوس کیا جو اتنے سالوں میں، میں نے نہیں کیا تھا۔ میں چونکا ہو کر آس پاس دیکھنے لگا اور پھر میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا۔ جو اس وقت سے کئی سال پہلے میں نے اس عجیب الحلقہ وجود کو گرینی آٹنی کے کمرے میں دیکھا تھا۔

وہ وہی پر بیت شخص تھا۔ بالکل وہی۔ میں جوان سے بوڑھا ہو گیا۔ لیکن وہ بالکل نہیں بدلا..... اس کے چہرے کی سفاکی آج بھی برقرار تھی وہ ایک تنک میری طرف دیکھ رہا تھا شاید وہ مجھے پہچان نہیں پار تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اسے دیکھ کر مجھے ڈر و خوف کے بجائے عجیب سی مسرت ہوئی تھی۔ "شاید خیرے دل کے کسی کو نے میں آج بھی اپنی دنیا میں جانے اور دیکھنے کی خواہش موجود ہے۔" اور جب اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے ہلا جوں اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر مجھ پر نیند کا غلبہ ہوتا گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں بستر پر موجود تھا اور میرا حلیہ بالکل بدل چکا تھا سر اور داڑھی کے بال موٹے ویسے



خون جگر

عامر ملک - راولپنڈی

اچانک کمرے میں آواز گونجی تیرا خالق لامحدود قوتوں کا مالک ہے شیطان وقتی طور پر گمراہ کرتا ہے لیکن بالآخر اسے شکست ہوتی ہے اپنی نفسانی خواہشات کے لئے تو نے شیطان کی پناہ چاہی اور تو زندگی بھر کے لئے اذیت سے دو چار ہو گیا۔

دل دہلا تا اور رو گئے کھڑے کرتا شاخسانہ جسے پڑھنے والے دنگ رہ جائیں گے

ایک بہن رشیدہ کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ قدرت نے مجھے صحت تو اچھی دی تھی۔ میرا جسم بھی مضبوط اور توانا تھا مگر میرا رنگ کالا تھا۔ چہرے کے خدو خال بد نما تھے چٹائی یا تاک اور بندر جیسا چہرہ دیکھ کر لوگ نفرت سے منہ پھیر لیتے تھے مگر میرے دل میں کوئی بھی نہیں جھانکتا تھا کہ اسے میرے اندر کے خوبصورت انسان کا اندازہ ہو سکے۔

بہنوں پرانا قصہ ہے پاکستان کو معرض وجود میں آنے بارہ سال بیت گئے تھے ان دنوں میں ایک سرکاری ادارے میں ملازمت کرتا تھا۔ میں جس شہر میں کام کرتا تھا وہ ہمارے گاؤں سے چالیس میل دور تھا اس لئے میں روزانہ گھر سے ہی سچ ڈیوٹی پر شہر جاتا اور شام کو چھٹی کر کے واپس گاؤں آ جاتا تھا۔ میری ماں بڑی زور و شور سے

ہے، نہ جانے کون سی طاقت ہے جو اس کو وہاں پہنچنے نہیں دیتی؟ ہو سکتا ہے جب میں مر جاؤں تب وہ تم تک پہنچ جائے.....؟ تمہارے دوست اسی جزیرے پر موجود کئیوں کی غذا بن گئے تھے اور تم اس چمکتی ہوئی بھری چیز کی وجہ سے محفوظ رہے۔

میرے بچے۔ اس جزیرے پر جب بھی بارش ہوتی ہے تو وہ کپڑے کچھ وقت کے لئے بے ہوش ہو جاتے ہیں اور پھر جیسے ہی بارش کا پانی سوکتا ہے خشک ہوتا ہے تو وہ دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی انسان ان کو مل جائے تو وہ انسان کو منٹوں میں چٹ کر جاتے ہیں۔ میرے بچے یہ سب باتیں مجھے اپنے علوم کی وجہ سے معلوم ہوئیں لیکن میرا علم اس حد تک نہیں پہنچ پا رہا تھا کہ تم موجود ہو۔

میں نے پولیس ریکارڈ میں یہ بات محفوظ کرادی ہے کہ تم جب بھی لوٹو گے اور اس گھر میں واپس آؤ گے تمہیں سب کچھ دیا ہی ملے گا تمہاری جائیداد کو نیلا نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی ٹرسٹ کے ہوالے کیا جائے گا۔ اس لئے اب تم جب بھی لوٹو گے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی، ہو سکتا ہے جب تم بڑھاپے کی سرحد پر ہو، اس وقت تمہاری واپسی کی کوئی راہ بنے لیکن جب بھی آؤ گے سب کچھ دیا ہی پاؤ گے تمہارے لئے بہت سا پیارا دوا بنیں۔

تمہاری گریبی آنٹی میں نے ڈائری پڑھ کر ایک طرف رکھ دی۔ میری زندگی کے کتنے سنہرے سال ضائع ہو گئے تھے۔ چار لکھ سو لکھ پچھتر گئے اور میں بڑھاپے کی سرحد پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا اس جزیرے پر جانے کا میرا فیصلہ کیا درست تھا؟ وہاں یہ کہ وہاں ایسا کون سا ظلم تھا جو انسان کو واپسی کی راہ بھلا دیتا تھا؟ لیکن وہاں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد بھی میں اس کا جواب نہیں جان سکا۔ تو اب کیا جان پاؤں گا؟ وہ بچہ تو میرے پاس محفوظ ہے یادگار کے طور پر.....

آج تک اسی علاقے میں جانے کی کوشش میں مصروف

گئے تھے۔
”کیا میں اپنی دنیا میں ہوں.....“ میرے دل میں اچانک خیال آیا تو میں نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ حیرت انگیز طور پر وہ میرا ہی گھر تھا جو نہ جانے کتنے سال پہلے میں چھوڑ گیا تھا اور وہ آج تک ویسا ہی صاف ستھرا تھا یا شاید میرے آنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں ساری باتوں کو بھول گیا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا، سارا گھر گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد میں گریبی آنٹی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا ان کا کمرہ بھی دیا ہی تھا میں ان کے بستر کے قریب گیا، ان کے میڈ کے قریب رکھی چھوٹی سی میز پر ایک سرخ جلد کی ڈائری اٹلی پڑی تھی، میں نے جس کے مارے وہ ڈائری اٹھالی اور اپنے کمرے میں آ گیا اور اپنے بستر پر دما ز ہو کر پوری محویت سے وہ ڈائری پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

میرے پیارے ایلیم تمہارا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں تھک گئی ہیں۔ نہ جانے کس وقت بند ہو جائیں۔ کاش امرنے سے پہلے ایک بار تمہارا چہرہ دیکھ سکتی.....؟
لیکن مجھے معلوم ہے تم زندہ ہو اور جس گورکھ دھندے میں تم بچس گئے ہو اس سے نکلنے کے لئے نہ جانے کتنا عرصہ درکار ہو۔ شاید تمہیں پتہ بھی ہو کہ مجھے پراسرار علوم پر کافی دسترس حاصل ہے۔ جب تم نے اس جزیرے پر جانے کی ضد کی تو میں نے تمہیں بہت روکا لیکن تم جو ان تھے وہی کرتے جس سے تمہیں منع کیا جاتا، اس لئے میں نے عمل کے ذریعے کالی طاقتوں کے زیرِ نگرانگ کر لیا اور اسے بیہوش کے طور پر اپنا خون پلایا، تب جا کر وہ تمہاری حفاظت کرنے پر رضامند ہوا لیکن وہ اس وقت تمہاری مدد کر سکتا جب تم مکمل طور پر بے بس ہو جاتے لیکن ایسا کوئی موقع نہ آیا اور ایک رات تم غلطی سے اس علاقے میں قدم رکھ بیٹھے جہاں سے واپس آنا انسانی بس کی بات نہیں تھی۔ جس جہر کو میں نے تمہاری حفاظت پر مسموم کیا، وہ بھی اس علاقے میں نہ جا سکا، وہ آج تک اسی علاقے میں جانے کی کوشش میں مصروف

سب میری ظاہری صورت دیکھ کر نفرت کا انداز اپنائے ہوئے تھے۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ تمام برادری میں صرف ہم ہی مفلس اور غریب تھے۔ یہی غریبی اور بد صورتی نہ صرف میری دشمن بلکہ میرا سب سے بڑا جرم بھی بن گئی تھی۔ گاؤں کی جوان لڑکیاں مجھے دیکھ کر طنز پر باتیں کرتیں اور قہقہے لگتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کالا کوا۔ بندر لنگور اور نہ جانے کتنے القابات سے نواز رکھا تھا۔

گاؤں کا سب سے امیر شخص سلطان خان تھا۔ اس کی جائیداد کو کوئی شادی نہیں تھا۔ وہ میرے ابا جان کا چچا زاد تھا۔ بچپن میں ہی میری منگنی چچا سلطان کی بیٹی ثریا سے کر دی گئی تھی۔ مگر اب جبکہ میرے ابا جان اس دنیا میں موجود نہ تھے اور میری شکل بھی کسی کو نہ بھاتی تھی۔ ساتھ ہی غریبی کا انٹ داغ بھی میری پیشانی پر سیاہی تھا۔ تو چچا سلطان نے میری اور ثریا کی منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا سماں اور معاشی بایکٹ بھی کڑا لایا۔ برادری کے دیگر لوگ بھی چچا سلطان کے ہموار بن گئے اور مجھے ایک اچھوت سمجھ کر مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ میں ان لوگوں کی نفرتیں دیکھ کر بہت کڑھتا تھا۔ اور ادراپ والے سے شکوہ بھی کرتا تھا کہ اس نے مجھے بد صورت کیوں بنایا ہے اس کے خزانے میں کیا کمی تھی؟ مگر میں اور کچھ نہ کر سکتا تھا زندگی یوں ہی بے کیف ی گزر رہی تھی۔

اور میری ماں کو میرے سر پر ہار دیکھنے کی شدید خواہش تھی۔ چچا سلطان کی طرف سے باپس ہونے کے بعد انہوں نے برادری کے ہر گھر میں جا کر میرے لئے جھولی پھیلائی مگر میری غریبی اور میری بد صورتی میرے راہ کی دیوار بن گئیں برادری میں سے کسی نے بھی مجھے رشتہ نہ دیا۔ برادری سے باہر ایک نزدیکی گاؤں میں ایک خاندان ہر لحاظ سے ہمارے ہی معیار کا تھا۔ وہاں میرا رشتہ طے ہو گیا لڑکی کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اس کا نام غنیم تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت تھی رشتہ طے ہونے پر میں اپنی قسمت پر رشک کرنے

لگا۔ میں بہت خوش تھا کہ میرے دل کی مراد پوری ہو رہی ہے۔ ای بھی سرور تھیں اور زور و شور سے شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ مگر تقدیر میری بدلتی پر مسکرا رہی تھی اور میرا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اور پھر یہ ہوا کہ میرے سر پر سپراناہ رج سکا اور میری سارا آرزوئیں دم توڑ گئیں۔ ایک صبح اچانک خبر ملی کہ میری منگیت اور ہونے والی بیوی شیم اپنے گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی ہے۔ اس نے بھی میری بد صورتی کا شہرہ سن لیا تھا۔ جلد ہی یہ خبر صرف گاؤں بلکہ علاقے میں بھی پھیل گئی تھی کہ کوہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ خوب بے عزتی ہو گئی میرا ارمان بھی ادھورے رہ گئے۔ لوگ میرا مذاق اڑانے لگے۔ میں اندر ہی اندر شرمندہ ہو کر کڑھنے لگا۔ میں نے گاؤں جانا کم کر دیا۔ اگر جاتا بھی تو گھر سے باہر نہ نکلتا۔ کبھی مجھے اپنے آپ پر غصہ آتا۔ جی چاہتا کہ خود کی کرلوں ذلت اور رسوائی کی اس زندگی بے موت بہتر ہے۔ مگر شاید میں بزدل تھا کہ ایسا نہ کر سکا۔ میں اکثر تقدیر بنانے والے سے شکوہ کناں ہو جاتا۔

اے سب جہانوں کے مالک! تو نے مجھے بد ہی کیوں کیا تھا؟ میں بھی تیری ہی مخلوق ہوں۔ تیرا ہی بنایا ہوا انسان ہوں۔ تو پھر تیرے ہی تخلیق کئے گئے دوسرے انسان مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اس سے تو بہتر تھا کہ تو مجھے پیدا ہی نہ کرتا۔ اگر میں اس دنیا میں نہ آتا تو تیری دنیا کا نظام رک تو نہ چلتا۔ سورج، چاند اور ستاروں کی روشنی ماند تو نہ پڑتی۔ میں لوگوں کی طنز و بھری باتوں سے توجہ جاتا۔ شکوہ کرتے کرتے میں رو پڑتا۔ پھر سجدے میں گر جاتا اور درود کر پروردگار سے معافی مانگتا کہ تیری ذات سے شکوہ کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ تو نے جو کچھ مجھے عطا کیا ہے۔ اس میں بھی تیری کوئی مصلحت ہوگی۔ میں تیرا گناہگار بننا ہوں۔ میں تمام عمر بھی تیرا شکر ادا کرتا رہوں تو کم ہے۔ بے شک تو بخفا ہے، چاہے تمہارے میں، تیری ذات سے ناامید نہیں ہوں۔ نہ

جانے کب تیری رحمت جوش میں آجائے اور تو مجھے مالا مال کر ڈالے۔ میں اسی یقین کے سہارے زندگی کے دن گزار رہا تھا کہ ایک روز میری ماں میرے سر پر ہار دیکھنے کی خواہش لئے اس دنیا سے کوچ کر گئی۔ مجھے ماں کے جانے کا بہت ہی دکھ ہوا۔ میں اس روز بیت ہی روپا تھا۔ میری اس تنہائی اور بربادی کا ذمہ دار میری نظروں میں صرف میرا چچا ہی تھا۔ جس نے میرے ارمانوں کے پھولوں کو کھل ڈالا تھا۔ اس کی دولت اور گھمنڈ نے میری ماں کی جان لے لی تھی۔ میرے دل میں چچا سلطان کے خلاف نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ مگر میں مجبور اور بے کس تھا کہ میں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا تھا۔ میں جب بھی چچا سلطان یا ثریا کو دیکھتا تو میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ میں اپنے آپ میں نہ رہتا اپنیوں کی بے وفائی اور ستم ظریفی کی آگ مجھے جلائی لگتی گاؤں میں رہنا اور جینا میرے لئے عذاب بن گیا تو میں نے گاؤں کو خیر آباد کہہ دیا اور مستقل طور پر شہر میں رہائش رکھ لی۔ گاؤں میں اب میرا تھا بھی کون۔۔۔۔۔۔ ہوائے ایک بہن کے۔۔۔۔۔۔ میں کبھی کبھار اس کی خیریت معلوم کرنے گاؤں چلا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اور میرا گاؤں سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ تقدیر نے مجھے بھری دنیا میں تنہا کر دیا تھا۔ اور خجائی کے ورد نے میری زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ میں اندر میری راہوں پر لڑکھڑانے لگا تھا۔ میں سوچتا تھا۔ یہ آرزوئیں اور ان کی تکمیل بھی کیا شے ہے۔ کبھی بھی تو یہ انسان کی زندگی کو خوشیوں سے مالا مال کر دیتی ہے اور کبھی ان کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہے۔ میں جس دفتر میں ملازم تھا وہاں میری دوستی صرف ایک شخص سے تھی۔ اس کا نام برکت تھا۔ میں اب شہر میں اسی کے ساتھ رہتا تھا میں ایک دوبار برکت کے ہمراہ اس کے گاؤں بھی جا چکا تھا۔

ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں زیادہ تر لوگ مال بچوں والے تھے ہمارے سامنے والے گھر میں

جو لوگ رہتے تھے وہ بہت ہی امیر تھے اور پر لطف زندگی گزار رہے تھے جیلہ کا تعلق اسی گھرانے سے تھا۔ میں نے پہلی بار جیلہ کو دیکھا تو پلیس جھپکا بنا بھول گیا جیلہ قدرت کا ایک حسین شاہکار تھی اس جیسی خوبصورت لڑکی میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر اپنا آپ بھلا بیٹھا۔ صرف جیلہ یاد رہی۔ لگتا تھا میں دیوانہ ہو گیا ہوں اس کا لہذا تھا، خوبصورت نقش اور حیا کی سرخی سے بھر پور چہرہ دیکھ کر میں بے خود ہو گیا میں ہر لمحہ اس کی سندرتا میں گھویرا ہوتا تھا اس کے حسن کی تاب میری آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ جب میں ہوش کی دنیا میں آتا تو اپنی بد نصیبی اور بد صورتی پر آنسو بہانے لگتا۔ کہ میں ایسے خواب دیکھنے کا حق نہیں رکھتا۔ جیلہ میرے لئے نہیں بلکہ کسی شہزادہ گلغاں کے لئے بنا کر اس دنیا میں بھیجی گئی ہے وہ میرے خوابوں کی ملکہ نہیں بلکہ کسی اور کے خوابوں کی رانی ہے۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ جیلہ کو بھول جاؤں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔۔۔۔۔۔ کہ محبت کرنے کا حق تو ہر کسی کو حاصل ہے اور پھر محبت، رنگ و نسل، اونچ نیچ، امیری غریبی نہیں دیکھتی۔ بس یہ ہو جاتی ہے مگر مجھ سے تقدیر نے محبت کرنے کا حق چھین لیا تھا اور یہی میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ بن گیا تھا۔ پھر بھی نہ جانے مجھے کیوں یہ یقین تھا کہ کبھی تو میری منہ کی چین کے سر جھائے ہوئے پھول کھلیں گے۔ میری خزاں رسیدہ زندگی میں بھی بہار ضرور آئے گی۔

برکت کی بہن کی شادی طے پا چکی تھی اس نے دفتر سے چندہ دن کی چھٹی لی اور مجھے بھی اپنے ساتھ گاؤں لے گیا۔ شادی کا ہنگامہ مہینہ دن رہا اور ختم ہو گیا۔ برکت کی خاندان کی گاؤں میں کافی ساری زمینیں تھیں گاؤں سے باہر انہوں نے ایک ڈیرہ بنا رکھا تھا۔ جہاں باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا شادی کے بعد میں اور برکت اسی ڈیرے پر رہتے تھے رات، ہم ڈیرے پر ہی گزارتے تھے اور صبح مچھنیوں کا دووہ نکال کر برکت کے گھر لوٹ جاتے تھے برکت کے گھر والے مجھ سے مانوس تھے۔ اور گھر کی عورتیں مجھ

اور ایک جگہ شادی بھی طے ہوئی تھی مگر بعد میں منگنی بھی ٹوٹ گئی اور دوسری لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی۔ آپ اس کا یہ مسئلہ حل کر دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اگر میرے جگر کی یار کی شادی ہوئی تو ہم تمام عمر آپ کو دل میں اور عواؤں میں یاد رکھیں گے۔

میں نے بھی برکت کی ہاں میں ہاں ملائی اور درخواست کی کہ وہ میری شادی کا مسئلہ حل کر دیں۔

بابا گنگا رام نے کچھ دیر سوچا اور پھر مجھے اپنے قریب بٹھا کر کہنے لگا۔

”میں تمہیں ایک عمل بتا رہا ہوں اس عمل کے دوران کوئی غلطی نہ ہونے پائے اگر غلطی ہوگی تو نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر تم نے میرے بتائے ہوئے عمل میں کوئی غلطی نہ کی تو تمہاری شادی ضرور ہوگی۔

میں بہت خوش ہوا۔ اور یہ یقین ہو گیا کہ گنگا رام میرا کام ضرور کرے گا۔ میں نے کہا۔

”آپ مجھے عمل بتائیں۔ میں کوئی غلطی نہیں کروں گا۔“

گنگا رام نے مجھے ہندی زبان کے چند الفاظ بتائے اور کہا کہ مجھے چالیس راتوں میں یہ عمل کسی قبرستان میں بیٹھ کر کرنا ہوگا۔ آجی رات کو قبرستان میں جا کر کسی جگہ تھوڑی سی آگ جلائی ہے مجھے اپنے ساتھ سرخ مرچیں لے کر جانا ہوں گی۔ جتنی باریہ الفاظ یا منتر پڑھنا ہے اتنی ہی باریہ مرچ اس آگ میں ڈالنے جانا ہے۔ یوں چالیس مرچیں ہر رات کو اس آگ میں جلائی ہیں۔ میں دن کے بعد مجھے اس لڑکی کے سامنے جانا ہے جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اول تو یہ امید ہے کہ چالیس دن کا عمل مکمل ہونے سے قبل ہی میری اور اس لڑکی کی شادی ہو جائے گی ورنہ عمل کے بعد تو شادی یقیناً ہو جائے گی وہ کیسے ہوگی؟ وہ تمہیں خود ہی وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔

یہ عمل نہایت ہی مشکل اور خوفناک تھا مگر یہ میری زندگی کی رعنائیوں اور خوشی کا مسئلہ تھا اس لئے میں نے

یہ عہد کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں گنگا رام کا ہر عمل ضرور کروں گا گنگا رام نے مجھے اپنا دھرم اس کا عمل بھی دیا کہ اگر میں اسے خط لکھتا ہوں تو اس پر دست لکھتا ہوں گنگا رام ہندوستان روانہ ہو گیا۔ میں اور بھائی بھی دو دن بعد شہر لوٹی پر حاضر ہو گئے۔

ٹریا کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کی منگنی ساتھ والے گاؤں کے ملک کھن خان کے بیٹے کے ساتھ ہو چکی تھی۔

ملک سجاد سے طے پا گئی تھی کچھ عرصہ بعد ان کی شادی ہوئی تھی میرے لئے ٹریا کو حاصل کرنے اور چچا سلیا سے بدلہ لینے کا موقع آجھ آ گیا تھا۔ میں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانے اور ٹریا کو حاصل کرنے کا خطر گنگا رام کا بتایا ہوا عمل شروع کر دیا۔

ہم شہر کے جس علاقہ میں رہ رہے تھے وہاں سے ایک قبرستان نزدیک پڑتا تھا۔ قبرستان کے ارد گرد کافی فاصلے پر کوئی آبادی نہ تھی۔ میں نے اس وقت قبرستان جا کر ماحول اور حالات کا جائزہ لیا اور ایک گڑھے نما جگہ عمل کے لئے منتخب کر کے مطمئن ہو گیا۔ رات کو گیارہ بجے جب میں اپنے مکان سے نکلا تو ہر طرف ہوا کا عالم تھا۔ سب سے پہلی بات میں لوگ اپنے اپنے گھروں میں نرم گرم بستروں میں سو رہے تھے۔

پرسکون نیند سو رہے تھے اور میں قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے سردی سے بچنے کے لئے پورا ہندو بست کر رکھا تھا۔ پھر بھی سردی ہوا میں پرچھوڑ کی مانند میرے جسم سے آ رہا ہو رہی تھی۔ قبرستان میں چھائی ہوئی ویرانی اور سناٹے نے مجھے بے حد خوف زدہ کر دیا تھا۔ اندھیری رات میں راستہ بھی واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں نے بھی ہمت نہ ہارنے کی قسم کھا رکھی تھی کہ یہ میرے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا ٹریا کو حاصل کرنے کی خاطر تو میں آج کے سمندر میں کوئی نہ کبھی تیار تھا یہ عمل تو میرے لئے معمولی بات لگ رہا تھا۔

میں پہلی رات جب عمل سے فارغ ہوا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں واپس مکان پر پہنچا تو غلط حال

ساز ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ دن کو میری آنکھ دیر سے کھلی تو میری طبیعت سنبھل گئی تھی ورنہ رات کو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا ایک ایک انگ دکھ رہا ہے اور میں شدید بخار میں مبتلا ہوں اب میری جھجک اور خوف ختم ہو گیا اور میں ہر رات باقاعدگی سے قبرستان جا کر گنگا رام کا بتایا ہوا عمل کرنے لگا۔

یوں ہی میں دن گزر گئے گنگا رام کے کہنے کے مطابق مجھے بیس دن بعد ٹریا کے سامنے جانا چاہئے تھا۔ مگر میں یہ بات بھول گیا۔ میں مذہبی گاؤں گیا اور نہ ہی ٹریا کے سامنے جانے کے بارے میں سوچا۔ مگر عمل مسلسل جاری رکھا۔ یہ سوچ کر کہ چالیس دن بعد میں گاؤں جاؤں گا۔ تو گنگا رام کے بتائے ہوئے عمل کا رد عمل دیکھوں گا میں روز عمل کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جب میں عمل کے دوران سرخ مرچ کو آگ میں ڈالتا تو وہ جلنے لگتی تھی اور ساتھ ہی دھوئیں میں سے کسی عورت کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ یوں لگتا جیسے کوئی عورت وردی شدت سے

کروہ رہی ہو اور سسکیاں لے رہی ہو۔ میں یہی سمجھا کہ یہ ٹریا کی سسکیاں ہیں اور گنگا رام کا بتایا ہوا عمل آخر کھارہا ہے آخری میں دنوں میں میں ٹریا کی سسکیاں سننا اور خوش ہوتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ فریاد کر رہی ہو۔ اور ڈرپ رہی ہو۔ ٹریا نے میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر کے جوازیت مجھے دی تھی میں اس کا بدلہ لے رہا ہوں اور یہ بات میرے لئے تسکین کا باعث تھی۔

چالیس راتیں گزر گئیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے عمل مکمل کر لیا تھا۔ میں اگلی صبح گاؤں کی طرف چل پڑا تا کہ ٹریا کے سامنے جا کر اس کا رد عمل دیکھوں۔۔۔۔۔۔ یقیناً اب وہ میرے بارے میں سوچنے لگی ہوگی۔ میں شادی کے سنے جانے گاؤں جا پہنچا۔۔۔۔۔۔ میں گاؤں سے چند قدم کے ہی فاصلے پر تھا کہ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ کوئی جنازہ اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے ہیں۔ میں بھی اسی

صفت چل پڑا اور جنازے میں شامل ہو گیا چلتے چلتے میں نے گاؤں کے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ کون فوت ہوا ہے؟

اس کی زبان سے مرنے والے کا نام سن کر میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔۔۔۔۔ اس لئے کہ وہ جنازہ ٹریا کا تھا۔ میری آنکھیں دکھ اور وردی شدت سے بھر آئیں۔ میں نے اس کی نماز جنازہ میں بھی شرکت نہ کی اور تھکے تھکے سے قدموں سے اپنی بہن کے گھر آ گیا۔ بہن رشیدہ نے بتایا کہ ٹریا میں دن قبل بیمار ہوئی تھی۔ اس کی بیماری کسی کی سمجھ میں ہی نہ آتی تھی اس کے پورے جسم میں درد نہیں اٹھتی تھیں اور وہ زور زور سے روئی اور جھنجھکیاں دیتی تھی۔ اس کے باپ نے اس کا بہت علاج کرایا شہر میں بڑے اسپتال بھی لے کر گیا۔ مگر اسے کہیں سے بھی آرام نہ ملا۔ بالآخر وہ آج رات مر گئی کسی نے بھی اس کی بیماری نہیں پکڑی کہ اسے چلتے پھرتے کیا ہو گیا ہے بیماری آنا فنا ہی آئی اور اسے موت کے منہ میں لے گئی۔

مگر میں جان گیا تھا کہ ٹریا کیوں اور کیسے مری؟ میں نے گنگا رام کے بتائے ہوئے عمل میں غلطی کر ڈالی تھی اگر میں بیس دن کے بعد ملنے آ جاتا تو آج ٹریا کا جنازہ نہیں بلکہ اس کی ڈولی اٹھتی۔ مگر اب کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا میں اپنے آپ کو ٹریا کا قاتل سمجھنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں مجھے ایک سکون اور اطمینان کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ اگر ٹریا میری نہیں ہو سکی تو کسی اور کی بھی نہیں ہو سکتی۔ میں مزید گاؤں میں نہ

رکا اور اسی شام واپس شہر لوٹ آیا۔ جب میں نے برکت کو ٹریا کی موت کی خبر سنائی تو وہ بھی افسردہ ہو گیا یوں ہی ایک ماہ گزر گیا۔۔۔۔۔ میں ایک روز گنگا رام کو خط لکھا اور اسے تمام حالات بتائے۔ گنگا رام نے جوابی خط میں مجھے ڈانٹ پلائی کہ تم نے مجھے قاتل بنا دیا ہے میں اپنے آپ کو ٹریا کا مجرم اور قاتل سمجھنے لگا ہوں اور یہ کک میں تمام عمر محسوس کرتا رہوں گا اس سانحہ کے ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو۔ اگر تم عمل میں غلطی نہ کرتے

تو آج ثریا تمہاری ہوتی مگر تم نے میری ساری محنت اور عبادت پر پانی پھیر دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں اس جرم کی سزا دوں اور تمہاری تمام عمر شادی نہ ہو سکے مگر نہ جانے کیوں مجھے تم پر رحم اور ترس آ رہا ہے شاید اس لئے کہ تم بد صورت ہو کوئی عورت تمہاری زندگی میں خوشی اور مرضی سے نہیں آئے گی۔ تم نے میری خدمت بھی کی ہے لہذا تمہاری پہلی غلطی مجھے کرمعاف کر رہا ہوں اور مزید ایک عمل بتا رہا ہوں جو نہایت ہی آسان سا ہے۔ میں اس لفافے میں تھوڑی سی راکھ ڈال کر بھیج رہا ہوں۔ اب تم جس لڑکی سے شادی کرنے کے خواہش مند ہو گے یہ راکھ کسی بھی طریقے سے اس کے کھانے میں ملا دینا تمہارے من کی مراد ضرور پوری ہو جائے گی یہ نہایت ہی آسان عمل ہے امید ہے کہ اب تمہیں ناکا کی کام نہیں دیکھنا پڑے گا۔

گنگا رام کے خط اور اس کی مہربانی سے میرے من کے مرجھائے ہوئے پھول پھر سے کھل اٹھے اور منزل ایک بار پھر قریب اور آسان دکھائی دینے لگی۔ خط پڑھنے کے بعد مرادھیان فوراً ہی جیلہ کی طرف گیا میں نے اس کے بارے میں سوچا۔ مگر اسے حاصل کرنا نہایت ہی مشکل بلکہ ناممکن کام تھا۔ اس لئے میں نے کسی اور کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ میں نے گنگا رام کی بھیجی ہوئی راکھ اپنی جیب میں رکھ لی کہ مجھے جب بھی اور جہاں کہیں بھی موقع ملا۔ میں اپنا کام دکھاؤں گا۔ اب مجھے کسی مخصوص لڑکی سے غرض نہ تھی۔ غرض تھی تو صرف یہ کہ کہیں بھی اور کسی سے بھی میری شادی ہو جائے۔

مزید ایک ماہ گزر گیا تھا۔ ایک شام میں اپنے مکان میں اکیلا تھا ہرکت کی کام سے بازار گیا ہوا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے جیلہ کا چھوٹا بھائی کھڑا تھا۔ اور پریشان سا لگ رہا تھا۔ میرے پوچھنے سے قہقہہ ہوا۔ ”بھائی جان! ای بیمار ہیں الو گھر میں نہیں ہیں ای کو اسپتال لے کر جاتا ہے۔ آپ اس سلسلہ میں ہماری مدد کریں۔“

”کیوں نہیں..... چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے دروازے کی باہر سے کنڈی لٹائی اور اس کے ہمراہ اس کے گھر کی طرف چلا پڑا۔ پھر میں اس کی ماں کو کچنسی میں بٹھا کر اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے ان کو چیک اپ کیا اور ان کو اسپتال میں داخل کر دیا۔ کچھ اودیا ڈاکٹر نے لکھ دیں کہ یہ باہر سے لے آئیں۔ میں نے مطلوبہ اودیا لاکر اور جیلہ کو ان کے پاس ہی چھوڑ کر واپس آ گیا اور جیلہ کے گھر جا کر اس کے بہن بھائیوں کو کھلی دی کہ ان کی ماں جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر میں پانی پینے کے بہانے کچن میں چلا گیا۔ ایک ہانڈی میں سامان پڑا ہوا تھا۔ میں نے گنگا رام کی دی ہوئی راکھ تھوڑی سی مقدار میں ہانڈی میں ڈالی اور گھروٹ آیا۔

دو دن بعد جیلہ کی ماں صحت یاب ہو کر گھر آ گئیں وہ لوگ میرے احسان مند تھے کہ میں نے مشکل وقت میں ان کی مدد کی۔ یوں ان لوگوں سے سلام دعا شروع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی گنگا رام کی بھیجی ہوئی راکھ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ جیلہ خود ہی میری طرف راغب ہوئے لگی اس کے گھر کے سب ہی افراد میرے گرویدہ ہو گئے اور جیلہ کی نہ کی بہانے میرے سامنے آ جاتی اور مجھ سے بات بھی کر لیتی۔ اس روز میں بہت ہی خوش ہوتا آئینے کے سامنے جا کر اپنا بھدا چہرہ دیکھتا روزانہ شیو بناتا اور بالوں کو سنوارتا خوشبوئیں بھی لگاتا۔ یوں لگتا جیسے منزل نزدیک آ گئی ہے میری زندگی میں بہار کا موسم آ گیا ہے پھر ایک روز میں جیلہ کے ماں باپ کو اپنے مکان میں داخل ہوتے دیکھ کر ششدر رہ گیا..... انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے مجھے جیلہ کے ساتھ شادی کرنے کی پیشکش کر ڈالی..... اب مجھے یقین ہو گیا کہ گنگا رام کی بھیجی ہوئی راکھ اپنا کام دکھا رہی ہے..... میں نے جان بوجھ کر انکار کرنا چاہا تو وہ دونوں میری نہیں کرنے لگے اور التجائیہ میں کہنے لگے۔

”ہم تو جیلہ کی خاطر تمہارے پاس سواری بنا

کر آئے ہیں اگر تم نے انکار کر دیا تو جیلہ زندہ نہ رہے گی وہ اپنی زندگی ختم کرے گی وہ ہر وقت تمہاری ہی باتیں کرتی ہے اس کے لبوں پر ہر وقت تمہارا ہی نام رہتا ہے وہ تمہاری دیوانی ہو گئی ہے اس لئے اب تم انکار نہ کرنا..... شادی کے بعد ہم تمہیں اپنے گھر رکھیں گے اور تمہیں کاروبار بھی کرانیں گے۔

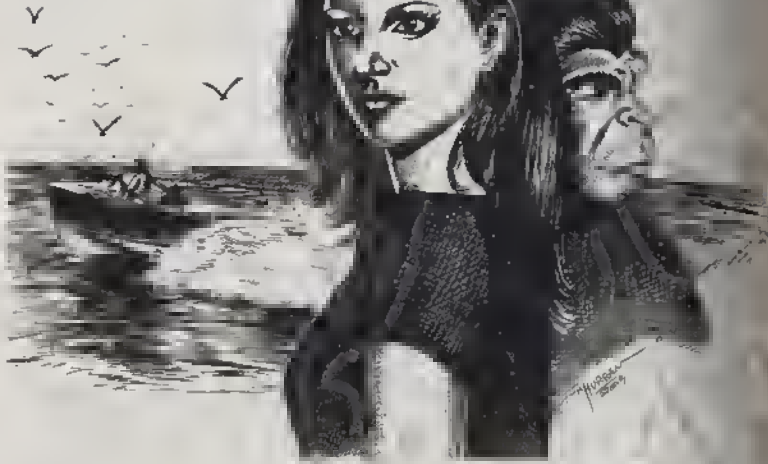
میں نے مزید نہیں نہ کر دیا میں اور رضامندی کا ہر کردی..... یوں جیلہ سے میری شادی ہو گئیں وہ میری زندگی کا یادگار اور سنہرا دن تھا۔ مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی وہ میری اور جیلہ کی زندگی کی پہلی رات تھی جو مجھے ابھی تک یاد ہے..... جیلہ بہت ہی حسین لگ رہی تھی وہ عرصی بیج پر یوں بیٹھی تھی جیسے کسی یونانی نقاش کے ہاتھوں سے تراشیدہ ویش کا مجسمہ ہو۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک سے جلتی رنگ سانج اٹھا تھا رخسار حیا کی آگ سے دھک رہے تھے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جاووقا وہ سراپا خمار اور ہمہ تن کیف تھی۔ اس کی رنگوں میں خون نہیں شراب و دہری تھی۔

ہماری ازدواجی زندگی نہایت شاعرانہ اور پرسکون گزرنے لگی۔ جیلہ نے میری ساری تنگی ملاؤں سے اتنی حسین ہونے کے باوجود مجھ جیسے بد صورت مرد کے ساتھ بے حد خوش تھی۔ وقت گزرتا رہا ہم دونوں کے والدین بن گئے میں نے ملازمت چھوڑ دی تھی اور کاروبار شروع کر لیا تھا اپنا گھر بھی بنالیا تھا جیلہ کے والدین نے اپنا وعدہ نبھایا تھا زندگی نہایت ہی پرسکون اور شاعرانہ گزری تھی..... کہ میری زندگی میں پھر ایک طوفان آیا اور میں پھر سے اندھیروں میں پھنسنے لگا۔

جب سے ہم اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ جب سے ہمارا سکون عارت ہو گیا تھا۔ گھر کے فرش پر اچانک ہی خود بخود آگ بھڑک اٹھی تھی جس سے گھر کی کئی قیمتی چیز بھی جل کر راکھ ہو گئی تھیں کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ آگ خود بخود کیسے لگ جاتی ہے۔ میں نے اس معاملہ میں سب سے پہلے گنگا رام سے

رابطہ کیا۔ اسے کئی خطوط لکھے مگر اس کی طرف سے کسی بھی خط کا جواب نہ ملا۔ تو میں نے خود ہندوستان جانے کا پروگرام بنایا کیونکہ میں اپنے کسی عامل سے رجوع نہیں کرنا چاہتا تھا میں نے اسلام آباد جا کر ہندوستان کے سفارت خانے سے وہاں کا ویزا لگوا دیا اور ہندوستان روانہ ہو گیا میں مدراس گنگا رام کے دیئے ہوئے پتے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ گنگا رام تو فوت ہو گیا ہے مجھے اس کی موت کا بہت ہی دکھ ہوا۔ میں نے اپنے مسئلہ کے سلسلہ میں کئی اور سادھوؤں سے رابطہ کیا۔ مگر ہر کسی نے جواب دیا کہ ہم خود گنگا رام کے شاگرد ہیں اس کے بتائے عمل کا توڑ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس معاملہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ میں ہر طرف سے ناکام و نامراد ہو کر واپس وطن لوٹ آیا۔ یہاں آ کر میں اپنے وطن کے عاملوں کے آگے ہاتھ پھیلائے کہ وہ اس سلسلہ میں میری مدد کریں اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلانیں ہر ایک نے مجھے کوئی نہ کوئی عمل بتایا اور روپے بونے مگر مجھے اس اچانک بھڑک اٹھنے والی آگ سے پھر بھی نجات نہ مل سکی بلکہ اب تو اکثر ایسا ہونے لگا کہ کبھی جیلہ کا دوپٹہ آگ پکڑ لیتا اور کبھی اس کے بستر کو آگ لگ جاتی جس پر وہ سوئی ہوئی ہوتی تھی۔ میرے بچے اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے اس گھر میں رہنے سے انکار کر دیا اور نانا نانی کے پاس جا کر رہنے لگے۔ ان واقعات نے مجھے دیوانہ سا بنادیا۔ میں بے بس ہو گیا۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو رہا تھا۔ پھر ایک دن میری دکان میں بھی آگ لگ گئی اور دکان کا سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اور اس آگ سے کس طرح نجات حاصل کروں؟ میں یہ تو محسوس کرنے لگا تھا اور جان گیا تھا کہ یہ آگ میرے کرتوتوں اور گناہوں کا نتیجہ ہے..... میں نہ نماز پڑھتا تھا اور نہ ہی اللہ کو یاد کرتا تھا۔

ایک روز میں نے نہایت پریشانی کے عالم میں کسی عالم کی تلاش میں سڑک پر جا رہا تھا کہ ایک مجرب و



موت کا گھر

ایس امتیاز احمد - کراچی

نوجوان کا جسم اچانک برف کی طرح سرد ہو گیا۔ سامنے کھڑی عجیب الخلق مخلوق اپنے لمبے اور نوکیلے دانت کچکچاتے ہوئے نوجوان کی طرف بڑھی کہ پھر چشم زدن میں نوجوان کو جیسے ہوش آگیا اور اس نے اوپر سے چھلانگ لگادی۔

رات کے اندھیرے میں خیمے والی دل و دماغ کو بہت کرتی ایک ناقابل فراموش کہانی

ڈاکٹر پال اس رات کو کافی دیر سے سوئے تھے۔ دن بھر ان کے کلینک میں مریضوں کا تاحنا بندھا رہتا اور انہیں دم لینے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ لیکن اب ساڑھے چار بجے اچانک ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انہوں نے سنا کہ صدر دروازے کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے سورج کے طلوع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی اور چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس

وقت نرم گرم بستر سے نکلتا ڈاکٹر پال کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ اپنے ملازم کو کونے لے جوا یک دن قبل کوئی بہانہ کر کے اسے گاؤں چلا گیا تھا۔ ”پتا نہیں کون تم بخت میری نیند حرام کرنے پر تلا ہوا ہے جہنم میں جائے۔“ انہوں نے بڑبڑا کر کہا اور لحاف اپنے اوپر لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے مگر اب گھنٹی بجانے والا دروازہ پینے لگا تھا۔ کئی منٹ

نے برسوں بعد نماز باجماعت ادا کی اور گھر لوٹ آیا۔ میں اس مجذوب کو کبھی بھول چکا تھا لیکن جیسے ہی میں گھر کے دروازے پر پہنچا اسے منتظر پایا۔ اس نے میری چونچ تھپتھا کر کہا۔

”تیرا خالق لامحدود قوتوں کا مالک ہے۔ شیطان وقتی طور پر گمراہ کرتا ہے لیکن بلا آخر اسے شکست ہوتی ہے اپنی نفسانی خواہشات کے لئے تو نے شیطان کی پناہ چاہی اور من کی مراد پائی مگر یہ مراد تجھے زندگی بھر کے لئے اذیت میں مبتلا کر گئی ہے تو اب ہر وقت اپنے رب سے معافی مانگتا رہ شاید اس رب جلیل کو تجھے پرہیز آجائے اور ایک معصوم کو درغلا کر اپنے دام میں پھنسانے کی سزا سے توبہ جانیے بے شک وہ رب جلیل بڑا ہی رحیم و کریم ہے جب سے میں نے نماز شروع کی تو مجھے اس آگ سے نجات مل گئی جو اچانک بھڑک اٹھتی تھی لیکن اس دوران میں..... میں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ جیلہ کی جاہت میں اب وہ گرجوئی نہیں رہی۔ اب وہ ہر وقت کھوٹی کھوٹی سی رہنے لگی معلوم نہیں کہ وہ کس سوچ میں ڈوبی رہتی۔

مگر میں یہ جان گیا..... کہ اس پر سے اب میرا سحر ٹوٹ گیا ہے اسے میری بد صورتی اور اپنی خوبصورتی کا احساس لگتا رہتا تھا اس کا یہ انداز میرے لئے پشیمانی کا سامان تھا..... اس نے مجھ سے بات کرنی چھوڑ دی اور گرم سم رہنے لگی۔ اور پھر ایک دن وہ میرا گھر چھوڑ کر چلی گئی اور آج تک واپس نہیں آئی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے زندہ ہے یا مر گئی ہے؟ میرا غم ناقابل فراموش ہو چکا ہے میں پل پل مرتا اور جیتا ہوں خون جگر کی آنکھوں سے بہتا رہتا ہے، نماز پڑھ کر اللہ کے حضور زور و شور سے گڑگڑاتا ہوں تاکہ میرے گناہ و مل جائیں۔ پتا نہیں میرے گناہ و مل جائیں گے یا نہیں.....؟ آپ سب بھی میرے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری خطاؤں کو معاف کر دے۔



سے دیوانے نے میرا راستہ روک لیا۔ اور غصے سے بولا۔ ”اوبد بخت! تو اپنے گناہوں سے توبہ کیوں نہیں کرتا؟“ جو کچھ مانگتا ہے اللہ سے مانگ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اس کے سامنے سر جھکاؤ بڑا رحیم و کریم ہے۔“

پتہ نہیں کہ میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے بھری بھری سڑک پر اس کے پاؤں پکڑ لئے اور رو کر فتیس کرنے لگا رہ چلے لوگ ٹھک گئے اور رک کر میرا تماشا دیکھنے لگے۔ میں مجذوب کے پاؤں پکڑے فتیس کر رہا تھا کہ وہ مجھے اس بلائے نامگہانی سے نجات دلائے۔

جب کافی وقت گزر گیا تو اسے رحم آگیا اور اس نے کہا..... ”چل بد بخت“

میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ کچھ دوری پر ایک مسجد کی اس مسجد کے نزدیک پہنچ کر اس نے کہا۔ ”اوسے بد بخت جا وہاں مل ہے پہلے نہا اور وہیں طالع پڑھ کر پڑھے ہوں گے انہیں جہنم لے پھر خدا کے حضور جھک کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ وہ رحیم و کریم ہے سچ و کبیر ہے وہ تیری دعاؤں کو ضرور سنے گا تیری معافی قبول کرے گا۔ جا! اب دیر نہ کرورنہ تو بھی اس انجانی آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔

میں تیر کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ نہا دھو کے نئے کپڑے پہنے۔ جو نہ معلوم کس کے تھے، مگر میرے جسم پر فٹ آ گئے تھے۔ میں نے نماز پڑھی۔ ابھی میں صورۃ فاتحہ کی تلاوت کر رہا تھا کہ مجھ پر شدید رقت طاری ہو گئی۔ میں نے بہ ہزار وقت نماز تمام کی اور سلام پھیرنے کے بعد پھر سجودے میں گر گیا۔ اس وقت میری زبان پر ایک ہی الفاظ تھے۔ ”ایاک نعبد وایاک نستعین پتہ نہیں میں نے اس آیت کو کتنی بار روہرایا مجھے ہوش تب آیا۔ جب ایک بار لیں شخص نے میرے کندھے کو پکڑ کر بلایا اور بتایا کہ ظہر کی اذان ہونے والی ہے تب مجھے احساس ہوا کہ میں دو گھنٹے سے سجودے میں پڑا ہوا ہوں۔ مصلیٰ میرے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ میں

گزر گئے مگر وہ بدستور دروازے کو بیٹھا رہا۔ اور جب ڈاکٹر پال کو یقین ہو گیا کہ دستک دینے والا آسانی سے نکلے والی آسانی نہیں تو غصے میں وہ بستر سے نکلے اور ڈریسنگ گاؤں پہن کر لڑکھڑاتے ہوئے صدر دروازے تک گئے۔

دروازہ کھول کر انہوں نے جونہی باہر تاریکی میں جھانکا تو ایک شخص جھٹ سے اندر آ گیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹنی لگادی پھر اس نے لڑتے ہوئے ہاتھوں سے ڈاکٹر کا بازو پکڑ لیا۔ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ چھڑا چاہا مگر اس کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ اس مکان میں ایک ڈاکٹر رہتا ہے جس کا نام پال ہے۔ کیا تمہارا یہی نام ہے؟ اگر تم ڈاکٹر نہیں تو خدا را مجھے ڈاکٹر پال کے پاس لے چلو۔“

ڈاکٹر پال نے جواب دینے سے پہلے اس پر اسرار انجی کا بطور جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر انہوں نے انجی کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کتب خانے میں لے آئے جہاں آتش دان میں اب بھی لکڑیاں جلی رہی تھیں اور کمرہ خاصا گرم تھا۔ انہوں نے ایک موٹی سی لکڑی آتش دان میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں مجھے ڈاکٹر پال کہتے ہیں۔“
”اوہ ڈاکٹر صاحب مجھے بتائیے کیا میں پاگل ہوں۔“

ڈاکٹر پال نے بھی اپنے اس بے وقت ملاقاتی کی طرف بغور دیکھا۔ اس کا طبع عجیب و غریب تھا۔ سر کے بال گرد آلود اور الجھے ہوئے تھے۔ کپڑے پھٹ کر تار تار ہو چکے تھے اور چہرہ خون سے تر تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس آواز میں کپکپاہٹ اور خوف کا عنصر نمایاں تھا۔ ڈاکٹر نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے اس سے بیٹھنے کے لئے کہا جس پر انجی دھپ سے بیٹھ گیا۔ ”تم زخمی بھی ہو اور حواس باختہ بھی ٹھہرو۔ ابھی کچھ دیر بعد تمہاری داستان

سمتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے الماری کھولی اور برائٹی کا ایک بھر کر انجی کو دیتے ہوئے کہا۔ ”لو پہلے اسے لو۔“ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس ختم کر لیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے اوسان بحال ہونے لگے، چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی آخر انجی نے داستان اس طرح شروع کی۔

”میراثم فریک میٹھون ہے اور میں لندن رہنے والا ہوں، میرا پیشہ نوکر گرافی ہے اور میں براؤن اینڈ بلیک کمپنی میں ملازم ہوں کمپنی کے کام سے مجھے علاقے میں چند تصویریں لینے کے لئے آنا پڑا تھا علاقے میں قطعی نا افاق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چند روز سے مختلف دیہاتوں میں بھٹکتا پھرتا رہا ہوں لیکن مجھے اپنی مطلوبہ تصاویر لینے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر میں نے دور کٹکٹن اور وائٹ ہیون اضلاع کا دورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا ارادہ وائٹ ہیون کے بہترین رائل ہوٹل میں قیام کرنے تھا۔ چنانچہ گزشتہ رات میں اپنی موٹر سائیکل پر چکر دوڑا ہوا۔ یہ تمام راستہ ویران اور دلدلی میدانوں میں مشتمل تھا۔ رات بھی بہت تاریک اور سرد تھی مگر میں دھن میں برقی رفتار سے موٹر سائیکل اڑاتے دھن ہیون کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اچانک موٹر سائیکل رفتار خود بخود دھیمی پڑنے لگی۔

اور تھوڑی دور آگے جا کر موٹر سائیکل بالکل ٹھپ ہو گئی۔ میں نے موٹر سائیکل سے اتر کر اس کی چیک کیا اور یہ معلوم کر کے میرا دل دھک سے رہ گیا کہ پیٹرول کی ٹینکی تقریباً خالی ہو چکی ہے تلاش کرنے پر ٹینکی کے پمپ سے میں ایک ننھا سا سوراخ پایا جو میں سے پیٹرول ٹپک ٹپک کرتا رہا راستے گرتا آیا تھا میں نے جلدی سے ایک جیوگم چبا کر سوراخ پر لگا دیا تاکہ جو تھوڑا سا پیٹرول بچ رہا ہے وہ ضائع نہ ہو۔ میری بدقسمتی دیکھنے کے فائدہ پیٹرول کا ڈبا جو میں سفر میں ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں بالکل خالی تھا حالانکہ

نے کیراج والوں کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ڈبا پیٹرول سے پر کر دیں۔ مگر غائبانہ بھول گئے تھے۔ خیر میں نے دوبارہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی میں جلد از جلد اس وحشت ناک علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا مگر کیا معلوم قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی بٹھکل وافر لنگ ہی چلتا تھا کہ موٹر سائیکل نے جواب دے دیا۔ مجھے جو پریشانی اور وحشت ہوئی اس کا آپ صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میرے اندازے کے مطابق نزوی کی گاڑی کم از کم چھ میل دور تھا۔ میں نے جیسی گھڑی نکال کر دیکھی، ریڈیم ڈائل کی چمکتی ہوئی سوئیوں نے مجھے بتایا کہ رات کے دس بجے ہیں چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ہوائیں خنکی لہ لہ رہتی جاری تھیں۔ میں نے اپنے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پناہ لینے کیلئے کوئی مکان یا کسی دیہان کی جھونپڑی کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس قدر دھولناک سناٹے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے یہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ دھند کا ایک گہرا بادل مجھے اپنے حلقے میں لینے کے لئے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔

یہاں تک پہنچ کر فریک میٹھون نے چند لمحوں تک وقف کیا اور پھر بولا۔
مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دھند کو دیکھ کر میری وحشت اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف دھشت زدہ کر دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے میں صدیوں پرانے قبرستان میں گھڑا ہوں اور پھر دھند نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میری طاقت جیسے کسی نادیہ قوت نے سلب کر لی۔ یقین کیجئے ڈاکٹر صاحب میں اتنا بزدل نہیں ہوں اور نہ ہی میرے اعصاب اتنے کمزور ہیں لیکن اس دھند میں پھنس کر مجھے یہ یقین ہو رہا تھا کہ اس میں کسی نادیہ قوت کا دخل ہے پھر میں نے اپنے شانوں پر ایک زبردست دباؤ محسوس کیا اور مجھے یوں لگا جیسے یہ قوت

مجھے آگے بڑھنے کے لئے مجبور کر رہی ہے، میں نے جلد جھد کی کر کے نہ جاؤں مگر میری ایک نہ چلی۔ کسی سرزدہ انسان کی طرح میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آگے خادار جھاڑیوں کے درمیان مجھے ایک وسیع شگاف دکھائی دیا۔ اور جونہی میں شگاف میں داخل ہو کر دوسری جانب نکلا میرے شانوں پر رکھا ہوا ناقابل برداشت بوجھ اتر گیا میں نے دیکھا کہ وہ گہری دھند جسے دیکھ کر مجھ پر دھشت طاری ہو گئی تھی آہستہ آہستہ فضا میں ٹھیل ہو رہی ہے اور پھر اچانک مجھے اس دیرانے میں ایک مکان دکھائی دیا۔ یہ ایک سرائے کی طرز کا قدیم مکان تھا جس کے چاروں طرف خود رو جھاڑیاں اور لمبی گھاس بکثرت اگی ہوئی تھی۔ سرائے چونکہ بہت قدیم تھی اس لئے اس کی دیواروں کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا یا ممکن ہے تاریکی میں مجھے سیاہ نظر آیا ہو بہر طور بے بسی اور مجبوری کے عالم میں یہ مکان مجھے بہت بڑا سا نظر آیا۔

مجھے یقین تھا کہ یہ مکان ضرور آباد ہوگا۔ بلاشبہ رات کا بیٹ بیت چکی تھی مگر پھر بھی مکان کا مالک یا جو کوئی بھی اس میں رہتا ہے، انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت میرے لئے دروازہ کھولے میں کوئی ناراضگی محسوس نہیں کرے گا اور عین ممکن ہے مجھے گرا گرم کھانا بھی کھلا دے، کھانے کا خیال آتے ہی میری بھوک چمک اٹھی اور چند منٹ پہلے مجھ پر خوف و دھشت کی جو کیفیت طاری ہوئی تھی رفتہ رفتہ دور ہو گئی انسان کی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔

قریب پہنچ کر اس عمارت کے دھندلے نقش مجھے واضح طور پر دکھائی دینے لگے، عمارت کے بڑے سے دروازے پر کچھ لکھا ہوا تھا جو میں کوشش کے باوجود نہ پڑھ سکا۔ عمارت کے چاروں طرف وہی پر اسرار دھند چھیلی ہوئی تھی لیکن یہ دھند اپنی جگہ بالکل ساکت تھی۔

جی کڑا کر کے میں نے دروازے پر زور سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا مگر اندر سے کوئی جواب نہ

انمول باتیں

☆ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے لیکن یہ وعدہ نہیں کیا کہ وہ ہر ایک کو بخش دے گا۔ پھر ہم کیوں رزق کے لئے فکر مند ہیں اور مغفرت سے بے پرواہ۔۔۔؟

☆ قسمت آپ کے ہاتھوں میں نہیں لیکن کام آپ کے ہاتھ میں ہے۔ قسمت آپ کا کام نہیں سنوار سکتی لیکن کام قسمت سنوار سکتا ہے۔

☆ جب آپ روشنی میں ہوں گے تو ہر چیز آپ کے پیچھے چلے گی لیکن جب آپ اندھیرے میں داخل ہوں گے تو ہر چیز جتنی کہ آپ کا سایہ بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ یہی زندگی ہے۔

☆ انسان کے اعمال ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ نیک نیتی سے کی جانے والی کوششیں کبھی ضائع نہیں ہوتیں۔ جو شکوہ کرتا ہے وہ اللہ کی تقسیم پر راضی نہیں۔

☆ غیبت کرنے سے صرف اس بندے کو قاعدہ ہوگا جس کی غیبت کی جائے۔ کیونکہ اس سے اس کی نیکیاں بڑھیں گی اور غیبت کرنے والی کی کم ہوں گی۔

☆ حاسد اپنے سوائے کسی کا نقصان نہیں کرتا۔ ناکامی کی وجہ نقد نہیں۔ ہڈ حرامی بد نیتی اور بے عملی ہوتی ہے۔

(نوشین خان - کوٹ مظفر علی)

میں داخل ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سفید چہرے والا شخص کدھر کو چلا گیا البتہ عورت نے مجھے اپنے پیچھے پچھے آنے کا اشارہ کیا اور پہلی منزل کے ایک کمرے میں لے گئی۔ میں نے دیکھا کہ چلتے ہوئے اس کے پیروں سے ہلکی سی آہٹ بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

یہ مکان دو منزلہ تھا اور اس میں کئی بڑے بڑے کمرے تھے مجھے وہ جس کمرے میں لے گئی غالباً سو نے کا کمرہ تھا۔ کیونکہ کمرے کے ایک کونے میں ایک آرام دہ بستر موجود تھا۔ عورت کمرے میں داخل نہیں ہوئی بلکہ دروازے پر ہی رکی گئی۔ اس کے لیوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس نے سر کے اشارے سے رخصتی سلام کیا اور اوپریں مڑنے ہی والی تھی کہ میں نے اسے روک لیا اور پوچھا کہ کیا کھانے کے لئے کچھ مل سکتا ہے؟ مگر اس عورت نے نفی میں گردن کو جنبش دی اور بجائے افسوس ظاہر کر کے اس کے سرخ سرخ لبوں پر مسکراہٹ کچھ اور زیادہ ہو گئی یہاں تک کہ مجھے اس کے سفید سفید چمکیلے دانت دکھائی دیئے جو غیر معمولی طور پر لمبے اور نوکیلے تھے پھر اس نے دروازہ بند کیا اور چلی گئی۔

اب میں کمرے میں تنہا تھا میں نے چاروں طرف بخور دیکھا یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ہاتھ مندر ہونے کے لئے ایک سنگ بنا ہوا تھا۔ جس کے قریب ہی چند تولیے لٹک رہے تھے جنوبی دیوار کے ساتھ پرانی طرز کی کرسیاں بھی ایک قطار میں رکھی ہوئی تھیں اور اس کے مقابل کی دیوار کے ساتھ ہی لکڑی کی بنی ہوئی ایک بے حد مضبوط اور بھاری الماری کھڑی تھی۔ کمرے کی مغربی دیوار کے کونے میں ایک ہی کھڑکی تھی جو مجھے بند دکھائی دی۔ اور اسی طرف وہ دروازہ تھا جس سے میں اندر داخل ہوا تھا۔

بستر کے قریب ہی ایک نہایت وزنی اور کٹی فٹ اونچا لیپ بھی رکھا ہوا تھا جس پر گرو کی موتی نہیں جھی ہوئی تھیں۔ اس کی زرد رنگ کی روشنی میں کمرے کی یہ تمام چیزیں مجھے وحشت کی سی نظر آرہی تھیں۔ مشرقی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ مجھے دکھائی دیا جس میں قفل لگا

کہ اس شخص کے چہرے پر نہکھنویں تھیں اور نہ آنکھیں۔ اس عجیب و غریب آدمی کے پیچھے ایک بے حد خوبصورت اور جاذب نظر عورت قدم طرز کا کچھ دان ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ مرد جتنا بھدا اور بد صورت تھا عورت اتنی ہی حسین اور دلکش تھی، اس کا سر میں جسم سڈول اور کافی اشتعال انگیز تھا اور سفید و سیاہ آنکھیں جن میں جھیل کی سی گہرائی تھی بے پناہ چمکیاں تھیں۔ سیاہ لباس میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

مگر ان سب چیزوں کے باوجود اس کے چہرے پر ایک ایسی چیز بھی تھی جسے دیکھ کر میرے دل میں اس کے لئے شدید ترین نفرت اور کراہت کے جذبات پیدا ہو گئے نہ جانے کیوں؟ اس کے ہونٹ پتلے پتلے تراشیدہ ہونٹ، کبوتر کے خون کی مانند سرخ تھے جیسے وہ ابھی کسی کا خون پی کر آئی ہو۔ مجھے دیکھتے ہی اس عورت کی آنکھیں تارے کی مانند چمکنے لگی تھیں۔ میں نے ان سے اپنا حال بیان کیا اور ایک رات کے لئے پناہ لینے کی درخواست کی جب میں چپ ہوا تو ایک لمحہ انتظار کے بعد بغیر آنکھوں اور ہنسون والے پراسرار شخص نے اپنی لمبی لمبی سفید انگلیاں آگے بڑھائیں اور میرے چہرے کو ٹٹولنے لگا۔ شاید وہ میرے چہرے کے خدو خال سے یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ آیا میں کوئی بد معاش تو نہیں اور پھر اس عورت نے جبکہ کمرہ کے کان میں آ سکتی سے کہا۔ ”کافی ہے اسے اندر آنے دو۔“

میں نے اس کا یہ فقرہ سن لیا مگر اس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آ سکا فوراً ہی مرو نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اگرچہ میں اس مکان کی ہیئت اس میں رہنے والے ان دو افراد کی شکل و صورت لباس اور انداز گفتگو سے کسی قدر سراسیمہ ہو گیا تھا لیکن اب میرے لئے مکان میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بصورت دیگر میں اپنے آپ کو اس دیران دلدلی علاقے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا اور راہ گیر صبح میری اکڑی ہوئی لاش پاتے۔

بہر حال اپنے آپ کو ہمت دلاتا ہوں مکان

آیا تب میں نے دروازے کو کئی مرتبہ کھٹکھٹایا۔ اب میں اپنے گرد و پیش کی چیزیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ شاندار عمارت کا مالک یا تو نہایت لاپرواہ شخص ہے یا اسے اپنے مکان سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اس کی حالت درست کرنے پر توجہ دے اور دفعہ میری نگاہ عمارت کے اوپر لگے ہوئے ایک سفید پتھر پر گئی جس پر چند الفاظ کندہ تھے، پہلے میرا خیال تھا کہ شاید اس پر سرائے کا نام لکھا ہوا ہے لیکن اب بخور دیکھنے پر پتا چلا کہ اس پر عجیب مستحکم خیز الفاظ لکھے ہیں۔

”آپ کا سفر یہاں ختم ہوتا ہے۔“

ان احقانہ الفاظ کا مطلب میری سمجھ میں نہ آ سکا میں کافی دیر تک ان الفاظ پر غور کرتا رہا اور پھر اچانک میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کوئی مکان کے اندر چل رہا ہو۔ پھر دائیں ہاتھ کی اونچی کھڑکی کی درازوں میں روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں مجھے دکھائی دیں اور فوراً ہی یہ روشنی غائب ہو گئی غالباً کوئی شخص دروازہ کھولنے آ رہا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ درنگ دینے والا لوٹ گیا وہ روشنی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوگا۔ لیکن پھر میرے کانوں میں مکان کے اندر کسی کے آہستہ آہستہ چلتے پھرنے کی آواز آئی۔ آہستہ آہستہ یہ آہٹ مکان کے اندر وہی جیسے سے دروازے کی طرف آئی۔ پھر میں نے دروازے کی آہنی زنجیر کی کھڑکھٹاہٹ سنی اور پھر لکڑی کا بنا ہوا بلند بالا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

سامنے ہی مجھے ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سردی لہر سرایت کر گئی۔ میں بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ وہ پسندیدہ اور چوڑے چمکے شانوں والا مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس کا گول مٹول چہرہ دودھ کی مانند سفید اور چمکدار تھا۔ سچی کھوپڑی اندھیرے میں سفید انڈے کی طرح چمک رہی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا لباس چاند زیب تن کر رکھا تھا۔ مگر ان تمام عجیب باتوں کے علاوہ جس چیز نے میرے جسم پر لرزہ طاری کر دیا تھا وہ یہ تھی

بدستور چل رہا تھا۔ میں نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی پورے بارہ بجے تھے اور صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے میں بستر پر لیٹ گیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

مسمری کے ادھر چھت پر ایک بہت بڑا سائبان لگا ہوا تھا جیسا کہ پرانے زمانے میں بستر کی خوبصورتی کے لئے استعمال ہوتا تھا میں بستر پر لیٹا اس خوبصورت سائبان کو دیکھنے میں خوش تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک ایسی شے پر پڑی جسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ کراہت ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی مڑی مڑی جس نے میرے سر کے عین اوپر سائبان کے درمیان لگی ہوئی ایک لمبی اور ٹوکیلی ایسی سلاح نے لیکر مسمری کے ایک کونے تک اپنا وسیع جال اتان رکھا تھا، میرا خیال تھا کہ سائبان کے درمیان لوہے کی یہ ٹوکیلی سلاح شاید لائین یا بیس وغیرہ کے ٹکڑے کے کام آتی ہوگی۔ مڑی اب جالے کے عین درمیان میں بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اسے ٹھٹکی باندھے دیکھا رہا یہاں تک کہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور پھر چند لمحوں بعد نیند نے مجھے آگھیرا۔

دفعتاً میری آنکھ کھل گئی اور مجھے یاد ہے کہ وہ بڑی مڑی اپنے جالے سے گر کر میرے دائیں گال پر آن پڑی اور پھر مڑکتی ہوئی گردن کی طرف بڑھی، وہ ہشت زدہ ہو کر میں ایک طرف اچھلا عین اس لمحے لوہے کی بھاری ٹوکیلی سلاح سنسناتی ہوئی ٹکلی اور بستر میں کھسک گئی اور ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ سلاح میرے سینے میں پیوست ہو چکی ہوتی مگر اس مڑی نے میری جان بچائی اور تب میں نے محسوس کیا کہ سائبان کے درمیان اس آنٹی سلاح کو لگانے کا اصل مقصد کیا ہے؟

واقعی کسی کوسوے میں تل کرنے کی اس سے بہتر ترکیب کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اس سلاح کا معائنہ کیا جو بستر میں گڑی ہوئی تھی۔ سلاح کی بناوٹ تیز و حدانیز کے انی سے مشابہت رکھتی تھی انی جب گری تو مڑی کا جالاوٹ گیا اور یقیناً مڑی کو پہلے سے چا چل گیا ہوگا کہ سائبان کی سلاح میں جنش ہو رہی

ہے اور پھر مڑی خوف زدہ ہو کر میری گردن پر آن گری اور میں نیزے کی انی سے ہلاک ہوتے ہوتے بچا۔ اب میں کمرے کے وسط میں کھڑا اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ دفعہ میں نے دروازے کے باہر قدموں کی دبی چاپ کی جو اس سے قبل میں دوسرے پہلے بھی سن چکا تھا جلدی یہ بلکی آواز غائب ہو گئی مگر کچھ دیر بعد ہی وہی آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز دیوار کے قریب سے آئی تھی جس کے ساتھ مسمری لگی ہوئی تھی۔ اور پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے دیوار کھرچی جارہی ہو اور اس میں سے کوئی چیز نکالی جارہی ہو اور پھر کوئی ٹھنڈا ہاتھ جانے کا کھٹکا بھی سنایا دیا۔

میں نے محسوس کر اس کی طرف دیکھا دیوار میں ایک چھوٹا سا شگاف ظاہر ہو رہا تھا۔ جس میں سے موسم بقی کی مدم اور رزنی ہوئی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر لیپ کوٹل کر دیا میں نے کوشش کی کہ دہشت سے اپنے اعصاب کو بچائے رکھوں پھر میں لپک کر اس شگاف کے اندر میں گھس گیا جہاں جاتے ہوئے میری روح فنا ہوتی تھی میں دروازے کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

دیوار والا شگاف آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا اور پھر وہ اتنا چوڑا ہو گیا کہ ایک آدمی اس میں سے بخوبی نکل سکتا تھا اور پھر مجھے دو ہاتھ دکھائی دیئے۔ بعدے بدلتا اور بچے جیسے ہاتھ جوشگاف کو ٹھول رہے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ بغیر آنکھوں والی کردہ اور غلیظ جو انسانی شکل میں تھی اندر داخل ہو گئی۔ چند سیکنڈ توقف کے بعد وہ آہستگی سے بستر کی طرف بڑھا اور پھر میں نے دیکھا کہ دیوار کے شگاف کے پیچھے وہی خوبصورت چڑیل ہاتھوں میں شمع دان لئے کھڑی ہے اس کی شیطانی آنکھیں دیکھتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ تھیں جنہیں دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔

آدی اب بستر کے قریب پہنچ چکا تھا چند لمحے بستر ٹھونکنے کے بعد وہ اندھا شیطان لمبی کی مانند غریباور پیچھے ہٹا اس کی آواز سن کر چڑیل بھی

اندراگئی اور اس اندھے شیطان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”جلدی کرو..... غسل خانے میں.....“ یہ سننے ہی وہ مڑا اور بے پاؤں غسل خانے کی طرف بڑھا اس مختصر سے عرصہ میں مجھے ہر قیمت پر اپنی بچائی تھی۔ میں نے جیت پریشی کی طرف دیکھا جہاں ایک بڑا سا شگاف تھا۔ برق رفتاری سے میں اوپر چڑھ گیا۔ شگاف اتنا بڑا تھا کہ میں تو مڑ کر اوپر چھت پر پہنچ سکتا تھا۔ اس شگاف تک پہنچنے پہنچتے میرا سانس پھول گیا اور میں ایک لمحہ دم لینے کے لئے رکا۔ نفس اندر اندر ایک سلسلہ مجھے اپنے تختوں میں گھٹاتا ہوا محسوس ہوا، اور پھر وہ مرد اور عورت غسل خانے میں داخل ہو گئے پہلے عورت نے ٹب میں چھانکا اور کمرسید کر کے کھڑی ہوئی اور اب میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا بھی تھا۔

اس عورت نے مجھے دیکھا اور بھیانک انداز میں قہقہے لگنے لگی۔ ”نیچے اتر دو چڑیل نے چلا کر کہا اس کمرے میں رہنے کا معاوضہ تمہیں ادا کرنا پڑے گا اور جب میں نے کوئی حرکت نہ کی تو اس کا وحشیانہ پن عود کر آیا۔ اس نے سب دان مروڑا تھا اور پھر میری باپ پر چڑھنے لگی۔ میں نے جلدی سے اپنا جسم سوراخ کے اندر داخل کر لیا اور پھر میں نے بغیر سوچے سمجھے چلا ننگ لگا دیا۔

اف خدایا! میں گوشت اور ہڈیوں کے ایک عظیم ڈھیر پر گر اٹھا۔ دس پندرہ لاشیں جن کے عضو عضو جدا تھے جالے کب سے پڑی سڑ رہی تھیں۔

میرے سامنے ایک تاریک راہداری تھی جس کے اندر میں اندھا حدود ڈوڑتا چلا گیا۔ عورت چینی چلائی ہوئی اب بھی میرے تعاقب میں تھی۔ میں لکڑی کے ایک ذہینے کے ذریعے دوسری منزل کی چھت پر پہنچ گیا تھا۔ اب میرے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔ خوبصورت چڑیل میری بے بسی سے ناکامہ اٹھا کر مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر رک کر وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے اور کپڑاؤں گھمانے لگی۔ میرا سارا جسم برف کی مانند سرد ہو گیا۔ وہ اپنے لیے نوکیلے سفید دانت

بیشی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ایک بلند بالا درخت کی چند شاخیں چھت سے دو تین فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رک گئی تھیں۔ میں نے دیوار پر ایک ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ایک شاخ پکڑ لی اور دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر بھجھ پڑی۔ اس نے کپڑاؤں گھائی اور دیوار پر رکھا ہو میرا ہاتھ تن ہو گیا۔ درخت کی شاخ میرا بوجھ نہ سنبھال سکی اور ٹوٹا خ سے ٹوٹ گئی۔ اور میں دھڑام سے جھاڑیوں پر گرا اور اٹھ کر پاگلوں کی طرح بھاگا اور ایک میل تک بھاگتا رہا آخر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جس مقام پر سرائے تھی وہاں آگ کے ٹھٹکے آسمان سے بائیں کر رہے تھے پوری عمارت ان شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔“

فرینک بیٹھون خاموش ہو گیا اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

”اچھا تو سرائے میں آگ لگ گئی؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مگر یہ آگ کس طرح لگی ہوگی؟“

”میرا خیال یہ ہے کہ عورت نے وہ شمع اندھے کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور پھر کسی طرح اس کے سیاہ چمچنے نے شمع کی ٹوکھو چھلوا ہوگا۔ اندھے نے اپنے بچاؤ کی تدبیر کی ہوگی لیکن کمرے کے دوسرے سامان نے بھی آگ پکڑ لی ہوگی۔“

”بہر حال کہانی بہت دلچسپ ہے..... بشرطیکہ یہ سچی ہو.....“

یہ سننے ہی فرینک بیٹھون کا چہرہ فق ہو گیا اور اس نے رزنی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر کیا تم بھی مجھے پاگل سمجھتے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکال کر ڈاکٹر کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ اس کی چاروں انگلیاں لگی ہوئی تھیں اور ہاتھ پر بے ترتیبی سے بندھی ہوئی ڈھیلی بیٹوں پر تازہ خون کے شعلے تھے ہوئے تھے۔



خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچھے میں ذاتی حیرت انگیز اور خیر انگیز کہانی

ابھی عسکری حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا کہ صوفیہ نے پلٹ کر میری کلائی پکڑ لی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔
”سوری نشاء..... ذرا میرے ساتھ آؤ۔“
”کہاں۔“ میں نے حیرانی سے پوچھا تو صوفیہ نے کہا۔

”میں، واش روہم جانا چاہتی ہوں۔“
اسی وقت عسکری، دو قدم آگے بڑھا اور بولا۔ ”میں صوفیہ، خدا کے لئے انہیں مجھ سے انحراف پر مجبور نہ کریں، اگر ہو سکے تو یقین کر لیں کہ میں دوست ہوں۔“

عسکری نے جس انداز سے یہ الفاظ کہے اس سے صوفیہ شرمندہ ہی ہو گئی، پھر اس نے کہا۔
”او کے میں چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ہلٹی اور واپس چل پڑی۔

تب عسکری نے کہا۔ ”اصل میں ہمارے راستے میں دوسری بہت بڑی رکاوٹیں بھی ہیں، میں اگر تم سبھی لوگوں سے یقین دلا رہا ہوں کہ میں تو خیر رہا ہوں، لیکن ہمارے راستے میں بہت سارے طریقے سے رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کی گئی ہیں، اسی طرح سے

میڈم صوفیہ تمہیں تفصیل بتانے سے روکنا چاہتی تھیں، لیکن نشاء براہ کرم مجھے یہ بتاؤ روشاق کو یہ بات نہیں معلوم اسے یہ اطلاع دوں گا اس طرح تمہارے مفاد میں میرا کام جاری رہ سکتا ہے، یہ بے حد ضروری ہے نشاء..... یہ بے حد ضروری ہے۔“
”میں ان تابوتوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میں نے ضدی لہجہ میں کہا۔

”تم چاہو تو میں تمہیں وہاں لے جاسکتا ہوں، یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے لیکن مجھے اس بات کا جواب دو، پلیز مجھے اس بات کا جواب دو کہ کیا کیا..... وہ واقعی مر گیا، میری مراد..... میری مراد البیرونس سے ہے۔“

”ہاں اس کی لاش تابوتوں کے پاس پائی گئی ہے اور اس کا رنگ موت کے بعد گہرا نیلا ہو چکا تھا۔“
”کیا اب بھی وہ لاش وہیں موجود ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتی۔“
”ٹھیک ہے آؤ چلیں، مگر تمہیں ان تابوتوں سے کیا دلچسپی ہے؟“ اس نے پوچھا اور میرے چہرے پر ناخوشگوار کی لکیریں پھیل گئیں۔
”یہ بھی بتانا ہوگا۔“ میں نے تلخ لہجہ میں سوال کیا۔

”نہیں جو کچھ نہ بتانا چاہو وہ موت بتانا، اس کے بارے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ عسکری نے خلوص سے کہا اور ہم دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے، پھر جب ہم بچے جانے لگے تو فرانسیسی پولیس کے چند افراد نے ہمیں روک دیا۔

”نہیں آپ! آگے نہیں جاسکتے۔“

”کیوں؟“ عسکری نے سوال کیا۔

”آگے خطرہ ہے کیونکہ مسٹر واسکوڈی قیدیوں کو نکال کر لارہے ہیں، ان کی ہدایت ہے کہ راستے محفوظ رکھے جائیں، خصوصاً خواتین کے لئے، پلینز۔۔۔۔۔ آپ لوگ فوراً راستہ خالی کر دیجیے۔“ عسکری نے میری جانب دیکھا اور ہمیں بادل خواستہ واپس پلٹنا پڑا تو خود اسلحہ اٹھانے کے بعد اس نے کہا۔

”خیر ہم بعد میں وہاں ضرور جائیں گے۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ دونوں واپس اسی جگہ آ گئے جہاں پر جہاز کے دوسرے مسافر جمع ہو رہے تھے، صوفیہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی، میں نے عسکری سے کہا۔

”روشن ابھی تک نظر نہیں آیا وہ کہاں ہے؟“

”شاید ان لوگوں میں نہیں ہے۔“ عسکری نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ اپنے کیمین سے کبھی باہر نہیں آتا؟“ میں نے سوال کیا تو عسکری عجیب سے انداز میں شانے ہلکا کر بولا۔

”یقین کر دینا، مجھے تو وہ کوئی بری روح معلوم ہوتا ہے، اتنے واقعات پیش آ گئے، جہاز کے ہر مسافر پر قیامت گزر گئی، لیکن وہ شے جس میں نہیں ہوا، میں نے جب بھی اسے دیکھا اپنے کیمین میں ہی دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور وہ غیر مطمئن نہیں لگتا۔“

”مطلب یہ کہ جب بھی تم اس سے ملے ہو تو وہ خونخوار بلی روشتا کے پاس موجود نہیں تھی؟“

”لیکن وہ کہاں ہے یہ صرف روشتا ہی جانتا ہے۔“

میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ وہ بلی ان تمام معاملات میں ایک نمایاں کردار رکھتی تھی، کچھ دیر کے بعد لوگ اس راستے سے ہٹنے لگے جو بچے سے اوپر آتا تھا، فرانسیسی پولیس کے سپاہی قیدیوں کو لے کر اوپر آ رہے تھے۔ لوہے کی بیڑیوں کی کھک گونج رہی تھی، میں اور خود اسلحہ اٹھائے ہوئے اور عسکری کے ساتھ ایک بلند جگہ جا کھڑی ہوئی۔ وہاں سے میں نے ان آٹھ قیدیوں کو دیکھا۔ جنہوں نے مونے لباس میں ملبوس تھے۔

انسانی شکل میں جانور نظر آ رہے تھے، واڑھیاں بڑھی ہوئی، آنکھیں وحشت زدہ، بدن تو بیکل جنہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی، فرانسیسی سپاہی ہاتھوں میں چابک سنبھالے ہوئے تھے، وہ مجمع کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس جگہ تک آ گئے جہاں ان کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔

لوگ انہیں دیکھ کر دم بخود ہو گئے تھے، پھر انہیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا، اس کے بعد چنڈرک واسکوڈی نے ایک شخص کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ یہ انتہائی دیوتاقت آدمی تھا۔ واسکوڈی بولا۔

”یہ گارساں ہیں۔“

”ڈان دان اور کبھی گارساں۔“ قوی ہیکل نے پورا نام بتایا پھر مجمع کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

”فرانس کا پوزھا کا ٹیبل ہمیشہ میرا پورا نام لینے سے کتراتا ہے کیونکہ میرے خوف سے اس کی جان نکلتی ہے۔“

قدر نروس ہو گیا تھا۔ برطانوی خزاہ پولیس آفیسر نے آگے بڑھ کر کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہو مسٹر واسکوڈی، کیا اس طرح دوستانہ فضا میں بات ہو سکتی ہے۔“ فرانسیسی افسر نے گہرا کر اپنے افسر اعلیٰ کو دیکھا پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔

”گارساں کی بکواس پر کان نہ دھرو، بکنے دو جو وہ بکتا ہے۔“ اس کے بعد اس نے گارساں سے کہا۔

”مائی ڈیئر گارساں تمہیں علم ہے کہ مارشل سمندری طوفان کا شکار ہو گیا ہے، یہ تمام لوگ۔۔۔۔۔“ واسکوڈی نے چاروں طرف بکھرے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ تمام لوگ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں، اس وقت ہم میں سے کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے، سب کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے تمہیں بھی، ہم سب کا ساتھ دینا ہوگا، کیا سمجھتے؟“

گارساں نے دو تین بار سر کو مضحکہ خیز انداز میں جنبش دی، واسکوڈی کو متحیرانہ نگاہوں سے دیکھا، پھر اس کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا، پھر اس کا دوسرا ساتھی بھی ہنسنے لگا، پھر دوسرا، پھر تیسرا اور اس کے بعد وہ آٹھوں پاگوں کی طرح پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے،

چنڈرک واسکوڈی کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا، وہ لوگ مسلسل ہنسنے جا رہے تھے، انداز بالکل پاگوں جیسا تھا اور سارا مجمع خاموش تھا، فرانسیسی افسر کو سخت طیش آ رہا تھا جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہوتا تھا، اس کے

ساتھی چڑے کے ہنزدوں پر اپنی گرفت سخت کر چکے تھے اور متحیر تھے کہ واسکوڈی کا اشارہ ملے تو وہ ان کی کھال اتار کر پھینک دیں، لیکن واسکوڈی نے کوئی اشارہ نہیں کیا، وہ خاموشی سے اس متحیرانہ منہ کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ ہنسنے والے خود تھک گئے، پھر گارساں نے انگلی اٹھا کر چنڈرک واسکوڈی کی طرف دیکھا اور مجمع کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”فرنج کا ٹیبل بہت مخرب ہے، دلچسپ باتیں

کرنا ہے، کہتا ہے کہ یہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے، میرے دوست کو دیکھو جس نے ہمیں بیڑیوں میں جکڑ رکھا ہے، اس کے ساتھ دگر و گت ہاتھوں میں کوڑے لئے ہوئے ہیں جو ہم پر برسائے کے لئے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ اسے ہماری مدد دے گا، تم لوگوں کو کبھی نہیں آتی اس بات پر۔“

”اور اس احتقانہ فرمائش پر سب سے پہلے میں احتجاج کرتا ہوں۔“ ایک عجیب سی آواز ابھری اور مجمع کے ساتھ ساتھ ہماری بھی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں، میرے پورے بدن کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا وہ روشن تھا۔ نجانے کس وقت وہ مجمع میں آ کر شامل ہو گیا تھا، میرے بدن میں چنگاریاں دوڑنے لگیں، روشن تھے پھر کہا۔

”ان لوگوں کو مدد کے قابل سمجھا گیا ہے تو انہیں بھی جہاز کے مقرر مہمانوں کا درجہ دیا جائے۔“

روشتا اس وقت بہت عجیب نظر آ رہا تھا، اس نے پاؤں کی جیسا جہ پھینا ہوا تھا، سر پر عجیب سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، یہاں تک کہ گارساں کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں اور وہ بدستور متحیرانہ انداز میں بولا۔

”معاف کرنا نیک دل انسان، اگر تم باوری ہو تو میں تمہیں مقدس باپ نہیں کہہ سکتا کیونکہ عظیم گارساں کا ایک ہی باپ تھا اور اس نے ایک ہی نر پیدا کیا یعنی گارساں، ہاں میں تمہیں چچا کہہ سکتا ہوں تو میرے مقدس چچا، میرے مقدس کی جیروی کر۔“

”اس پورے سمندری سفر میں یہ پہلی بار ہے کہ میں سے باہر نکلا ہے۔“ عسکری نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”تم اسے پہچانتے ہو یا نہیں روشتا جتنا؟“

”ہاں ہاں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

برطانوی خزاہ مجسٹریٹ نے کہا۔ ”میں برٹش قانون وال ہوں، لیکن اس وقت میں عالمی قانون کی بات کرتا ہوں، ایسے لحاظ میں جب کوئی کسی کی زندگی

کرنا ہے، کہتا ہے کہ یہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے، میرے دوست کو دیکھو جس نے ہمیں بیڑیوں میں جکڑ رکھا ہے، اس کے ساتھ دگر و گت ہاتھوں میں کوڑے لئے ہوئے ہیں جو ہم پر برسائے کے لئے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ اسے ہماری مدد دے گا، تم لوگوں کو کبھی نہیں آتی اس بات پر۔“

”اور اس احتقانہ فرمائش پر سب سے پہلے میں احتجاج کرتا ہوں۔“ ایک عجیب سی آواز ابھری اور مجمع کے ساتھ ساتھ ہماری بھی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں، میرے پورے بدن کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا وہ روشن تھا۔ نجانے کس وقت وہ مجمع میں آ کر شامل ہو گیا تھا، میرے بدن میں چنگاریاں دوڑنے لگیں، روشن تھے پھر کہا۔

”ان لوگوں کو مدد کے قابل سمجھا گیا ہے تو انہیں بھی جہاز کے مقرر مہمانوں کا درجہ دیا جائے۔“

روشتا اس وقت بہت عجیب نظر آ رہا تھا، اس نے پاؤں کی جیسا جہ پھینا ہوا تھا، سر پر عجیب سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، یہاں تک کہ گارساں کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں اور وہ بدستور متحیرانہ انداز میں بولا۔

”معاف کرنا نیک دل انسان، اگر تم باوری ہو تو میں تمہیں مقدس باپ نہیں کہہ سکتا کیونکہ عظیم گارساں کا ایک ہی باپ تھا اور اس نے ایک ہی نر پیدا کیا یعنی گارساں، ہاں میں تمہیں چچا کہہ سکتا ہوں تو میرے مقدس چچا، میرے مقدس کی جیروی کر۔“

”اس پورے سمندری سفر میں یہ پہلی بار ہے کہ میں سے باہر نکلا ہے۔“ عسکری نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”تم اسے پہچانتے ہو یا نہیں روشتا جتنا؟“

”ہاں ہاں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

برطانوی خزاہ مجسٹریٹ نے کہا۔ ”میں برٹش قانون وال ہوں، لیکن اس وقت میں عالمی قانون کی بات کرتا ہوں، ایسے لحاظ میں جب کوئی کسی کی زندگی

کرنا ہے، کہتا ہے کہ یہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے، میرے دوست کو دیکھو جس نے ہمیں بیڑیوں میں جکڑ رکھا ہے، اس کے ساتھ دگر و گت ہاتھوں میں کوڑے لئے ہوئے ہیں جو ہم پر برسائے کے لئے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ اسے ہماری مدد دے گا، تم لوگوں کو کبھی نہیں آتی اس بات پر۔“

”اور اس احتقانہ فرمائش پر سب سے پہلے میں احتجاج کرتا ہوں۔“ ایک عجیب سی آواز ابھری اور مجمع کے ساتھ ساتھ ہماری بھی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں، میرے پورے بدن کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا وہ روشن تھا۔ نجانے کس وقت وہ مجمع میں آ کر شامل ہو گیا تھا، میرے بدن میں چنگاریاں دوڑنے لگیں، روشن تھے پھر کہا۔

”ان لوگوں کو مدد کے قابل سمجھا گیا ہے تو انہیں بھی جہاز کے مقرر مہمانوں کا درجہ دیا جائے۔“

روشتا اس وقت بہت عجیب نظر آ رہا تھا، اس نے پاؤں کی جیسا جہ پھینا ہوا تھا، سر پر عجیب سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، یہاں تک کہ گارساں کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں اور وہ بدستور متحیرانہ انداز میں بولا۔

”معاف کرنا نیک دل انسان، اگر تم باوری ہو تو میں تمہیں مقدس باپ نہیں کہہ سکتا کیونکہ عظیم گارساں کا ایک ہی باپ تھا اور اس نے ایک ہی نر پیدا کیا یعنی گارساں، ہاں میں تمہیں چچا کہہ سکتا ہوں تو میرے مقدس چچا، میرے مقدس کی جیروی کر۔“

”اس پورے سمندری سفر میں یہ پہلی بار ہے کہ میں سے باہر نکلا ہے۔“ عسکری نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”تم اسے پہچانتے ہو یا نہیں روشتا جتنا؟“

”ہاں ہاں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

برطانوی خزاہ مجسٹریٹ نے کہا۔ ”میں برٹش قانون وال ہوں، لیکن اس وقت میں عالمی قانون کی بات کرتا ہوں، ایسے لحاظ میں جب کوئی کسی کی زندگی

کی ضمانت نہ دے سکے، کوئی کسی کو قید نہیں رکھ سکتا۔ پہلے قیدیوں کو آزاد کیا جائے اس کے بعد ان سے دوسری گفتگو کی جائے۔“

”دوسرا چچا بھی ٹھیک کہتا ہے، بیڑیوں سے آزادی کے ساتھ ہمیں شریفانہ لباس بھی دینے جائیں، اور جلیہ ٹھیک کرنے کی اجازت بھی دی جائے، اس سے قبل ہم کچھ بھی نہیں سنیں گے۔“

”یہ ناممکن ہے۔ نہ میں برٹش لاء کو ماننا ہوں نہ کسی عالمی قانون کو، میں انہیں آزادی نہیں دے سکتا۔“

ہینڈرک واسکوڈی نے مستحکم لہجے میں کہا۔
”فرانسیسیوں نے انہیں سوتیلے لیس میں صرف جرمنی کے قانون کو ماننا تھا اور آج تک وہاں کی عورتیں اس قانون سے محبت کرتی ہیں۔“ گارساں نے بدستور مذاق اڑانے والے لہجے میں ایک شدید طنز کیا۔

”میں تمہارے بدن کی کھال اتار دوں گا پر دنگلی کتے، ورنہ تو زبان بند رکھ۔“ ہینڈرک نے دانت پیس کر کہا اور گارساں پھر نہیں پڑا۔

”ہمیں سزائے موت کے لئے الجوزائر لے جایا جا رہا ہے وہاں جا کر ہمیں موت کا شکار ہونا پڑے گا، یہ موت ہمیں مارشل جہاز پر آجائے یا کسی سیارے پر ہمیں کہا فکر ہو سکتی ہے، فریج ریمگرٹ ہمیں یہاں گولی مار دیں یا نہیں اور لے جا کر، ہاں جہاز کے دوسرے مسافر بھی اس کے ہاتھوں موت قبول کرنے کو تیار ہوں تو دوسری بات ہے۔“

”لے چلو ان کتوں کو قید خانے میں واپس لے چلو۔ بند کرو سب حرامیوں کو۔“ چلو ہینڈرک واسکوڈی اب بالکل ہی بے قابو ہو گیا تھا، اس نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی اور وہ قیدیوں کو کوزوں سے ہاتھ لگے، جمع خاموش تھا، کچھ دیر کے بعد وہ سب نگاہوں سے اوچھل ہو گئے، ہر شخص کسی اور کے لئے کا مشتعل تھا، ان میں سب سے پہلے برٹش فوج کے کرنل ہارڈیمر نے ابتدا کی۔
”فرانسیسی افسر نے اس وقت مارشل پرفرانسیسی

قانون نافذ کر دیا ہے، ہم اس قانون کو نہیں مانتے، ہم مختلف ملکوں کے باشندے ہیں، ایک شخص کی خد نے سارے جہاز کے مسافروں کی زندگی خطرے میں ڈال دی ہے، ہو سکتا ہے بحری تفریق ہم سب کی زندگی بچانے میں کامیاب ہو جائیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک تجربے کا مطالعہ ہوں۔“

”ہینڈرک واسکوڈی بے جا خد کر رہا ہے۔“ یہ آواز روشاق کی تھی۔

”اسے قیدیوں کو آزادی دینا ہوگی۔“ دوسری آواز۔

”ورنہ ہم اسے آزاد کرانیں گے۔“
”تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو تم لوگ؟“ روشاق نے کہا اور جہاز کے تمام مسافر شور مچاتے لگے۔

”مسٹر واسکوڈی خد نہ کرو، قیدیوں کو آزادی دو، مسٹر واسکوڈی، مسٹر واسکوڈی۔“ اچانک ہی انکل ڈیزل سسر صوفیہ کے ساتھ کسی طرف سے نکل کر ہمارے قریب آ گئے اور مجھ سے بولے۔

”شاء یہاں سے جٹ جاؤ ہنگامے کا خطرہ ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

انہوں نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف کھینچے لگے۔

”فورا اس معاملے کا فیصلہ تو دیکھ لینے دیں انکل، میں کہیں میں نہیں جاؤں گی۔“ نجائے کیوں مجھے خد چڑھ گئی۔

”میں تجھے کہیں میں نہیں لے جا رہا، یہ جگہ غیر محفوظ ہے اس طرف آ جاؤ۔“ انکل ڈیزل کے ساتھ ہم ایک محفوظ گوشے میں جا کھڑے ہوئے، عسکری البتہ دیکھ رہا تھا، انکل ڈیزل کی وجہ سے اس نے ہمارے ساتھ آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”صورت حال بے حد سنگین ہو گئی ہے، فرانسیسی پولیس آفیسر ایک طرح سے درست کہہ رہا ہے، بحری تفریق گارساں شیطان صفت ہے، نجائے اس کی آزادی دوسرے کو نہ گل کلائے۔“

”وہ بعد کی باتیں ہیں انکل، سمندر میں یہ جہاز کب تک ڈول سکتا ہے، کوئی تحریک تو ہو؟“ میں نے کہا، انکل ڈیزل نے کوئی جواب نہیں دیا، کافی دیر تک وہ خاموش رہے پھر اچانک بول پڑے۔

”روشاق کو دیکھا ہے؟“

”ہاں اب وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔“
”اور اس نے گارساں کی حمایت کر کے خود کو اس کے سامنے کر لیا ہے یہ بات بہت تشویش ناک ہے، کیا تم اس کی گہرائیوں پر غور نہیں کر رہی؟“ میں نے حیران نگاہوں سے ادھر دیکھا اسی وقت صوفیہ نے پوچھا۔

”کیوں مسٹر ولسن آپ کو یہ خطرہ کیوں محسوس ہو رہا ہے؟“

”دو شیطان اکٹھے ہو جائیں تو کیا نہیں ہو سکتا، روشاق نے چالاکي سے نمودار ہو کر اس وقت صورت حال اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی ہے۔“ ولسن ڈیزل نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت واسکوڈی اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس نکل آیا، وہ کڑی نگاہوں سے شور مچانے والوں کو دیکھنے لگا، پھر اس کی دہانے ہوئی آواز ابھری۔

”خاموش ہو جاؤ، پہلے میری بات سنو، میری بات سن لو، خاموش ہو جاؤ، میں تمہیں بتاؤں وہ خوفناق قاتل اور مکمل جرائم پیشہ انسان ہے، اس کی آزادی خطرناک ہو سکتی ہے۔“

”ان حالات میں ہر خطرہ مول لیا جا سکتا ہے۔“ برٹش مجسٹریٹ نے کہا۔

”مجھے چند گھنٹے درکار ہیں، میں اس پر تشدد کر کے اسے جہاز کی درنگی کے لئے مجبور کروں گا۔“ واسکوڈی بولا۔

”ہمیں سمندر میں لاوارث کھڑے کسی جہاز پر موجود لوگوں پر تشدد کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“ اس بار روشاق نے منمنائی آواز میں کہا۔

”میں اس بارے میں کچھ نہیں سنوں گا، مجھے سختی پر مجبور مت کرو۔“ واسکوڈی نے غرائے ہوئے

لہجے میں کہا۔
”تمہیں سختی کرنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے، ہم فرانسیسی پولیس کے محکوم بھی نہیں ہیں۔“ مسافر پھر گئے۔

”ہم سب قیدیوں کو آزاد کرانیں گے۔“ ایک گروہ نے کہا اور ہینڈرک واسکوڈی نے اپنا پستول نکال لیا، اس کے تمام ساتھی بھی ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن زندگی اور موت کی محسوسات سے آگاہ ہوتے اور ویران سمندر کے بچپن بچ کھڑے ہوئے لوگ خوف زدہ نہ ہوئے، بلکہ پورے جہاز میں بکھر کر انہوں نے لکڑیوں کے کٹڑے، فولادی زنجیریں اور جو کچھ بھی ان کے ہاتھ آ یا اٹھالیا۔ وہ خونی نگاہوں سے واسکوڈی کو دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت برٹش آفیسر نے کہا۔

”سنو سنو میری بات سنو، ایک منٹ، ایک منٹ، کوئی تشدد کسی پر نہ کیا جائے، مائی ڈیزل واسکوڈی تم بے گناہ انسانوں کی جان سے کھیل کر کوئی دانشمندی کا ثبوت نہیں دے رہے، ان میں سے کتنوں کو ہلاک کرو گے جو باقی بچیں گے تمہیں مار ڈالیں گے، کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے، موت دونوں طرف سے ہمارے سمت آ رہی ہے تم اسے اور قریب نہ لاؤ۔“

واسکوڈی خاموشی سے تیار کھڑے ہو جو انوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنا پستول واپس چینی میں لگالیا اور اپنے آدمیوں کو بھی ہتھیار استعمال نہ کرنے کا اشارہ کیا۔ پھر نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

”جہنم میں جاؤ، جو کچھ کرو گے خود جھگٹو گے۔“ اس نے قید خانے کی لمبی چابیوں کا گچھا نکال کر پھینکا تو روشاق نے جھپٹا مار کر اسے پک لیا۔ اسی وقت ولسن ڈیزل نے آہستہ سے کہا۔

”اس کا منصوبہ مکمل ہے، وہ اپنے پورے پورے نمبر بنانا چاہتا ہے، ویسے تم لوگ میری بھی بات سن لو، اگر جہاز بچ بھی گیا تو ہم الجوزائر نہیں جا سکیں گے۔“

”کیا مطلب؟“ صوفیہ نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔
”بہت معمولی سی بات ہے جو ان میں سے کسی نے نہیں سوچی دیکھا گا رساں اسے اپنے بھائی گھر لے جائے گا وہ الجھناڑ کا جرم ہے اور وہاں اسے سزائے موت کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔“

”اوہ مائی گاڈ، ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل، میرے خدا، پھر کیا ہوگا، یہ بات تو دوسروں کو بھی سوچنی چاہیے۔“ صوفیہ نے کہا، وسکن ڈیزل نے کوئی جواب نہیں دیا، اسی وقت ہم نے روشاق کی آواز سنی۔
”کچھ جوانوں کو میرے ساتھ آنا چاہیے، ان کی خواہشوں کی تکمیل کر کے ہی ہم اس مشکل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔“

”کون تھا جو اس وقت قید خانے تک جانا پسند نہ کرتا، عسکری روشاق کے بالکل قریب تھا، ہم وہیں انتظار کرتے رہے، کچھ دیر کے بعد ہی گا رساں اور اس کے ساتھی بیڑیوں سے آزا ہو کر سینہ تانے ہوئے باہر آ گئے۔ نوجوانوں کا جھوم انہیں گھیرے میں لئے ہوئے تھا، اس موقع پر واسکوڈی اور اس کے ساتھی وہاں سے ہٹ گئے تھے، گا رساں نے کہا۔“

”ہمارے لئے فوراً خود اک لباس اور شیعہ وغیرہ کا سامان فراہم کیا جائے۔“

اس وقت گا رساں جہاز کا ہیرو بن گیا تھا اور اسے ہر چیز پیش کی جاسکتی تھی چنانچہ ہر شخص حسب استطاعت اس کی ناز برداری میں مصروف ہو گیا۔ کافی لوگ کیبنوں میں چلے گئے تھے، اسی وقت ڈیزل کی آواز ابھری۔

”تم یہیں روک گئی بے بی۔“
”انکل میرا وہ کام کرویں۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”کیا؟“
”وہ جگہ دکھادیں جہاں تابوت رکھے ہوئے ہیں۔“

ڈیزل نے اس وقت ایک لمحے کے لئے کچھ

سوچا، نہایت مناسب وقت تھا، سب لوگ گا رساں میں الجھے ہوئے تھے، کسی کو کسی کی فکر نہیں تھی، چنانچہ ڈیزل نے کہا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“
اور میں چل پڑی، صوفیہ بھی خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑی تھی، جس جگہ وسکن ڈیزل ہمیں لے کر پہنچے وہ جہاز کا سب سے پراسرار گوشہ تھا، چاروں طرف بڑے بڑے کارٹن فولادی صندوق اور دوسرا سامان سامان جن پر بڑے بڑے ٹیگ لگے ہوئے تھے رکھا ہوا تھا۔ وہیں پردوں کی تابوت بھی تھے، انہیں دیکھ کر میرا دل بند ہونے لگا، صوفیہ وہی تابوت تھے جنہیں میں کالج میں دیکھ چکی تھی، کپڑے کی بیٹیاں بھی وہی تھیں، بنجانے کیوں خلق میں گولا سا بن گیا، میں حسرت سے ان تابوتوں کو دیکھتی رہی، میری پیاسی آنکھیں وہ انسانی وجود تلاش کر رہی تھیں جو میرا نام نہاد باپ تھا۔ وہ تھا یا نہیں یہ بعد کی بات ہے، لیکن میں نے اسے باپ ہی کی صورت میں دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ میرے اس انداز پر ڈیزل نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولے۔

”پہچانا تم نے۔“
”یہ تو وہی ہیں نشاء۔“ صوفیہ بے اختیار بول پڑی۔

”میرا بھی یہی خیال تھا لیکن سسر صوفیہ۔“
”ہاں بولو۔“
”وہ شخص کون تھا، کون تھا وہ؟“
”کس کی بات کر رہی ہو؟“

”البر ونوس، میں البر ونوس کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔“ میں نے کہا اور چند لمحات تک خاموشی طاری رہی، اچانک ہی وسکن ڈیزل کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، اس بات کو ہم دونوں نے محسوس کیا تھا۔ وسکن ڈیزل کچھ لمحے خاموش رہے۔ پھر ان کی پراسرار آواز ابھری ایسی ہولناک آواز جسے سن کر بدن کا ہر ہونٹا تھرا جائے۔ انہوں نے ہماری لہجے میں کہا۔

”ہارون دانش، میرے دوست اگر تم آس پاس

”موجود ہو تو مجھ سے رجوع کرو، یہاں کوئی اجنبی نہیں ہے، تمہارا ہر راز راز رہے گا، ان حالات میں مجھے تمہاری مزید ہدایات کی ضرورت ہے، میں بعض فیصلے کرنے سے قاصر ہوں۔“

سارا ماحول تھرا رہا تھا، بڑی شدید کرش محسوس ہو رہی تھی، وہ پراسرار الفاظ بڑے سنسنی خیز تھے ان کی ادائیگی کے بعد وسکن ڈیزل خاموش ہو کر انتظار کرتے رہے پھر انہوں نے دو بار کہا۔

”اور اگر یہ اس وقت مناسب نہ ہو اور تم کچھ بولنا مناسب نہ سمجھو تو کسی بھی وقت میں تمہارا انتظار کروں گا، مجھے میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

پھر وسکن ڈیزل ہماری جانب پلٹے اور بولے۔
”آؤ بے بی چلیں۔“

”میں کچھ دیر یہاں رہنا چاہتی ہوں انکل، تنہا بالکل تنہا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں بے بی یہ مناسب نہیں ہوگا۔“
”میں یہاں رگوں کی انکل۔“

”بالکل نہیں بے بی میں کسی طور اس کی اجازت نہیں دوں گا، مجھے یقین ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کر دو گی۔“ وسکن ڈیزل نے سخت لہجے میں کہا اور میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر خاموش ہو گئی، ہم وہاں سے نکل آئے، ادھر برٹش مجسٹریٹ کے متعین کردہ افراد خود اک تقسیم کر رہے تھے، عسکری ہمیں تلاش کرتا پھر ہاتھ اس نے ہمارے قریب آ کر کہا۔

”آپ لوگوں کا کھانا میں نے آپ کے کیبن میں پہنچا دیا ہے، گرم ہے بعد میں خراب ہو جائے گا۔“
”شکریہ نوجوان۔“ آؤ بے بی۔“ وسکن ڈیزل نے آگے قدم بڑھا دیے۔

ہمیں بھی ان کے ساتھ جانا پڑا، کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وسکن ڈیزل نے کہا۔

”کسی طرح کی ضد اس وقت مناسب نہیں ہوگی، جو کچھ جہاز پر چل رہا ہے تم لوگ اچھی طرح جانتی ہو، ہر ذریعہ لغزش ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر سکتی ہے، میں

جار ہا ہوں خیال رکھنا پلیر۔“
ڈیزل چلے گئے، کیبن میں میں اور صوفیہ رہ گئے تھے تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، پھر صوفیہ نے تسکینی تسکلی آواز میں کہا۔

”آؤ کچھ دیر آرام کر لیں نشاء۔“
”آپ یہ بتائیے کیا ہمیں اپنی زندگی کا یقین ہے، کیا تاحد نگاہ، کھرا ہوا سندھ آؤ خراہ میں نکل نہیں لے گا، ہم یہیں اس جہاز پر مرجا سکیں گے سسٹراب اور کچھ نہیں ہو سکتا میں مایوس ہو گئی ہوں زندگی سے، لیکن میں مرنے سے قبل اپنے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ چاہے کیسے ہی ہو، چاہے یہ بات مجھے روشاق ہی سے کیوں نہ معلوم کرنی پڑے۔“

”روشاق۔“ صوفیہ دہشت سے بولی۔
”ہاں وہی کمزور انسان کوئی تو مجھے میرے بارے میں بتائے، میں تو اس سے رجوع کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ تمہاری زیادتی ہو گئی نشاء۔“ صوفیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں آخر کیوں؟“
ذرا مضمی کے واقعات پر نگاہ ڈالو، ہمیں اندازہ ہوگا کہ روشاق کا کردار مسلسل مجرمانہ رہا ہے، وہ چوروں کی طرح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے، اس نے ہمارے قریب بکھرے ہوئے لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، تمہیں اس کا علم ہے، تمہیں معلوم ہے اے کے ہدائی میرے لئے باپ جیسی شخصیت رکھتے تھے وہ اس کے ہاتھوں موت کے گڑھے تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد وسکن ڈیزل نے ہمارا ساتھ دیا۔

”ہاں میں جانتی ہوں یہ سب کچھ ہے۔“
”اور میں بھی تو تمہاری بہتری کے لئے اپنی پریش زندگی چھوڑ کر اس پانی کے جہنم میں موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہوں، میں یہ سب کیوں کر رہی ہوں تم جانتی ہو، نا روشاق کے بارے میں تم جانتی ہو اس کا ایک ہی مقصد ہے تمہاری آڑ میں ہارون

دانش تک پہنچانا، اگر اسے سب کچھ معلوم ہو گیا تو نجانے کیا ہو، عسکری ای کا آلہ کار ہے، کیا تم چاہتی ہو کہ وہ ہو جائے جو بار دن دانش نہیں چاہتے۔
”ابو۔“ میرے خلق سے سسکی نکلی۔

صوفیہ نے پھر کہا۔ ”وہ اگر چاہے تو تمہیں روشاں سے رجوع کرنے کے لئے کہہ سکتے تھے، تمہیں اس سفر کے لئے انہوں نے کیوں آبادہ کیا؟“

”سسر صوفیہ میری قوت برداشت کہاں تک میرا ساتھ دے سکتی ہے۔“ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”معاف کرنا نشاء میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں تو ایک غیر متعلق شخصیت ہوں جن کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وکسن ڈیزل جو صرف دوستی نبھا رہے ہیں سب کچھ برداشت کر رہے ہیں، یہ سب کچھ تو تمہارے لئے ہی ہو رہا ہے تاہم صرف تمہارے لئے۔“ سسر صوفیہ نے کہا اور میں خاموش ہو گئی۔

آہ میں کسی کو کیا بتانی کہ میری زندگی کن حالات کا شکار ہے، تینس میں کارچوک کی پہاڑیوں میں میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے، میں جو ایک قطعی غیر متعلق شخصیت بن کر خود اپنی ہی نگاہوں میں آئی، میں کیا ہوں، کیا تمہیں مستقبل میں کیا ہوں گی مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ نہ ماں علم میں تھی، نہ باپ کا کوئی پتہ تھا، کتنی الجھی ہوئی زندگی تھی میری۔ صوفیہ کو یہ سب کچھ نہیں معلوم تھا، بہر حال میں نے اس کی باتوں پر غور کیا، کم از کم یہاں تو وہ سچ کہہ رہی تھی کوئی نہ کوئی جواب دینا ضروری تھا چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا۔
”سوری! سوری سسر۔“

”ہم عسکری پر بالکل بھروسہ نہیں کر سکتے نشاء ڈارلنگ۔“ میں نے تمہیں بس اتنا نرم ہونے کے لئے کہا تھا جتنا ضروری ہے اور جتنا ہمارے کام آ رہا ہے، اس سے زیادہ کسی بھی شکل میں اسے بتانا خطرناک ہوگا، کیا تم نے اسے تابوتوں کی کہانی سنا دی ہے، میرا مطلب ہے وہ کہانی جو۔“

”تمہیں بالکل نہیں، بس وہی بتایا تھا میں نے اسے جو آپ کے سامنے بتایا تھا۔“
”اس نے خود بھی کوئی تفصیل نہیں پوچھی۔“

”موقع نہیں ملا کیونکہ ہم جہاز کے تہہ خانے تک نہیں جاسکے تھے۔“

”ادوہ یہاں ہی ہوا، اسے بالکل کچھ نہیں بتانا۔“
”ایک بات میرے دل میں بری طرح چھب رہی ہے سسر اس سے پوچھو۔“
”ہاں بولو۔“

”کیا اس دوسرے تابوت میں میری ماں بھی ہو سکتی ہے، اس گھر میں بھی اس جیسے دو تابوت تھے، ایک کھلا تھا دوسرا بند تھا، کھلے ہوئے تابوت کی کہانی تمہیں معلوم ہو چکی ہے لیکن اب دونوں تابوت کھلے ہوئے ہیں۔“

سسر صوفیہ نے پیاری بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ انہیں میرے اس سوال کا پوری طرح احساس ہو گیا تھا، میرے لہجے میں جو حسرت تھی ہوئی تھی وہ ان کے ذہن تک پہنچ گئی تھی لیکن وہ میرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکیں، کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

”اتنا ہی کہوں گی نشاء ڈارلنگ کہ وقت کا انتظار کرو وقت خود مناسب انکشاف کر دے گا، یہ ہوشربا واقعات انسانی عقل سے بعید ہیں، بھلا مجھ جیسی معمولی سی عورت اس پر کیا روشنی ڈال سکتی ہے۔“

میں خاموش ہو گئی تھی شام کے ساڑھے چار بجے پھر باہر نکل آئے، کمین میں تھے تھے طبیعت بوجھل ہو گئی تھی، باہر نہ عسکری نظر آتا نہ وکسن ڈیزل لیکن سسر صوفیہ نے ایک اور شخص کو روک کر پوچھا۔

”کیا گارساں نے کوئی جواب دیا؟“
”شام کو پانچ بجے وہ جہاز کے لوگوں سے میننگ کرے گا، ابھی آرام کر رہا ہے۔“ اس شخص نے کہا۔

صوفیہ خاموش ہو گئی، اس کے بعد ہم لوگ جہاز پر گھومتے پھرے، اس شخص نے جس نے اپنے آپ

کو برٹش مجسٹریٹ بتایا تھا کافی انتظامات کر لئے تھے، عرش صاف و شفاف تھا، طوفان سے ہونے والی ٹوٹ پھوٹ درست کر دی گئی تھی، پھر ہمیں وہ جگہ معلوم ہوئی جہاں گارساں میننگ کرنے والا تھا مجھے اور سسر صوفیہ کو بھی اس میننگ سے دلچسپی تھی، وکسن ڈیزل کے پارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، ہم نے پہلے ہی ایک بہتر جگہ قبضے میں کر لی۔ پھر کمین خالی ہونے لگے اور پانچ بجے گارساں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آ گئے، گارساں کی عمر کوئی پچاس سال کے قریب ہو گئی۔ جلدی درست کرنے کے بعد یہ لوگ اور خوفناک نظر آنے لگے تھے۔ ان کے سر کے بال بہت لمبے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، ٹھوڑیاں صاف کر لی گئی تھیں لیکن ایک مخصوص انداز سب کے چہروں پر نظر آ رہے تھے، پھر اس کی آواز ابھری۔

”میں چاہتا ہوں کہ جس مقصد کے تحت مجھے آزادی دی گئی ہے اسے بیان کرنے کے لئے آپ لوگ ایک نمائندہ منتخب کر لیں، وہ مجھے تفصیل بتائے اور اگر چاہے تو مشورے کے لئے کچھ لوگوں کو ساتھ رکھ سکتا ہے۔“

برٹش مجسٹریٹ ہی کو بات کرنے کے لئے منتخب کیا گیا، چند اور افراد بھی اس کے ساتھ تھے جو عمر رسیدہ تھے اور شیروں کی حیثیت سے اس کے سامنے بیٹے، اچانک ہی صوفیہ نے ایک طرف اشارہ کیا اور بولی۔

”دیکھو نشاء! اورو دیکھو۔“

میں نے صوفیہ کے اشارے پر دیکھا تو روشاں نظر آیا لیکن اس وقت پہلی بار میں نے اس شخص کی شکل کی بجائے پریشانی سے دیکھا۔ انتہائی خوفناک نہیں بلکہ کسی عورت کا چہرہ ہو، ایک عجیب و غریب شکل تھی اس کی، بہت سے لوگ شاید اسی لئے اس کی جانب متوجہ تھے۔ پھر شاید گارساں نے بھی اسے دیکھ لیا اور وہ زور سے چیخا۔

”مقدس چچا۔۔۔ کیا تم میرے شیر کی حیثیت سے میرا ساتھ دو گے؟“
”بے فکر ہو جیتے، میں یہیں سے تمہارے مفادات کی نگرانی کر رہا ہوں۔“ روشاں نے بھی چیخ کر جواب دیا اور گارساں نے قہقہہ لگا کر کہا۔
”ٹھیک ہے اپنے دشمن سے ہوشیار رہنا۔“ برٹش مجسٹریٹ نے کہا۔

”الجزائر کی طرف سفر کرتے ہوئے مارشل جس حادثے کا شکار ہوئے تمہیں اس کا علم ہے گارساں، جہاز کے انجن خراب ہو گئے ہیں، انجنیئر حادثے کا شکار ہو کر مر چکے ہیں، کمپین روڈرکس بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور دوسرے ڈے دار افراد کشتیاں لے کر فرار ہو گئے ہیں، اس وقت جہاز سمندر میں لاوارث ہے۔ کیونکہ تمہیں بہترین جہاز داں ہونے کا فخر حاصل ہے اس لئے جہاز کے سینکڑوں مسافروں کو تہاہری مدد کی ضرورت ہے۔“

”معزز بزرگ! میں سب کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن سمندر کے قانون کے مطابق اور یقیناً تم میں سے کسی نہ کسی کو سمندر کا بین الاقوامی قانون معلوم ہوگا، اگر نہیں معلوم تو عمر رسیدہ خلاصیوں سے پوچھو یا قانون کے کسی ماہر سے جو داخلی قانون داں ہو۔“

”اپنی بات کی خود وضاحت کرو مائی ڈیزر گارساں۔“ برٹش مجسٹریٹ نے کہا۔

”دینا بھری جہاز داں کمپنیوں اور مالک نے اس قانون پر دستخط کئے ہیں، جینو میں اس کا مسودہ پیش کیا گیا اور اسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ قانون یہ ہے کہ کھلے سمندر میں اگر کوئی جہاز کپتان کے کنٹرول میں نہ رہے اور وہ سفر جاری رکھنے سے بے بسی کا اظہار کر دے تو ہر وہ شخص جو جہاز کو بچالینے کا دعویٰ کرے اور اسے بچالے اس جہاز اور اس پر موجودہ ساز و سامان کا مالک بن جاتا ہے، اس پر موجود ہر شے اس کی ملکیت ہوتی ہے، اس ملکیت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا، اگر یہ سمندری قانون آپ لوگوں کو منظور

ہو تو میں پورے غلوں سے ان زندگیوں کو بچانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔“

مسافر سائے میں رہ گئے تھے، ایک لمحے میں انہیں اپنے قیمتی ساز و سامان دوسرے کی ملکیت میں چلے جانے کا احساس ہو گیا تھا، ایک شخص نے برٹش جمسٹریٹ سے کہا۔

”ہاں یہ سمندروں کا بین الاقوامی قانون ہے میں جانتا ہوں۔“

”مسافروں کو خود اس کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔“ اس میں کوئی شک نہیں کہ برٹش جمسٹریٹ بھی بالکل اسی انداز میں سوچ رہا تھا اس نے کہا۔

”یہ سمندر کا قانون ہے یا نہیں میں نہیں جانتا، لیکن ایک شخص جو اس وقت متوقع سمندری موت کوٹا لے کر اہلیت رکھتا ہے یہ قیمت دینے کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔“

”میں اپنے خاندان کو بچانے کے لئے اپنا سب کچھ دینے کے لئے تیار ہوں۔“ ایک معمر شخص نے کہا اور پھر بہت سے اس کے ہم آواز ہو گئے، پھر چاروں طرف سے آمادگی کا اظہار ہونے لگا اور اس کے بعد شاید ہی کوئی ایسا رہا ہو جو زندگی خریدنے کے لئے تیار نہ ہو، گارساں نے کہا۔

”سب خاموش ہو جائیں اور صرف وہ شخص بولے جسے اس بات پر اعتراض ہو۔“

کوئی نہیں بولا تھا، چالاک بجزی قزاق مسکرایا اور بولا۔

”تو شرط مکمل ہو گئی، مارشل اب میری ملکیت قرار پا چکا ہے، اب دوسری بات اول تو میں جہاز کا کپتان قرار پایا و دوم اس کا مالک، اب اس پر موجود ہر شے پر جبر میری ملکیت ہے اور اس پر صرف میرا تصرف ہے، کپتان کا حکم جہاز پر ایک حکمران کا حکم ہوتا ہے، اور یہ حکم ماننا ہر ایک پر فرض، آپ لوگ میرا حکم مانیں گے۔“ کیوں نہیں گارساں؟“ جمسٹریٹ نے کہا۔

”تو پھر سب سے پہلے جہاز پر جتنے آتشیں

تھیں اور غیر آتشیں ہتھیار ہیں وہ میرے حوالے کر دیے جائیں، ان میں فراہم کی گئی ہتھیار بھی شامل ہیں۔“ گارساں بولا اور واسکوڈی گاما گیا۔

”یہ بکواس ہے میں ایسا بھی نہیں کروں گا۔“

”تو کیا تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو یوڑھے کاٹھیل، ابھی یہ سب کچھ زبانی ہے، نہ میں نے جہاز کا انجن دیکھے ہیں اور نہ کپتان کا لباس پہنا، تم مجھے دوبارہ بیڑیاں لگا سکتے ہو، ہم تعرض نہیں کریں گے، لیکن پھر کیا کرو گے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ مجھے اس جہاز پر بھائی دے دو، ایسا کرو اگر تمہیں یہ اختیار دے دیا جائے۔“

پچھلے سے روشنائی نے چیخ کر کہا۔ ”فرائیسی انٹر سلسل مارشل پرفرائس کا قانون لاگو کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے، اگر یہ سیکڑوں انسانوں کی زندگیاں ختم کرنے پر آمادہ ہے تو اس پر حملہ کرو اور اسے بے بس کر دو۔ ہم اسے دوسروں کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“

غالباً واسکوڈی نے غصے میں آکر اپنا ہتھول نکالا تھا، میں صحیح طریقے سے نہیں دیکھ سکی تھی، لیکن میرے ساتھ بیشتر انسانوں نے روشنائی کے کندھے سے خونخوار ہلی کو چھلانگ لگا کر واسکوڈی کی جانب دوڑتے ہوئے دیکھا اور دوسرے لمحے وہ اس کے کندھے پر چڑھ گئی، اس نے واسکوڈی کا زرخہ اپنے

دانتوں میں دبایا تھا۔ واسکوڈی ہتھول نکالنا بھول گیا، ہلی کو اپنے زرخہ سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہلی نے اس کا زرخہ چبا ڈالا۔

بیشکل تمام واسکوڈی اسے اپنے گلے سے پھینچنے میں کامیاب ہوا تھا، لیکن ہلی نے پھر اپنا رخ بدلا اور اس بازار نے اس کے دائیں گال پر حملہ کیا تھا، میں نے بھی دیکھا اور دیکھنے والوں نے بھی کہ اس نے واسکوڈی کا داہنا گال بری طرح چیر کر پھینک دیا تھا اور پھر اس کے دانت واسکوڈی کی آنکھ میں گڑ گئے اور واسکوڈی کی دہشت ناک چیخیں گونجنے لگیں۔

لوگ سکتے میں رہ گئے تھے، واسکوڈی ہتھول

کالاک بھی نہیں کھول سکا تھا اور اسے پھینک کر ہلی کو اپنے پھرے سے ہٹانے کے لئے کوششیں کرنے لگا تھا۔ لیکن ہلی اپنا کام کر چکی تھی، واسکوڈی کی آنکھ کی جگہ اب ایک خون آلود سا نظر آ رہا تھا۔ کمزور دل کی عورتیں جنہیں مارنے لگیں، واسکوڈی زمین پر گر کر بری طرح تر پڑے تھے۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی تھی، ہلی نے ایک چھلانگ لگائی ایک بلند جگہ چڑھی اور اس کے بعد مزید اوپر، اور آخر کار وہ جہاز کے سب سے اوپری حصے میں چلی گئی اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

ہلی جہاں جہاں سے گزرتی تھی وہاں نیچے موجود لوگوں کے لباس سے خون کے قطرے ٹپکے تھے، گویا واسکوڈی کی آنکھ اب بھی اس نے اپنے دانتوں میں دبائی ہوئی تھی، ایک لمحے کے لئے گارساں بھی ششدر نظر آیا تھا اور اس کے بعد اس کی نگاہیں روشنائی کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ پھر چند لمحوں کے بعد شاید وہ سنبھلا اور گرجدار آواز میں بولا۔

”میں کسی کو اس شخص کی عیادت کے لئے وقت نہیں دے سکتا، فیصلہ کرو اور عمل کرو۔ وہ نوجوان جو مجھے اعتبار دے کر اس کام کے لئے اجازت دینا چاہتے ہیں فوراً عمل کریں۔ پہلے مرحلے کے طور پر سارے ہتھیار ایک جگہ جمع کر دیے جائیں اور اس کے بعد میں اپنے کام کا آغاز کروں گا۔“

سمندر کے قیدی گارساں کو ناخدا مان چکے تھے وہ سب کے سب واسکوڈی کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ پورے جہاز پر یہی لوگ ہتھیاروں سے مسلح تھے، دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہتھیار چھین لئے گئے، میں نے عسکری کو بھی انہی لوگوں کے ساتھ مصروف دیکھا تھا، البتہ دسکن ڈیول کو بھی ہم نے دیکھا جو تین افراد کے ساتھ واسکوڈی کو اٹھا کر جہاز کے ایک سائیڈ پر لے جا رہا تھا، یہ تینوں افراد ڈاکٹر تھے میں جانتی تھی جمع تقریباً منتہی ہو گیا تھا اور اب جہاز پر گارساں کی حکومت قائم ہو گئی تھی، حالات بتا رہے تھے کہ کچھ لوگوں کے علاوہ کوئی بھی اس کا مخالف نہیں رہا ہے، مصوفیہ نے

آہستہ سے کہا۔

”اسے دیکھو، روشنائی کا ہر کارہ کس طرح گارساں کے لئے مصروف عمل ہے۔“ صوفیہ کا اشارہ عسکری کی طرف تھا، میں تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر میں نے تھکے تھکے لمحے میں کہا۔

”پلیئر سسٹر صوفیہ کینن میں چلے، میں تھک گئی ہوں۔“ صوفیہ نے میرا کاہتا ہوا باز پکڑا اور میرے ساتھ کینن کی جانب چل پڑی، کینن میں داخل ہو کر میں اپنے بستر پر لیٹ گئی تھی، سسٹر صوفیہ بھی ایک گوشے میں پڑے ہوئے صوفیہ نے پر بیٹھ لگیں۔ ان کی نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں، پھر وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئیں، انہوں نے محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں ڈال دیں۔

”وہی زندگی اپنائے رہیں تو کیا ہرج تھا، کتنی پریشان ہو، چہرہ مرجھا گیا ہے۔“

”بہت عجیب لگتا ہے سسٹر بہت ہی عجیب لگتا ہے، کاش بس اتنا پتہ چلا کہ میرے ماں باپ مر چکے ہیں یا زندہ ہیں، کوئی مجھے یہ بتا دیتا۔“

”مگر تمہاری زندگی تو پریشانی، آرام سے جی رہی تھیں، بہت سے لوگ تہیم خانوں میں پرورش پاتے ہیں، ان کے ماں باپ یا ماں یا باپ انہیں بہت چھوٹی سی عمر میں تہیم خانے میں داخل کر دیتے ہیں، وہاں رہ کر وہ صرف تہیم خانے کے متولی سے واقف ہوتے ہیں۔ نہ ان کے ماں کا تذکرہ ہوتا ہے نہ باپ کا۔“

”مگر میں کسی تہیم خانے میں نہیں پئی سسٹر، میرا مسئلہ تو کچھ اور ہی ہے۔“

”مگر تمہاری زندگی تو بہتر تھی۔“

”نہیں..... نہیں تھی، اتنی یکسانیت تھی میری زندگی میں کہ اعصاب پھٹنے لگے تھے، ملازم کو بھی اور بس، نہ کوئی دوست نہ شناسا تھا بالکل تنہا اور سسٹر یہ بات پہلے نہیں تھی، بس میں آپ کو کیا بتاؤں، کیا بتاؤں میں آپ کو، بڑے عجیب سے حالات تھے۔ میری زندگی پر جانے کیسے کیسے واقعات چسپاں ہیں، سسٹر ماں کے

”تین نصیحتیں“

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے انتقال کا جب وقت آیا تو انہوں نے فرمایا۔ ”اے میرے بیٹو! میں تمہیں تین باتوں سے روکتا ہوں۔ انہیں اچھی طرح یاد رکھنا۔

۱۔ حضور اکرم ﷺ کی طرف سے حدیث صرف معتبر اور قابل اعتماد آدمی سے ہی لینا اور کسی اور سے نہ لینا۔

۲۔ قرضہ لینے کی عادت نہ بنالینا، چاہے چوغہ پہن کر گزارہ کرنا پڑے۔

۳۔ اشعار لکھنے میں نہ لگ جانا ورنہ ان میں تمہارے دل ایسے مشغول ہو جائیں گے کہ قرآن مجید سے محروم رہ جاؤ گے۔ (حیاء الصحابہ جلد 3 صفحہ 231)

(نوٹ: اس سے مراد فضول اور عشقیہ قسم کے اشعار ہیں، ورنہ اچھے اشعار اور حمد و نعت وغیرہ میں مشغولیت قابل تعریف کام ہے)

(الس احتیاز احمد - کراچی)

ہوری، وہ دیکھو وہاں ناشے کا بندوبست کیا گیا ہے، احکامات کے مطابق ناشے کا کھانا کینوں میں نہیں پہنچایا جائے گا، بلکہ یہاں آکر ہر شخص اپنے لئے کھانا حاصل کر سکتا ہے اور کھا سکتا ہے، اس طرح اس نے حکم وایہ کہ جو جہاں ہے اور جس جگہ ہے وہاں اپنے اپنے حصے کی صفائی ستھرائی کرانی ہوگی، ایسے ہی احکامات اس کی

کروں، وہ قریب آئے تو میں نے مسکرا کر کہا۔ ”یوں لگتا ہے انگل جیسے آپ تو اپنے کینوں میں رہتے ہی نہ ہوں، ابھی بھی آپ مجھے اپنے کینوں میں نظر نہیں آتے۔“

میرے ان الفاظ پر انگل ڈیزل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، بولے۔

”ہاں ڈے داریاں ایک جگہ قدم نہیں نکالنے دیجئے، میں جہاز کے پورے ماحول سے واقفیت حاصل کرتا رہتا ہوں۔“

”اس بے چارے شریف آدمی کا کیا ہوا انگل، میری مراد اسکو ڈی سے ہے؟“

”بہت بری حالت ہے بے چارے کی، ایک انگلہ سے محروم ہو گیا ہے، زخروہ بھی خاصا چھالیا گیا ہے، وہ توافق کی بات یہ ہے کہ جہاز پر چند اچھے ڈاکٹر موجود ہیں، البتہ یہ انداز ہو رہا ہے کہ کچھ نہیں پائے گا، کیونکہ جہاز پر اب اتنے آلات بھی نہیں ہیں کہ اس کے زخروہ کا علاج ہو سکے، ڈاکٹروں کو جو کچھ حاصل ہو سکا ہے وہ اس کا علاج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”دکسی کی طرف سے کوئی مداخلت تو نہیں ہوئی انگل؟“ میں نے سوال کیا اور ڈیزل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے تقریبی لگا ہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا سوچتی ہو، نہیں کسی طرف سے کوئی مداخلت نہیں کی گئی اس کے علاج کے سلسلے میں۔“

”اور وہ خوفناک شخص میری مراد گارساں سے ہے۔“

”بڑا عجیب اثر دیا ہے اس نے، دیکھنے میں ایک خوشخوار وحشی نظر آتا ہے، لیکن ایک منظم اور حکمران کم کا انسان ہے، بہت ہی ذہانت سے اس نے احکامات نافذ کئے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جہاز کے تقریباً ہی نوجوان مسافر اس سے بھرپور تعاون کر رہے ہیں اور اسے اپنے کاموں میں کوئی دقت نہیں

شخص ابو حامدی سے ملاقات ہوگی، اس کے بعد کیا ہوگا اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ بس کئی چنگ کی طرح ڈولتی پھر رہی تھی۔ اور اب یہ لمحات آج گئے تھے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاز پر بڑے بڑے دلدوز مناظر بکھر رہے تھے۔ بے شمار افراد ہوں گے جو بن ماں باپ کے ہوں، زندگی کے وسائل سے بھی محروم ہوں، لیکن زندگی سے بے زار رہے ہوں میں بھی اگر اپنی ان تنہائیوں کو دوسری شکل دے دیتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، کوئی کی بھی نہیں تھی زندگی میں ہر ضرورت پوری ہو جاتی تھی، لیکن بس کیا کہتی اپنے آپ کو، کارچوک میں تابت میں میں اپنے آپ کوئی تھی اور میں اپنے آپ کو نہیں جانتی تھی کہ میں کیا ہوں، ذہن پرمنوں بوجھ آ رہا تھا۔ میں نے گردن کھما کر سبز صوفیہ کی طرف دیکھا وہ شاید سونے کی کوشش کر رہی تھیں، میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور اس کے بعد مجھے نیند لانے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔

گزرنے والی رات کے بعد پھر دی صبح اور صبح کے ساتھ ساتھ ایک انوکھے ماحول ایک اجنبی کیفیت کا وہی انداز، ظاہر ہے کینوں میں وقت نہیں گزارا جاسکتا تھا، پڑے پڑے طبیعت پر شدید بوجھ آ رہا تھا۔ صوفیہ بھی میری طرح الجھنوں کا شکار تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن حال اندر سے بالکل مختلف تھا۔ خیر باہر آئے، ماحول کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔ تمام کینوں آباد ہو گئے تھے جبکہ اس دوران زیادہ تر لوگ عرشے پر ہی نظر آیا کرتے تھے۔ لیکن ایک ہی رات میں کافی باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی، مثالاً اس لئے کہ لوگوں کو زندگی کی امید بندھ گئی تھی۔

کوئی خاص بات نہیں معلوم ہو سکی، کچھ لوگ عرشے کی صفائی میں مصروف تھے، یہ سب کے سب خلاصی بھی تھے، اور جہاز کے مسافر بھی، البتہ تھوڑی دیر کے بعد دور سے انگل ڈیزل آتے ہوئے نظر آئے، ہماری ہی طرف آرہے تھے، ایک لمبے کے اندر میں نے فیصلہ کیا کہ انگل ڈیزل سے خوشخوار موڈ میں بات چیت

بارے میں پتہ چلا کہ جس عورت نے آٹھ سال تک مجھے ماں کی محبت دی وہ میری ماں نہیں تھی، پھر باپ کی شخصیت بھی مشکوک ہو گئی اور میں آپ کو صرف دو لفظوں میں یہ بتا سکتی ہوں کہ میں خود بھی اپنی شخصیت سے ناواقف ہوں، میں کون ہوں، کیا ہوں، ماضی سے میرا کیا تعلق ہے، اتنے واقعات ہیں کہ آپ سنیں گی تو دنگ رہ جائیں گی، جب بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کو اپنے بارے میں وہ تفصیل بتاؤں نہ جانے کیوں میری زبان بند ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے موت بھی میری مشکل کامل نہیں ہے۔“

”خود کو سنبھالے رکھو نشاء اپنے اعصاب پر قابو رکھو، اگر ہم زندگی بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو تم سے تمہارے بارے میں پوچھوں گی اور یقین کرو مجھ سے زیادہ بہتر تمہارا اور کوئی ساعی نہیں ہوگا، کیا سمجھیں، تم دیکھو اس وقت لوگوں کی کیا حالت ہے انہیں دیکھ کر ڈھارس ہوتی ہے، مائیں ہیں چھو بٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”خدا کی قسم سسرلیوں لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ صرف میری وجہ سے ہوا ہے، اتنے سارے لوگ صرف میری وجہ سے اس عذاب کا شکار ہوئے ہیں۔“ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”نہیں یہ صرف تمہارا احساس ہے۔“

”میں آپ سے بھی شرمندہ ہوں، کاش آپ سے اپنے ساتھ رہنے کی ضد نہ کرتی۔“

”اب اس خیال کو دل سے نکال دو، ہم سب تقدیر کے محکوم ہیں، یہ سب میرے لئے بھی تھا، یوں نہ ہوتا تو کسی اور طرح ہوتا، مجھے اب کوئی احساس نہیں ہے اور تم خود کو بالکل مجرم نہ تصور کرو۔“ صوفیہ نے کہا۔

بہر حال میں خاموش ہو گئی، وقت گزرتا رہا، اور پر نہ جانے کیا کچھ ہو رہا تھا۔ رات کو بہت سی باتیں سوچتی رہی، یہ سب کچھ جو شروع ہوا تھا اس کے بارے میں علم نہیں تھا کہ اس کا اختتام کہاں ہوگا۔ میں بہت الجھن کا شکار تھی، وسکن ڈیزل نے کہا تھا کہ الجزائر میں ایک

جانب سے نافذ کئے گئے ہیں اور اب وہ پر اطمینان انداز میں جہاز کے انجن روم میں موجود ہے، پورے جہاز میں اعلیٰ نام کی جو چیزیں ملے ہیں اسے کپتان کے کیمین میں منتقل کر کے اس نے اپنے دو کپسل آڈیوں کی گنگری وہاں لگا دی ہے، اس سلسلے میں اس نے کسی دوسرے پر اعتبار نہیں کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔

”اور انکل، روشاق! وہ تو کل کر سامنے آ گیا ہے۔“

”روشاق!۔“ ڈیزل نے ہونٹ بھیجنے کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس شخص کو بہت پہلے سے نہیں جانتا، میرا مطلب ہے کہ میرا اور اس کا شعبہ یکساں ہے، لیکن میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، مجھے عجیب سا احساس ہو رہا ہے اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ بے حد شاطر اور بہت ہی تبدیل شدہ انسان ہے، ہم صرف اسے ایک آثار قدیمہ کا ماہر یا مصریات پر اتھارٹی نہیں کہہ سکتے، اس کی ذات میں کچھ ایسی انوکھی قوتیں پوشیدہ ہیں جو ناقابل یقین ہی ہیں، میرا خیال ہے ابتداء ہی میں اس نے یہ بھاپ لیا تھا کہ گارساں جہاز پر برتری حاصل کر لے گا، چنانچہ وہ اپنے عمل سے گارساں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، خصوصاً اس بلی کا وہ عمل گارساں جیسے لوگوں کو توجہ کرنے کے لئے بہت اہم تھا اور اب یہ کیفیت ہے کہ روشاق گارساں کی ناک کا بال بنا ہوا ہے۔“

”وسکن ڈیزل کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی اس نے پھر کہا۔

”ہمیں پورے اعتماد کے ساتھ حالات کا انتظار کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے انکل میں مستعد ہوں۔“ میں نے کہا اور سسر صوفیہ نے چوک کر مجھے دیکھا، غالباً وہ میرے اس نئے موڈ سے حیران ہوئی تھی، غرض یہ کہ جہاز کے اصولوں کے مطابق پہلے ہم نے اپنے لئے ناشتہ حاصل کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کیمین کی طرف چل پڑے۔ کیمین کی صفائی کی خبر سگالی کے طور پر

سوچا کہ انکل ڈیزل کے کیمین کی بھی صفائی کر دی جائے لیکن وہاں وہ خود مصروف ملے تقریباً ان کے کیمین کی صفائی مکمل ہو چکی تھی، ہمیں ویکل کر مسکرائے اور بولے۔

”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مصروفیت بہت سے دوسروں کا علاج ہوتی ہے، تم لوگ بھی مصروفیت میں خود کو بہلا سکتی ہو۔“

”اب کیا کریں انکل، آپ نے تو اپنا کیمین خود ہی صاف کر لیا۔“

”کام بہت سے ہیں، اگر کوئی کام نہ ہو تو جہاز کے اسپتال میں جا کر نرسنگ کرو، سب سے عمدہ کام ہے۔“

”ارے واہ! زبردست.....“ یہ مشورہ مجھے بہت اچھا لگا تھا، وسکن ڈیزل ہمیں خود اسپتال لے کر چلے گئے۔ ہم اس اسپتال کو دیکھ کر حیران رہ گئے، بہت سے بستر تھے یہاں سب کے سب بھرے ہوئے تھے، کوئی شدید بخار کے عالم میں بیڈیان بک رہا تھا کوئی زخموں سے کراہ رہا تھا۔ کچھ اس طوفان کی زد میں تھے اور طوفان کے بعد پیدا ہونے والے بحران کے زخمی، ایک بستر پر ہم نے داسکوڑی کو بھی دیکھا، بے ہوش پڑا ہوا تھا، یہ بھی فکر تھا کہ گارساں نے اس کے سلسلے میں کوئی انتہائی خطرہ نہیں اختیار کیا تھا، ڈاکٹروں کو اس کا علاج کرنے کی کھلی آزادی تھی اور وہ زیادہ تر ای پر مصروف تھے، وہ پھر کو عسکری ہمیں تلاش کرتا ہوا آ گیا۔

”دو گھنٹے سے مسلسل تلاش کر رہا ہوں تمہیں، ایتھائی مجبور ہو کر انکل ڈیزل سے پوچھنا پڑا تب یہ چلا کہ تم یہاں ہو، دیے اچھا مسئلہ ہے جاری رکھو۔“

”تم کیا کر رہے ہو؟“ میں نے طنز سے مسکرا کر پوچھا۔

”بہت سے کام ہیں ویسے مجھے روشاق کی وجہ سے خاص آوی سمجھا جانے لگا ہے۔“ خاص آوی تو ہم ہو۔“ میں نے بدستور اسی انداز میں کہا اور عسکری ہمیں پڑا، پھر وہ صوفیہ سے بولا۔

”نشاء نے اس دوران بہت کچھ سیکھا ہے۔“

خاتون صوفیہ، دنیا داری، دنیا سے آزادی، دنیا سازی، مجھ سے نفرت کے باوجود میرے ساتھ گفتگو میں تھوڑی سی ہلک اور میں یہ محسوس کرتا رہا ہوں، لیکن خاتون صوفیہ آپ گواہ رہیں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اگر وقت آئے اور میں نشاء پر زندگی قربان کر دوں تو انہیں یہ ضرور یاد دلا دیں کہ یہ میں نے کہا تھا اور خاتون صوفیہ اس کے لئے میں جس رنگ میں نظر آؤں جس کے ساتھ نظر آؤں یہ میری مجبوری ہوگی۔“ میں نے یا صوفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولا۔

”گارساں کے ساتھ بہترین انجینئر ہیں، انجن ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن کمپاس ٹوٹ گئے ہیں اور کمپاس کا خیال ہے کہ طوفانی لہریں جہاز کو عام سمندری روٹ سے دور ہٹا لیں گی۔ کمپاس کی غیر موجودگی میں جہاز اپنی مرضی سے روٹ پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس کا صرف یہ حل ہوگا کہ سمندر میں آگے بڑھنے ہوئے کسی اور جہاز کو تلاش کیا جائے گا، اگر ایسا ہو گیا تو کام بن جائے گا اور.....“ وہ خاموش ہوا تو صوفیہ نے سوال کیا۔

”اور اگر نہ ہوا تو؟“

”میں خاتون صوفیہ ایسا ضرور ہو جائے گا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سینکڑوں مسافروں کو لے کر سفر کرنے والے جہاز میں ایمر جنسی کے لئے خوراک اور ایندھن کے ذخائر بہت ہی اطمینان بخش ہیں، اس لئے کچھ وقت بے شک لگ جائے گا لیکن کچھ دن کچھ ضرور ہو جائے گا۔“ اس کے بعد سب خاموش ہو گئے تھے۔

دن گزر گیا، کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا، مغرب کا وقت ہوا تھا، اچانک جہاز میں زلزلہ ہونٹ ہوئی اور ہلکی آوازیں بلند ہونے لگیں، نصف مشاغل میں مصروف مسافر چوک چوک کر رہ گئے، سب اس تبدیلی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے، پھر چند دن جو خوشی سے ناچتے ہوئے لوہے کے وہ جیج رہے تھے۔

”انجن ٹھیک ہو گئے، جہاز روانگی کے قابل ہو گیا، گریٹ کپٹن گارساں نے سینکڑوں انسانوں کی زندگی بچائی۔ آپ سب کو مبارک ہو۔“

ہر طرف خوشیاں بکھر گئیں چہرہ کی رونقیں لوٹ آئیں، ہر طرف زندگی بکھر گئی، عرش پر جگہ جگہ رقص ہونے لگے۔

”مائی گاؤ۔“ صوفیہ نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

پھر کپتان گارساں کی طرف سے نئے احکامات صادر ہونے لگے۔ جہاز کے ہوا بان اور بیرونی حصے ٹھیک کئے جانے تھے یہ کام جہاز کے اصل خلاصی کر رہے تھے اور فوجانہ ان کی بھرپور معاونت کر رہے تھے۔ رات تک یہ ہنگامی کارروائی جاری پھر ذرا قوت ہو گیا اور ڈنر کے بعد اعلان ہو گیا کہ عزت مآب جناب گارساں جہاز کے انجنوں کی درنگی سے مطمئن ہو گئے ہیں۔ اور جہاز اب کسی بھی وقت نکلے گا۔

مسافر اس رات کینوں میں نہیں گئے تھے وہ زندگی کا جشن منا رہے تھے۔ ہم لوگ بھی عرش پر تھے۔ مگر میرے دل میں ایک خیال آیا اس وقت سب لوگ اپنی خوشیوں میں مگن ہیں کیوں نہ میں مال خانے میں موجود ان تابوتوں کو دوبارہ دیکھوں..... ممکن ہے، ممکن ہے۔“

یہ خیال اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ میں خود کو باز نہ رکھ سکی، لیکن میں تنہا جانا جاتی تھی بالکل تنہا۔ سسر صوفیہ کو ذرا دیر میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور موقع ملے ہی میں نے جہاز کے نچلے حصے کی طرف قدم بڑھادیے۔ مجھے راستہ یاد تھا کیلئے جب آئی تھی تو میں نے اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اب سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

مال خانہ چونکہ رات میں استعمال نہیں ہوتا تھا اس لئے اس وقت یہاں روشنی نہیں ہوتی تھی اللہ وہ جگہ جہاں تابوت رکھے ہوئے تھے میں نے جگہ و کھنہ بھی چونکہ اس سے جذباتی وابستگی تھی چنانچہ مجھے وہاں

لگے ہوئے روشنی کے بلب بھی یاد تھے اور انہیں روشن کرنے کے سوچ بھی دیکھے تھے۔ چنانچہ اندھیرے میں ایک ایک قدم منہبل سنبھل کر چلنے لگی، مال خانے میں نہ جانے کیا کیا بھرا ہوا تھا بار بار ٹھوکر لگ رہی تھی اس وقت اس طرف کسی کے آنے کا خطرہ نہیں تھا لوگ جشن میں مصروف تھے چنانچہ کوئی مداخلت نہیں ہوئی گھنا ٹوپ اندھیرے کے باوجود میں بالکل صحیح جگہ پہنچ گئی مگر اسٹانا، گہری خاموشی، اتنی کہ مجھے اپنے سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ ذرا سی جنبش آواز بن جاتی تھی۔ اس وقت میری حیات بھی تیز کام کر رہی تھیں۔ اچانک ایک عجیب سے احساس سے میرے قدم رک گئے مجھے اپنے سانسوں کی آواز میں کچھ تبدیلی سی لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس آواز میں ایک اور آواز بھی شامل ہو گئی ہے ایک غیر مانوس آواز جیسے میرے علاوہ بھی یہاں اور کوئی موجود ہے۔

تقدیق کے لئے میں نے اچانک سانس روک لی۔ اس کے باوجود مجھے سانسوں کی آواز سنائی دی۔ لیکن پھر یکدم خاموشی چھا گئی جیسے کسی کو میرے سانس روکنے کا احساس ہو گیا۔ پوری طرح غور کرنے لگی ممکن ہے یہ نہانی کا خوف ہو جو وہم بن گیا ہے۔

میں نے یادداشت پر زور دے کر سوچ تلاش کئے اور وہ مجھے مل گئے۔ چپ کی آواز کے ساتھ ایک بلب روشن ہو گیا۔ روشنی وسیع و عریض مال خانے میں پھیل گئی میں نے سانس روک کر ان تابوتوں کو تلاش کیا اور وہ مجھے نظر آ گئے لیکن وہ بند تھے میرا دل و جاڑو حائر کرنے لگا۔ میں نے آنکھیں زور سے کھینچ کر کھولیں لیکن جو کچھ میں نے دیکھا وہی تھا۔ تابوت بند تھے، لیکن اب ان میں تالے نہیں لگے ہوئے تھے نہ ہی وہ تالے کہیں آس پاس نظر آ رہے تھے۔ میں دل مضبوط کر کے آگے بڑھی اور تابوتوں کے پاس پہنچ گئی پھر میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے ایک تابوت کا ڈھکن کھول دیا۔ ساری جان آنکھوں میں سٹ آئی تھی۔ شاید

اس وقت میری آنکھیں کچھ دیکھ سکیں، کیا اس کا تعلق مجھے خود نہیں تھا بس ایک احساس تھا۔ لیکن تابوت خالی تھا۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

بے اختیار دل سے ایک آہ نکل گئی۔ ایک باہمی سی دل میں اتر گئی چند لمحے ایک حیرت کے سے عالم میں گزرے پھر کسی مومہوی امید پر دوسرا تابوت کھولا۔ لیکن وہ بھی خالی تھا، شاید کسی نے یہ خالی تابوت بند کر دیئے تھے۔ میری آنکھیں بھڑ آئیں ایک جذباتی تاثر کے تحت میں ان تابوتوں میں جھانکتی رہی۔ پھر میری رندگی آواز ابھری۔

”اور آپ جانتے ہیں کہ یہ تابوت میرے لئے اجنبی نہیں ہیں، ابھی نہیں سوچا کہ آپ میرے پاپا نہیں ہیں، کارچوک کے تحقیقاتی عمل میں، میں بھی کھو گئی، آپ بھی کھو گئے، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس سنہری تابوت میں کون تھی وہ جو بھی تھی، کون مجھے بتائے گا۔ ایک آپ ہی تو تھے جو مجھے میری شناخت دے سکتے تھے یہ بتا سکتے تھے کہ میری تاریخ کہاں کھو گئی ہے۔ میں کون ہوں، میری ماں کون تھی۔ تاریخ کے پردوں میں کیا چھپا ہوا ہے، نرماندہ سے میرا کیا رشتہ ہے، پاپا آج کون ہے، آپ کو احساس نہیں ہے کہ میں سب سے اجنبی ہو گئی ہوں۔ سب کچھ چھن گیا مجھ سے۔ پاپا آپ بھی مجھ سے چھن گئے۔ آپ کون ہیں، دیکھئے میں کتنی لاوارث ہو گئی ہوں، پاپا مجھے ڈر لگ رہا ہے، میں سمندر کے بچوں جی زندگی کے لئے ترس رہی ہوں، پاپا..... پاپا.....“ میری سسکیاں ابھرنے لگیں۔

لیکن اچانک کچھ ہوا۔ کچھ عجیب۔ سامنے رکے کارٹنوں میں سے ایک جھوٹا سا کارٹن اپنی جگہ سے لڑھک گیا۔ شاید کسی نے گرتے ہوئے کارٹن کو سنبھالا۔ لیکن وہ نہ سنبھل سکا اور کارٹنوں کی ایک قطار گر گئی اور اس کے عقب میں ایک انسانی سایہ نظر آیا جو ساکت تھا۔

میری سانس جیسے رکنے لگی وہاں تاریکی تھی جہاں سایہ نظر آ رہا تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار رنجی ہوئی آواز نکلی۔

جہاں سایہ نظر آ رہا تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار رنجی ہوئی آواز نکلی۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ تو میرے اندر ایک عجیب سا غصہ جاگ اٹھا۔ میرے بدن میں شدید گرمی پیدا ہو گئی میں آگے بڑھ کر دوبارہ سوچ بورڈ کے پاس پہنچی اور وہاں جتنے سوچ لگے تھے سب آن کر دیئے تاکہ خوب روشنی پھیل جائے اور میں ابو کو دیکھ سکوں میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں ہزاروں شکوے دل میں ابھرتے تھے نہ جانے کیا کیا کہنے دل چاہئے لگا تھا آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی دیوار آکھڑی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ پاپا اس وقت کسی مشکل میں ہیں۔ مشکل میں نے دیکھا کہ اس وقت وہ بے نقاب نہیں ہیں نہ ہی بیٹوں کا کوئی ڈھیر ہے۔ یہ تو ایک باقاعدہ چہرہ تھا لیکن یہ چہرہ میرے پاپا کا نہیں تھا، یہ چہرہ انجینی نہیں تھا، یہ..... یہ روشاق تھا، ہاں یہ محسوس چہرہ روشاق کا تھا۔

وہ پتھر کے بجسے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ کچھ لمحے اس طرح گزر گئے۔ میرا جسم ساکت تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن بصارت جیسے ختم ہو گئی تھی بس دماغ کی آنکھوں سے میں روشاق کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحات اس طرح گزر گئے پھر اچانک روشاق کے بدن میں تحریک ہوئی اور وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

”نشاء۔ میں تمہارے تعاقب میں یہاں تک آیا ہوں۔ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے بات کرنا پسند کرو گی۔“

میرے لب جیسے ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ میں ابھی تک ہوش و حواس بحال نہیں کر سکی تھی بارون دالاش کے بجائے یہ محسوس چہرہ دیکھ کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا تھا۔ روشاق خاموش کھڑا تھا۔ وہ میرے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بولا۔

”میرے بارے میں تمہارے ذہن کو اس

قدر زہر آلود کرو یا گیا ہے کہ اسے صاف کرنا ایک مشکل کام ہے۔ جبکہ ابھی وہ وقت نہیں رہا کہ تم جان سکو کہ میرا تمہارا رشتہ سب سے قدیم ہے آشوری مندر کا بڑا بیچارہ جو چاہتا ہے وہ کوئی نہیں جانتا۔ جبکہ تاریخ کے بے شمار کردار ہمارے درمیان خلا پیدا کرنے کی سرتوڑ کوششیں کرتے رہے ہیں جن میں سب سے پیش پیش احمد جنیدی ہے سمجھیں تم غور کرو احمد جنیدی پر غور کرو۔“

میرے ذہن میں چرخیاں سی چلنے لگیں۔ احمد جنیدی کے بارے میں سب کچھ سوچنے لگی۔ وقت کی کہانی وقت ہی بیان کرتا ہے۔ صدا فوس ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔

دفعتاً جیسے میری زبان کے تالے کھل گئے۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ اس محسوس شخص سے باتیں کر کے کچھ اور معلوم کروں۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مشر روشاق۔“

”یہ کہ وقت نے اس کہانی کو وقت سے پہلے آگے بڑھا دیا ہے جس کو وقت پر منتظر عام پر آنا تھا۔“

”کہانی۔“

”ہاں۔ انا طوق کی تحریر کردہ کہانی، سیوہ، ٹائپوس، نرماندہ کی کہانی، آشوری مندر کی سب سے خوبصورت بچارن کی کہانی۔“

”ایک بات بتاؤ گے روشاق۔“

”ہاں۔ پوچھو شاید تمہارا دل میری طرف سے صاف ہو جائے۔“

”تم لوگ آستوانی مذہب کی تلاش میں تینوں گئے تھے۔“

”ہاں۔“

”مائیکل جون اور امیر الحنات بھی تمہارے ساتھ تھے۔“

”ہاں، بالکل۔“

”وہ دونوں کہاں گئے۔“

”ان کا تاریخ مصر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”پھر وہ کیوں وہاں گئے تھے؟“

”خزانوں کی تلاش میں۔“

”کیا کارچوک کی پہاڑیوں میں کوئی خزانہ موجود تھا۔“

”دونوں بے وقوف اسے زرد جواہر کا خزانہ سمجھتے تھے لیکن وہاں جو خزانہ مدفون تھا وہ تاریخ مصر کے کچھ گم گشتہ باب تھے۔“

”وہ دونوں اس بات کو نہیں جانتے تھے۔“

”اور..... اور پایا.....؟“

”ہارون دانش تو ان خزانوں کی چابی تھے۔ ہم دونوں اصلیت سے واقف تھے اور بس۔“

”پھر کیا ہوا۔“

”وہی جو ہوتا ہے۔“

”یعنی؟“

”انسان کی فطری خود غرضی، ہم دو آشا، ایک دوسرے سے مخرب ہو گئے، میں دانش ہارون کے ساتھ مل کر تاریخ کے ایک عقدے کو حل کرنا چاہتا تھا لیکن ہارون دانش کے دل میں بے ایمانی آگئی خاص طور سے اس لاش کو دیکھ کر جو..... تمہاری ہم شکل تھی۔“

”کیوں.....؟“

”اس سوال کا جواب ممکن نہیں ہے بے بی۔“

”تم اس لاش کو لے کر غائب ہو گئے۔“

”مجبوری تھی۔ ہارون دانش بھی یہی کرتے تھے، تم نے بہت سے سوالات کر لئے۔ میں جس حد تک تمہیں بتا سکتا تھا بتا دیا۔“

”مگر میں کچھ اور پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”بتا سکتا تو ضرور بتاؤں گا۔“

”میں کون ہوں۔ میرے ہاں باپ کون تھے۔ وہ لاش میری ہم شکل کیوں تھی، میری شخصیت ایک پراسرار حرم میں کیوں لپٹی ہوئی ہے۔“

”روشنائیں نہ پڑا، پھر بولا۔“ اس کے بعد اور کیا

رہ جاتا ہے۔ افسوس میں ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ ہاں تم چاہو تو میں وقت کے سفر میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

میں طنزیہ انداز میں ہنسی۔ پھر میں نے کہا۔

آپ صرف میری مدد کے لئے میرا لقب کر رہے ہیں اس جہاز پر میری وجہ سے موجود ہیں۔“

”ان میں کوئی شک نہیں ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں، لیکن اس میں میرا مفاد بھی ہے۔“

”وہ خوفناک جلی آپ کی ملکیت ہے؟“

”جلی۔“ وہ عجیب سے لہجہ میں بولا۔ ”تم اسے جلی کہہ دو۔ لیکن وہ ایک عظیم کردار ہے جو ہمارے ساتھ تاریخ کی اہم ترین سچائیوں کی کھوج میں میرا ساتھ دے رہی ہے، وہ سچائیاں جو تاریخ کے اوراق میں گم ہو گئی ہیں۔“

”واہ! بڑے انوکھے کردار ہیں تمہارے ساتھ۔ یہ کردار کس..... کا ہے جس نے اعرجندی حکومت سے ہمکنار کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”وہ ایک وارننگ تھی اس کے لئے کیونکہ بہت بلند پرواز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”اور اسی عظیم کردار نے میرے ایک ملازم کو زخمی کر دیا تھا۔“

”وہ مجبوری تھی۔“

”اور۔ اور آخر میں آپ نے اسے کے ہمدانی کو زندہ درگور کر دیا۔“

”رب آسوس کی قسم۔ ڈوبتے چاند کی راتوں کی قسم۔ سب سے آخر میں ڈوبنے والے ستارے کی قسم۔ ہمدانی کے ساتھ یہ سلوک میں نے نہیں کیا تھا۔“

”تو پھر.....“

”یہ اعرجندی نے کیا تھا۔ وہ تمہارا ذہن میرے خلاف کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جبکہ تم میرے سب سے قریب ہو۔“ روشنائیں کی آواز غصہ ناک ہو گئی۔ اور میرے ذہن میں شدید سنسنی ہونے لگی۔ بڑا حیرت ناک انکشاف تھا لیکن اس سے زیادہ

سنسنی خیز وہ قسمیں تھیں جو روشنائیں نے کھائی تھیں میرا ذہن بھگ گیا مجھے اپنے چاروں طرف گھسنے اور ناقوس بچنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان کے درمیان ایک آواز بلند ہو رہی تھی۔

”نقدیں ہو رہی آسوس کی۔“

”ڈوبتے چاند کی مقدس راتوں کی۔“

”محافظہ ستارے کی جو روشنی کے لئے قربانی دیتا ہے۔“

”نقدیں ہو، نقدیں ہو، نقدیں ہو۔“

ایک عجیب سی گونج پیدا ہو گئی تھی اس دوران میری نگاہیں روشنائیں کی طرف اٹھ گئیں جو بڑے پراسرار انداز میں مستعدار پاتھا جسے میری کیفیت کو سمجھ رہا ہو۔ میں ایک جھٹکے سے اس سحر سے نکل آئی۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے کہا۔

”وہ کتا ہیں کہاں ہیں۔“

”سو فیصدی اعرجندی کے قبضے میں ہیں۔“

میں تم سے آخری بات کہنا چاہتا ہوں بے بی۔“

”ہاں۔ کہو۔“ میں اب پوری طرح سنہیل گئی تھی۔

”دیکھو، کبھی کبھی وہ سب سے بڑا دوست ثابت ہوتا ہے جسے سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ میں تمہیں پیش کش کرتا ہوں کہ مجھ پر بھروسہ کرو، مجھ سے تعاون کرو۔ میں تمہیں تمہاری منزل تک پہنچاؤں گا۔ لیکن تمہیں پورے خلوص سے مجھے تسلیم کرنا ہوگا۔“

بڑی انوکھی پیش کش تھی، سب سے بڑے دشمن کی اس شخص نے تو ساری مشکلات پیدا کی تھیں اس کی باتوں پر یقین کیسے کیا جاسکتا ہے جبکہ یہی ساری معیشتوں کی بڑ تھا، کیسے کیسے انوکھے انکشاف کئے تھے اس نے سب سے زیادہ سنسنی خیز یہ کہ ہمدانی صاحب کا

اشر اعرجندی نے کیا ہے، اعرجندی کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا جاسکتا تھا۔

”یہی تو افسوس ہے بے بی۔“ ان لوگوں

کو تمہارے سلسلے میں مجھ پر برتری حاصل ہو گئی ہے۔ روشنائیں نے کہا، اور میں بھونچکی رہ گئی۔ ”انہوں نے تمہیں فریب کر لیا ہے، انہوں نے تمہیں یقین دلادیا ہے کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔“

پراسرار روشنائیں میری سوچوں سے واقف ہو رہا تھا۔ اس نے پھر مجھ پر ہم مارا اور بولا۔

”یہ صرف چرشناسی ہے، قوت مشاہدہ ہے، خبر میں نے تمہیں سوچنے کی دعوت دیدی ہے، فیصلہ تمہیں کرنا ہے ہاں ایک بات ضرور کہوں گا، فیصلہ اپنی ذات سے کرنا ہے خاص طور سے دشمن ڈیزل کے بارے میں کھد رہا ہوں۔ میرے سلسلے میں اس سے مشورہ کرو گی تو وہ تمہارا ذہن اور ہمت کا دے گا۔ اگر فیصلہ میرے حق میں کرو تو مجھ سے میرے کیمین میں ملنا۔ خبر تمہیں بتائے دے رہا ہوں جہاں میں دوسرے نام سے مقیم ہوں۔ اور اگر دل میری پیشکش کو قبول نہ کرے تو کوئی بات نہیں۔ وقت خود سارے فیصلے کرے گا میں چلا ہوں اور جاتے جاتے تمہیں ایک خوشخبری سنا دوں۔“

”خوشخبری۔“

”ہاں۔ شاید تمہیں اعرجندی کے بارے میں معلوم ہو۔“

”کیا.....؟“

”یہی کہ وہ بھی جہاز پر موجود ہے۔“

”کیا..... میں اچھل پڑی۔“

”ہاں۔ کیمین خبر نویس میں وہ عدنان ثنائی کے ساتھ موجود ہے۔ چلا ہوں۔“ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ لیکن میں بری طرح چکر لائی ہوئی تھی۔ میرے خدا یہ سب کیا ہے، مسٹر ڈیزل تو اچھی دانست میں بڑی رازداری سے یہ سفر کر رہے تھے اور اپنی سوچ کے مطابق انہوں نے سب کو ڈانچ دے دیا تھا لیکن یہاں تو سب اس جہاز میں جمع ہو گئے تھے۔ اور حیرت کی بات ہے کہ اب تک سب اپنے آپ کو ایک دوسرے سے چھپائے ہوئے تھے۔ اس

ہنگامے میں جبکہ سب موت و زیست کی کشمکش کا شکار تھے وہ سامنے نہیں آئے تھے۔

ایک بار پھر میری نظرس ان نابالوں کی طرف اٹھ گئیں۔ اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”پاپا، کیا جج جی آپ بھی میرے پاپا نہیں ہیں۔ اگر آج میرے پاپا ہوتے تو مجھے اس طرح مشکلات میں میرا ساتھ نہ چھوڑتے۔ کچھ تو بتائیے میں کیا کروں۔ میں نے تو ہوش سنبھالنے کے بعد آپ کو ہی اپنا پاپا سمجھا ہے کچھ تو میری مدد کریں، انتہائی باتیں کہ میں کون ہوں، آپ تو میرے ماضی کو بھی مجھ سے چھین رہے ہیں پاپا۔ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے ماں باپ تو زندگی کے رہبر ہوتے ہیں، لیکن نہ میری ماں ہے اور نہ آپ میرے پاپا۔“

میں کسی جذبات عمل کا انتظار کرتی رہی پھر مایوس ہو کر میں نے روشنیاں بجھا دیں اور وہاں سے واپسی کے لئے قدم اٹھا دیے، دل میں آرزو تھی کہ کوئی آواز دے، کوئی پکارے۔ ”رک جاؤ نشاء، رکو، میری بات سنو تم تنہا نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ لیکن کوئی آواز نہیں سنائی دی اور میں باہر نکل آئی۔

خود کو زندگی کے جھوٹ کا احساس دلانے والے مسلسل مصروف تھے، انہیں موت کے اندھیروں میں زندگی کا فریب نظر آ رہا تھا، وہ زندگی کی خوشی سے سرشار تھے۔ سارے وجود پر ایک معمولی ایک تھکن کا احساس طاری تھا، صوفیہ کہ جانے کہاں تھی، اس لئے سیدھی اپنے کیمین کی طرف چل پڑی، یہ خیال بھی تھا کہ شاید صوفیہ کیمین میں چلی گئی ہو لیکن وہ نہیں تھی۔

بستر پر دراز ہو گئی، سارا کیمین ہل رہا تھا ایک عجیب سی گھبراہٹ دل پر طاری تھی۔ جس وقت پاپا کے ساتھ ان کے ریسرچ ورک میں ساتھ ہوتی تھی ایک طمانیت ایک اعتماد زندگی پر تھا، ماں نہیں تھی، آیا نہ میر تھیں جنہوں نے کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی، لیکن اب میرا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

روشاق نے سارے ماضی کے بارے میں ہر سوال ٹال دیا تھا۔ وہ اتنی تھکن تھا اور انتہائی پر اسرار اور عجیب۔ اس کے علاوہ اس نے احمد جیدی کے بارے میں جو انکشافات کئے تھے کیا وہ جج تھے۔ احمد جیدی کی حرکات بھی کافی مشکوک تھیں۔ وہ چوروں کی طرح پاپا کی لائبریری میں داخل ہوا تھا، میرے بارے میں اس نے کافی چھان بین کی تھی، اور کیا واقعی انکل بھول کو احمد جیدی نے اس حال کو پہنچایا تھا۔ کیا احمد جیدی یہ عمل کر سکتے ہیں، اور پھر یہ بھی کہ کیا وہ جج جی مارشل پر موجود ہے۔ وہ بھی اور عدنان ثانی بھی۔ میرے خدا، حالات آگے پر اسرار بھی ہو سکتے ہیں، انکل ڈیزل تک کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ ان سب کے ہاتھوں بری طرح بے وقوف بنے ہیں، اور لپے عمل میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔

اچانک ہی کیمین کے دروازے پر آہٹ ابھری، اور میں نے چونک کر ادھر دیکھا، صوفیہ اندر داخل ہو گئی۔

”اوہ! خدا کا شکر ہے، تم یہاں موجود ہو۔“ انہوں نے کہا۔

”کیوں سسر۔“

”ارے پاپا میرا تو خون خشک ہو گیا تھا۔“

”آئیے بیٹھے۔ آپ واقعی پریشان نظر آ رہی ہیں۔“ میں نے کہا اور وہ کھجکی پٹھن گئیں۔

”بار بار کیمین کے چکر لگا چکی ہوں، عرشے کے آخری کونے تک آنکھیں پھاڑ چکی ہوں، کہاں چلی گئی تھیں تم۔“

”آپ باہر تو نہیں جائیں گی۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔“

”کیا کروں گی باہر جا کر، لوگ شراب پی کر بدست ہو رہے ہیں۔“

”ہاں، زندگی ایسی ہی چیز ہے۔“

”مگر تم کہاں جا چھپی تھیں؟“ وہ اپنے بستر پر

دراز ہو گئیں اور میں انہیں دیکھنے لگیں، ان سے کچھ چھپانا و اٹھمنڈی نہیں تھی کیونکہ وہ میری وجہ سے خوار ہو رہی تھیں۔

”میں جہاز کے مال خانے میں گئی تھی۔“

”کہاں؟ صوفیہ کے شاید میرے الفاظ ٹھیک نہیں سنے تھے۔“

”جہاز کے تہ خانے میں۔“

”تہ خانے میں؟“

”ہاں۔ جہاں وہ تابوت رکھے ہوئے ہیں۔“

”کیا!؟“ صوفیہ بے اختیار اپنی تھکن بھول کر اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔

”ہاں، میں وہاں گئی تھی، اپنے پاپا کی تلاش میں۔“

”تو پھر۔“ صوفیہ کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔

”پاپا نہیں ملے، لیکن۔“

”جلدی بولو۔“

”وہاں مجھے روشاق مل گیا، جبکہ دونوں تابوت نکالی تھے۔“

صوفیہ کے حلق سے سسکی جیسی آواز نکلی تھی، میں نے صوفیہ کو اپنے اور روشاق کے درمیان ہونے والی باتیں صوفیہ کو بتائیں احمد جیدی کے بارے میں بتایا تو سسر صوفیہ کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا کچھ لمحے خاموش رہ کر اسے سرسرائی آواز میں کہا۔

”کیا ضروری ہے کہ وہ جج بول رہا ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ ہم نے جہاز کے سارے مسافروں کو یکے بے یکہ کیوں نہیں نظر آیا جبکہ خود روشاق بھی خود انہیں چھپا کا۔“

”اس نے مجھے اس کے کیمین کا نمبر بھی بتایا ہے اور عدنان ثانی کے بارے میں بھی جو اس کیمین میں اس کے ساتھ ہیں۔ عدنان ثانی کی تفصیل بھی آپ کو بتا چکی ہوں۔“

”میرے خدا۔“ صوفیہ نے دونوں ہاتھوں سے

پرکڑایا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہی پھر چونک کر بولی۔

”کربولی۔“ کیا عسکری نے بھی اسے نہیں دیکھا۔“

”میں نہیں کہہ سکتی۔“

”وہ لمحے لمحے ہمیں باخبر رکھ رہا ہے، ہو سکتا ہے اسے معلوم نہ ہو۔ ویسے نشاء تم بتاؤ، کیا احمد جیدی، عدنان صاحب کے ساتھ یہ دردنگ کر سکتا ہے، کیا وہ اس طرح کا انسان ہے تم نے تو اسے دیکھا ہے۔“

”میں کیا کہوں سسر۔ انحراف کرتی ہوں مجھے انسان شناسی نہیں آتی۔“

”میرا خیال ہے روشاق ہمیں فریب دے رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”مگر اب کیا کریں۔“

”میرے ذہن میں کچھ نہیں آ رہا۔“ میں نے

الچھے ہوئے لمحے میں کہا اور صوفیہ سوچ میں ڈوب گئی۔

”ننولان کے پر اسرار بیٹے میں جو کچھ ہوا اور اس کے بعد ہمیں ایتھین جانے کا مشورہ دیا گیا۔ اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“

”میں بالکل مطمئن ہوں سسر۔“

”ایک بات پوچھو نشاء۔۔۔۔۔ برا تو نہیں مانو گی۔“

”نہیں۔“

”اب تک جو کچھ ہوا ہے تمہارے خیال میں وہ سب نیک نیتی پر مبنی ہے۔“

”یعنی۔“

”تمہیں یقین ہے کہ وہ ہارون دانش ہی تھے۔“

”کون۔۔۔۔۔؟“

”جو ہمیں ننولان میں ملے تھے۔“

”وہاں سسر۔“

”منو نشاء۔ کبھی کبھی دل کے فیصلے عقل کے فیصلوں پر سبقت لے جاتے ہیں میں اس سے مخرف نہیں ہوں۔ اگر ہارون دانش صاحب نے ہمیں ایتھین بھیجا اور وکسن ڈیزل پر بھروسہ کیا تو ہمارے سنے انکل ڈیزل ہی سب سے بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے

علاوہ فرض کروا اگر احر جیدی شاطر ہے اور کوئی گہرا کھیل، کھیل رہا ہے تو دانش صاحب تمہیں روشاں کا سہارا لینے کے لئے بھی کہہ سکتے تھے۔“

میں کچھ لمحے صوفیہ کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر ایک دم بات سمجھ میں آگئی صوفیہ بڑے دور کی کوڑی لائی تھی۔ میرے دہن سے ایک بوجھ ہٹ گیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔

”لیکن اس کے باوجود ہمیں ایک گوشہ خالی رکھنا ضروری ہے۔“

”وہ کیا؟“

”مکن ہے احر جیدی یہاں موجود ہو۔ میرے خیال میں اب ہمیں سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ یہ ساری باتیں انکل ڈیزل کو بتا دیں۔“

”بات خطرناک نہ ہو جائے۔“

”ہم جن خطرات سے گھرے ہوئے ہیں وہ کم ہیں کیا، ایک اور خطرہ پیش آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ویسے میں ایک پیش گوئی کروں۔“

”ہوں۔“

”روشاں اب تمہارے ارد گرد پکرائے گا، وہ بے دھڑک تم سے ملاقاتیں کرے گا۔ تمہیں کوئی خاص بات نہیں کرنی اس سے، ہر جواب انکل کے مشورے سے دینا ہے کوئی غیر ضروری بات نہیں کرنی اس سے۔“

”ٹھیک ہے سسٹر۔ اب کیا کریں۔“

”میں انکل ڈیزل کو تلاش کر کے لاتی ہوں۔“

”اد کے۔“ میں نے کہا اور صوفیہ باہر چلی گئی، لیکن میرے ذہن میں شدید الجھن پیدا ہوگئی، روشاں نے کچھ باتیں ایسی کہی تھیں جن کا طعم میرے سوا کسی کو نہیں تھا، آشتیانی مندر کی پجاریں، سیوے اور زائکے یہ باتیں روشاں جانتا اور کوئی نہیں۔ وہ سب سے زیادہ پراسرار اور واقف شخصیت ہے اگر اسے اغراض ہوا تو۔۔۔۔۔

انکل ڈیزل شاید آسانی سے صوفیہ کو مل گئے تھے، کچھ لمحوں کے بعد ہی وہ دونوں کیمین میں داخل

ہو گئے۔

”ہیلو نشاء۔۔۔ کیا ہنگامے ہو رہے ہیں۔“

”آپ کے لئے دلچسپ کہانیاں تیار ہیں۔“

”انکل۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ گڈ، کیا کہانی ہے یہی۔“

”میں بتا دوں نشاء۔۔۔۔۔؟“ صوفیہ نے

کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تب صوفیہ نے پوری داستان سن و سن سادی اور خود انکل ڈیزل حیران رہ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر انہوں نے کہا۔

”میرے خدا۔ ہو شرابا کہانی ہے۔ ہم نے تو بری طرح مار کھائی ہے، جہاز پر اتنا بڑا اجتماع ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں۔ احر جیدی اور عدنان ثانی پر ہے۔“

”اب ہم کیا کریں انکل۔“ میں نے پوچھا۔

”سکن ڈیزل کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے پر خیال لہجے میں کہا۔“ میرے خیال میں روشاں سے غلطی ہوگئی۔“

”کیسے۔۔۔۔۔؟“ صوفیہ نے چونک کر پوچھا۔

”ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ڈیزل پر خیال انداز میں بولے۔“

”بتائیے انکل اب ہم کیا کریں۔“

”ہمیں ان حالات میں کچھ اور کرنا ہوگا، عمدہ موقع ہاتھ آجائے۔“

”پلیز۔۔۔۔۔ کچھ بتائیے انکل۔“

”سنو نشاء، تم روشاں سے ملو، اپنے آپ کو اس کے اعتماد میں دیدو۔ اسے پوری تفصیل بتاؤ نیولان

والے گھر کے بارے میں بھی۔ البتہ چند باتیں صوفیہ راز میں رہیں۔“

”وہ کیا انکل۔“

”نیولان والے گھر میں تم نے جوتا بوت دیکھے تھے ان میں دو مپاں تھیں، لیکن بے جان، ان میں کوئی تحریک نہیں تھی۔“

”اوہ، لیکن انکل، اس عورت کی شکل میں

روشنی اور اس کی ملی۔“

”مجھے یاد ہے، لیکن تم فکر مت کرو، اور ہاں، آجین آنے کے بارے میں تم اسے بتا سکتی ہو کہ جنہیں ایک کال کے ذریعہ اس کی ہدایت ملی تھی جو ہارون دانش کیا واز میں تھی۔ مزید یہ کہ تم مجھ سے بیڑی کا اظہار بھی کرو۔“

”انکل میں اس سے خوف زدہ ہوں۔“

”نہیں میری جان، بالکل فکر مت کرو۔“ میں

تمہیں بتاؤں وہ بہت چالاک ہے، اس لئے گارساں

کوشش میں اتار کر خود کو محفوظ کر لیا ہے اس بات کو خاص طور سے ذہن میں رکھنا ہے۔“

”مجھے بتائیے انکل۔“

”کیا۔۔۔۔۔“

”میں کل اس سے ملوں۔“

”ہاں ضروری ہے۔“

”اور احر جیدی؟“

”ابھی اس پر غور نہ کر۔ اسے میں دیکھوں گا۔“

”سکن ڈیزل تھوڑی دیر تک میرے پاس رکے پھر جانے کے لئے اٹھ گئے۔“

”میں چلتا ہوں بے بی، دیسے میرا خیال ہے کہ

گارساں بہت جلد جہاز کی روانگی کا اعلان کر دے گا۔“

دوسری صبح میں بہت دیر تک سوئی رہی تھی۔ میں

اور سسٹر صوفیہ دونوں ساتھ ہی جاگے تھے میں واش روم

سے فارغ ہوئی تو صوفیہ واش روم چلی گئیں ابھی وہ باہر

ہیں آئی تھیں کہ کیمین کے دروازے پر دستک ہوئی۔

دروازہ کھولا تو ایک نوجوان نظر آیا۔ اس کے پیچھے کوئی

ادھی تھا۔

”ناشتہ لے لیجیے میڈم کیا آپ اس کیمین میں تب

ہیں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، ہم دو ہیں، میں اور میری ساتھی۔“

”وہ بھی خاتون ہیں۔“

”ہاں!“

”براہ کرم اپنا نام بتادیں، کیمین گارساں

سروے کر رہے ہیں تاکہ سفر کرنے والوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔“

میں نے اپنا اور صوفیہ کا نام بتایا جو اس نے کیمین نمبر کے ساتھ نوٹ کر لیا، پھر میں نے نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میرا نام قلب موہرگن ہے۔ میں بھی جہاز کا مسافر ہوں، لیکن ہم رضا کارانہ طور پر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔“

”کیا خواتین کو بھی ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔“

”کپتان گارساں کا کہنا ہے کہ یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔“

”شکریہ“ میں نے کہا اور ناشتہ لے کر رکھ

لیا۔ ناشتہ کرتے ہوئے میں نے صوفیہ کو اس بارے میں

تفصیل سنائی تو وہ ہیکے انداز میں مسکرا دی، پھر بولی۔

”مب لوگ کتنے خوش ہیں نشاء زندگی کتنی عجیب

ہوتی ہے۔“

”وہ تو بے سسز اس وقت آپ یہ کس لئے کہہ

رہی ہیں۔“

”جہاز کے انجن ٹھیک ہوتے ہیں لیکن کیا اس

ٹوٹ گئے ہیں کوئی منزل، کوئی راستہ نہیں ہے جہاز کہاں

جائے گا۔ آگے آگے کیا ہوگا کچھ معلوم نہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیکن ایک اور بات

ہے۔“

”وہ کیا۔“

”اس وقت کا کپتان بحری قزاق ہے

، سمندر دن کا کثیر، امکان ہے وہ راستہ تلاش کر لے۔“

”ہاں، اچھا سوچا تم نے۔ صوفیہ نے انحراف کیا

۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم نے فیصلہ کیا کہ عرشہ

پر چلا جائے۔ مختصر تیاریوں کے بعد ہم عرشہ پر چل

پڑے یہاں خوب رونق تھی، نوجوان بڑی مستعدی سے

سارے کام کر رہے تھے۔ برج آباد تھا، گارساں کے

ساتھی جہاز کے افسران کی وردیاں پہنے سارے امور کی

نگرانی کر رہے تھے۔ ہم لوگ اسپتال کی طرف چل

آسیب

شائستہ سحر - راولپنڈی

چاندنی رات میں ہر سو عجیب سرور چھایا ہوا تھا کہ اچانک غراہٹیں سنائی دیں جب نوجوان نے اس طرف دیکھا تو دھل کر رہ گیا، ایک بوڑھی عورت نے ایک نوجوان کا گلا دبوچ رکھا تھا اور پھر اس عورت نے نوجوان کا گلا بھنبھوڑنا شروع کر دیا اور پھر.....

دل و دماغ پر کتنی طاری کرتی اور سطر سطر نکلنے لگے کڑے کرتی دہشت ناک حقیقت

محسن اپنا سر پکڑتے ہوئے بولا۔ ”فرید! تم نہیں جانتے وہ خوف ناک بڑھیا میرے حواسوں پر سوار ہو چکی ہے اس قدر بہت ہے اس کے چہرے اور اس کی زرد آنکھوں میں کہ میں دیکھ کر لرز جاتا ہوں۔“

میں گہرا سانس لے کر بولا۔ ”تم نے آس پاس سے پتہ کیا اس بوڑھی عورت کا کہ وہ کون ہے اور آئی کہاں سے ہے؟“

محسن اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں کیا ہے مگر کسی بھی شخص کو پتہ نہیں اس عورت کے متعلق! وہ بالکل خاموش رہتی ہے کسی سے بات نہیں کرتی بس ہر وقت سر کو جھکائے بیٹھی رہتی ہے مگر میں جب بھی اس کے پاس سے گزرتا ہوں لازمی سر اٹھا کر اپنی خوف ناک آنکھوں سے مجھے گھورتی ہے اس وقت مجھے اس بوڑھی عورت سے جس قدر خوف آتا ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“

”یہ بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ تیرا گھر بھی اسی گلی میں ہے۔“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا محسن میری بات کی تاکید کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں یا میرا گھر بھی اسی گلی میں ہے جہاں وہ محسوس بڑھیا ایک کھلے میدان میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے وہ جگہ کئی سالوں سے خالی اور ویران ہے اور اگر میرے بس میں ہوتا تو میں وہاں سے گزرتا ہی چھوڑ دیتا۔“

”یاد رہے آج بھی میرے راستے میں بیٹھی تھی اور بس مجھے ہی گھورے جارہی تھی۔“ محسن پریشانی کے عالم میں بولا۔

”کون..... وہ حسین؟“ میں نے مزاحیہ انداز میں بے ساختہ کہا تو وہ ناگواری سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

”کچھ خوف خدا کرو! وہ اور حسین استغفار! محسن نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

میں اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”یاد رہے کسی ناکی اپنے دور میں حسین تو ہو گئی تھی! اس سے کیا فرق پڑتا ہے اب وہ ستر اسی سال کے لگ بھگ ہے اور سونے پر سہاگہ کہہ دینی بھی ہے۔“

”تو اب میرا مذاق اڑا رہا ہے۔“ محسن غصے سے سر پاپو کر بولا۔

میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”اب اس کا کوئی حل بھی نہیں اس کے سوا کہ تو اس بوڑھی حسینہ کو اٹھا کر کہیں دور پھینک دے۔“

”تو اپنی کپڑاں بند کرے گا کہ نہیں۔“ محسن غصے سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں کچھ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”مجھے غلامت سمجھو مگر تم جس کے سامنے بھی یہ باتیں کہو گے وہی انہیں مذاق میں لے گا مگر خیر تمہاری پریشانی اپنی جگہ ہے۔“

پڑے۔ ہر جگہ شائد ارکار کر دگی کا مظاہرہ ہوا تھا جہاز بالکل پہلے جیسی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ سسٹر صوفیہ نے متاثر لہجے میں کہا۔

”دیکھ رہی ہو، کیا شائد ارکار ہو رہا ہے۔ جبکہ جب وہ قیدی کی شکل میں نظر آ یا تھا تو ایک وحشی ورنہ نظر آ رہا تھا۔“

”ہاں.....!“ میں نے بھی تھکی آواز میں کیا۔ اور سسٹر صوفیہ چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں۔

”کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں بس ایک عجیب سا احساس ہوا ہے آخر انسان کیا ہے، میں دنیا کو کیوں نہیں سمجھ پاتی سسٹر؟“

”واقعی سب کچھ بہت عجیب ہے۔“ صوفیہ نے اچھے لہجے میں کہا۔ ہم اسپتال کا جائزہ لیتے رہے۔ ملی کا شکار افسر بدستور زیر علاج تھا اس کے ساتھی اس کی نگہداشت کر رہے تھے۔ پھر ہماری نگاہ انکل ڈیزل پر پڑی وہ بھی وہیں موجود تھے ہم ان کے پاس پہنچ گئے وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔

”کیوں کیا محسوس کر رہی ہو؟“

”عجیب۔“

”ہاں، سب کچھ عجیب ہے۔ واسکوڈی کو دیکھا۔“

”جی۔ کیا ہے وہ۔“

”بہتر ہے، وہ کہتا ہے کہ اسے گارساں نے نہیں ایک کینے مسافر نے نقصان پہنچایا ہے۔ اور اب وہ روشاق کا دشمن بن چکا ہے۔“

”جہاز کب روانہ ہوگا انکل؟“

”میرا خیال ہے زیادہ دیر نہیں، گارساں واقعی اعلیٰ درجے کا کپتان اور انجینئر ہے۔ اس نے نئے لاؤڈ اسپیکر لگوائے ہیں جن پر وہ راڈی کا اعلان کرے گا۔“

”اور کوئی خاص بات انکل۔“

اور عدنان ثنائی موجود ہیں۔ عدنان ثنائی لنگڑا رہے ہیں۔ ”ہاں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔“

”دونوں موجود ہیں، ہاں تم روشاق سے دوبارہ کی ملوگی۔“

”جب آپ کہیں۔“

”جلدی نہ کرو۔ انتظار کرو کہ وہ خود تم سے رجوع کرے۔ ہاں اور اگر وہ کوئی پیش کش کرے تو قبول کر لیں۔ تھوڑا سا انتظار کرو۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“

دن کو سوا گیارہ بجے کے قریب جہاز میں ایک اجنبی آواز ابھری اور پھر تھراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کے انجن اشارت ہو گئے پھر لنگڑاٹھائے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اسپیکروں پر گارساں کی آواز ابھری۔

”جہاز کے محرز مسافروں کو زندگی کی مبارکباد مارشل اپنے سفر کا آغاز کر رہا ہے اپنا تعاون اسی طرح جاری رکھیں اور میرے بتائے ہوئے اصولوں پر قائم رہیں جو مذہ و داریاں آپ کو دی گئی ہیں انہیں انجام دیتے رہیں آپ کا کپتان آپ کو آپ کی منزل تک پہنچائے گا۔ شکریہ۔“

مسافر خوشی سے ناچنے لگے۔ موسم خوشگوار تھا دھوپ نکلی ہوئی تھی دور سے ہمیں عسکری نظر آیا اور نہ جانے کیوں مجھے ہنسی آ گئی، صوفیہ نے چونک کر مجھے پھر میری نظروں کا تعاقب کر کے عسکری کو دیکھا۔ پھر بولیں۔

”کیا ہوا۔ کیوں ہنسی آئی؟“

”بہت سی باتوں پر سسٹر..... مارشل پرستی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ صرف میں اکیلی اندھے پن میں سفر کر رہی ہوں، کچھ نہیں جانتی۔ آپ اخلاق کی قیدی ہیں اور یہ بہت سے سر بھرے، سر زمین مصر کے سرشتہ رازوں کی نقاب کشائی اور عسکری کاروبار کی عاشق، دولت کی ہوس کا شکار، انکل ڈیزل اور..... اور نہ جانے کیا کیا۔“

(جاری ہے)

”ہاں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔“

”دونوں موجود ہیں، ہاں تم روشاق سے دوبارہ کی ملوگی۔“

”جب آپ کہیں۔“

”جلدی نہ کرو۔ انتظار کرو کہ وہ خود تم سے رجوع کرے۔ ہاں اور اگر وہ کوئی پیش کش کرے تو قبول کر لیں۔ تھوڑا سا انتظار کرو۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“

دن کو سوا گیارہ بجے کے قریب جہاز میں ایک اجنبی آواز ابھری اور پھر تھراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کے انجن اشارت ہو گئے پھر لنگڑاٹھائے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اسپیکروں پر گارساں کی آواز ابھری۔

”جہاز کے محرز مسافروں کو زندگی کی مبارکباد مارشل اپنے سفر کا آغاز کر رہا ہے اپنا تعاون اسی طرح جاری رکھیں اور میرے بتائے ہوئے اصولوں پر قائم رہیں جو مذہ و داریاں آپ کو دی گئی ہیں انہیں انجام دیتے رہیں آپ کا کپتان آپ کو آپ کی منزل تک پہنچائے گا۔ شکریہ۔“

مسافر خوشی سے ناچنے لگے۔ موسم خوشگوار تھا دھوپ نکلی ہوئی تھی دور سے ہمیں عسکری نظر آیا اور نہ جانے کیوں مجھے ہنسی آ گئی، صوفیہ نے چونک کر مجھے پھر میری نظروں کا تعاقب کر کے عسکری کو دیکھا۔ پھر بولیں۔

”کیا ہوا۔ کیوں ہنسی آئی؟“

”بہت سی باتوں پر سسٹر..... مارشل پرستی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ صرف میں اکیلی اندھے پن میں سفر کر رہی ہوں، کچھ نہیں جانتی۔ آپ اخلاق کی قیدی ہیں اور یہ بہت سے سر بھرے، سر زمین مصر کے سرشتہ رازوں کی نقاب کشائی اور عسکری کاروبار کی عاشق، دولت کی ہوس کا شکار، انکل ڈیزل اور..... اور نہ جانے کیا کیا۔“

(جاری ہے)

میں حسن کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”پریشان مت ہووہ بے چاری کوئی مصیبت کی ماری ہوگی تم خواہ خواہ اس سے ڈر رہے ہو۔“
حسن خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”تم نے ابھی اس عورت کو دیکھا نہیں تم بھی دیکھو گے تو میری طرح ہی اس سے ڈرنے لگو گے۔“
مجھے اس کی بات سن کر پھر بھی آگئی اور میں اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی تم پر فریفت ہو چکی ہے۔“
حسن مجھے کھانچا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا اٹھا اور غصے سے میری دکان سے باہر نکل گیا۔

حسن اور میں یعنی فرید بیچپن سے ہی بہت گہرے دوست تھے۔ ہم نے میٹرک تک ایک ساتھ پڑھا تھا مگر بد قسمتی سے میرے والد صاحب نے مجھے میٹرک سے آگے پڑھنے نہیں دیا اور اپنے ساتھ دکان پر کام پر لگا لیا۔ ہماری اپنی کپڑے کی دکان تھی۔ میں بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ پوری دلچسپی سے کام کرنے میں مگن ہو گیا مگر میری اور حسن کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا ہمارا یہ دوستی کا رشتہ کسی خوشی رشتے سے کہیں زیادہ گہرا اور مضبوط تھا۔ حسن اب بی ایس سی کا طالب علم تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا وہ خوبصورت اور جیہ ہونے کے علاوہ بہت ذہین بھی تھا۔ مگر چند ماہ سے وہ عجیب صورتحال کا شکار تھا، ایک بڑھیا ہر وقت اس کی گلی میں بیٹھی رہتی تھی حتیٰ کہ جب وہ رات گئے بھی گھر لوٹا تو وہ گلی میں موجود ہوتی۔ حسن کا خیال تھا وہ بڑھیا ضرور کوئی آسیب ہے جبکہ میں اس کی باتوں کو محض اس کا وہم خیال کرتا تھا۔

کیونکہ میرا یہی خیال تھا وہ عورت کوئی مصیبت زدہ ہوگی کیا ہے اس کی کیا جھوڑی تھی جو وہ رات گئے تک لاوارثوں کی طرح گلی میں پڑی رہتی تھی۔ حسن تقریباً روز ہی آکر اس بڑھیا کے متعلق اپنے خوف کا اظہار کرتا تھا مگر میں نے اس کی باتوں کو اتنا بنجیدہ نہیں لیا تھا۔ چند ماہ سے میرا بھی حسن کے گھر چکر نہیں لگا تھا میں خود بھی

دوستوں کی طرف اتنا جانا پسند نہیں کرتا تھا جبکہ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی کیونکہ سب ہی مجھ سے دکان پر آکر ملنے لیتے تھے حسن کی بات الگ تھی وہ میرے گھر میں بھی آ جاتا تھا میرے گھر والے اسے گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے تھے۔ حسن کو اس بڑھیا کے حوالے سے میں خوب چیخڑا کرتا تھا اور جان بوجھ کر اسے کوئی ناکوئی فقرہ کس کر چڑایا کرتا تھا۔ وہ بے چارا اکثر غصے سے آگ بگولا ہو جاتا کرتا تھا۔

میں آج تک نہیں بھولا اس رات کو جب حسن مجھ سے ملنے میرے گھر آیا تھا اس رات سردی بہت زیادہ تھی رات کا کوئی دس بجے کا وقت تھا اسے اس وقت اپنے مرکزی دروازے پر دیکھ کر میں حیران رہ گیا اس وقت پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی اس کا جسم کانپ رہا تھا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا، میں فوراً اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور صوفے پر اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ ”کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو؟“ میں اس کا ہاتھ لے کر بولا۔ حسن کھوٹے ہوئے انداز میں بولا۔ ”ہاں..... ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں بدستور اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”بالکل نہیں ہوا تم ٹھیک بتاؤ کیا بات ہے؟“
وہ اٹھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یار چند روز سے میں عجیب کنگش میں مبتلا ہوں اکثر سوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں قبرستان میں پڑا ہوں قبر کی مٹی کی بو اپنی سانسوں میں جاتے ہوئے محسوس کرتا ہوں میں! اور..... اور میرے ارد گرد قبرستان کے ہولناک سنانے میں جھینگروں کی کان کے پردے بھاڑ دینے والی آوازیں سنائی دیتی ہیں میں تجھے کیا بتاؤں مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ اپنا سر جڈ کر بولا۔

میں اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”پریشان مت ہوا یہ خوابوں سے تمہاری عمر لمبی ہوگی۔“
حسن بے چینی سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیسے پریشان نہ ہوں آج تمہارے پاس آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمہیں ان دوسووں کا بتا سکوں جو ہر وقت میرے دماغ پر سوار رہتے ہیں آج میں ایک

نجوی کے پاس گیا تھا اس نے میرے متعلق بہت سی ایسی باتیں بتائیں جن کو سن کر میں حیران و پریشان رہ گیا۔“
میں حیرت اور دلچسپی کے ساتھ اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس نے مجھے بتایا کہ میرے ہاتھ سے زندگی کی لکیر مٹ چکی ہے اور میں مر جاؤں گا، اس نے مجھے یہ بھی بتایا میرے اوپر ایک خطرناک آسیب کی نظر ہے اور یہ کہ.....“ وہ گھبراہٹ کے عالم میں اپنی بات مکمل نہ کر پایا بات جیسے اس کے حلق میں ہی انک گئی تھی میں محل سے بولا۔ ”اور کیا بتایا اس نے؟“

وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ”اور یہ کہ وہ آسیب مجھے مار ڈالے گا۔“ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ خوف سے کانپ اٹھا۔

”اوہ میرے خدایا۔“ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ”ایک تو تم پہلے ہی وہی ہو اور پھر تجھے لوگ بھی ایسے ملتے ہیں جو تجھے طرح طرح کے دوسووں میں مبتلا کر دیتے ہیں میرا بس چلے تو ایسے لوگوں کا بہت برا حشر کروں۔“

”اس نے کچھ غلط نہیں کہا فرید وہ بڑھیا ہی آسیب ہے اور وہ مجھے مار ڈالے گی۔“ حسن یوں غلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا جیسے کسی ان دکھی آفت کو اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس کر رہا ہو۔

”سب بکواس ہے۔“ میں غصے سے چیخ پڑا۔ ”میرا یقین کرو یہ سب بکواس ہے۔“

حسن نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں خوف اور ہیبت تھی۔ ”میں کیا واقعی مر جاؤں گا فرید؟“

”تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا مت مجھے دیکھی کرو ایسی باتیں کر کے۔“ میں پریشانی سے بولا۔

مگر اس نے جیسے میری بات کو سنا ہی نہیں۔ ”میں مرنا نہیں چاہتا پلیز میری مدد کرو۔“ وہ رو دینے والے انداز سے بولا میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا یہ سب نجوی فراڈ ہوتے ہیں

مت یقین کرو ان کی باتوں کا۔“

میری بات سن کر حسن نے مزید کچھ نہ کہا بس چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا پھر واپس چلا گیا۔ حسن کے جانے کے بعد میں رات کافی دیر تک جاگتا رہا پھر جب مجھے نیند آئی تو میں نے خود کو ایک ویران کھلے میدان میں پایا وہاں ہر طرف خاموشی اور ویرانی کا راج تھا دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا رات کا پھر تھا اندھیرا میرے چاروں طرف تھا مگر اس کے باوجود میری آنکھیں ہر چیز کو واضح طور پر دیکھ رہی تھیں میں پریشانی کے عالم میں آگے بڑھنے لگا یکدم میری نظر ایک بڑی چادر میں لپٹے ہوئے دوجو پر پڑی جو اپنے کھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس دوجو کے پاس پہنچا تو دفعتاً میں ٹھٹک گیا۔ ”آگئے تم۔“ ایک خوف ناک بوڑھی آواز سنائی دی۔

”تنت.....“ تم کون ہو؟ میں حیرت سے اس کی کچلی چادر میں لپٹے ہوئے دوجو کو دیکھ کر ہلکا ہوا۔

اس نے اپنا سر اٹھایا تو میں ایک لمحے کے لئے مسٹ پنا کر رہ گیا وہ ستراسی سال کی بوڑھی عورت تھی سر اٹھاتے ہوئے اس کی چادر سر سے کھسک گئی تھی اس کی زرد آنکھوں اور بے تحاشہ بھریوں نے مجھے دیکھ کر مجھے جھرجھری سے آگئی اس کے چھوٹے سے سر پر ایک بال بھی نہ تھا۔

”کون ہو تم؟“ میں نے اپنا سوالیہ پھر دہرایا اس کی ہولناک آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”حسن کی موت“

اس کا جواب سن کر میں چونک گیا اسی ساعت مجھے چند غرغرائیں سنائی دیں میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو خوف سے لرز گیا وہی بوڑھی عورت ایک نوجوان کی گردن کو دوپٹے اس کا زرخرہ بھٹھوڑنے میں مصروف تھی اور وہ نوجوان کوئی اور نہیں حسن تھا میں تڑپ اٹھا۔ ”رک جاؤ۔“ میں نے چیخنے ہوئے اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ ”کیسا خوف ناک خواب تھا۔“



نیلی کوٹھی

صابر مضافان - پنڈو داؤخان

اچانک لڑکی کو اپنی گردن میں یک بیگ ہزاروں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں اور پھر اس کی گردن ہلٹیں سمیت کو گھومی اور کڑک کی آواز کے ساتھ ہی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی اور فضا دلخراش چیخوں سے.....

لفظ لفظ خوف و ہشت میں جلا کرتی خوفناک ڈراؤنی دہشت ناک اور تیرا گھیر خونی کہانی

کسی لئے جیسے قافلے کی مانند ہر اس انظروں سے ارد گرد بکھیتی آگے بڑھ رہی تھی اس کے ہر زخموں سے چور چور تھے۔ سانس بھی اپنے توازن پر نہ تھا۔ ہر قدم آگے کی طرف بڑھانے کیلئے اسے منوں ہمت کرنا پڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں نیم مدہوشی لئے ارد گرد ڈھلکی ہوئی وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی وہ چاند کو شرادے کی حد تک حسین بھی مگر اب اس کے چہرے صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ہری ہری گاس پر جمی اس بہت خوشگوار تاروے رہی تھی۔ فضا میں عجیب طرح کی دلکش تھی سرسوں کے پھولوں سے نکرا ہوا اپنے ساتھ لاتی پھولوں کی خوشبو ہر سو بکھیر رہی تھی۔ مٹی کے کچے مکانوں سے بکریوں کے ریوڑ کے ریوڑ نکل کر چراگاہ کی جانب گھرنے تھے۔

کیا ہو رہا ہے۔ میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے روتے ہوئے بولا۔ تم نے خود کشی کیوں کی؟ وہ تکلیف دہ لہجے میں بولا۔ میں نے خود کشی نہیں اس رات میرا دل گھبرا رہا تھا میں چھت پر تازہ ہوا میں گیا جب میں چھت سے نیچے دیکھ رہا تھا تب مجھے لگا کسی نے اچانک مجھے اٹھا کر نیچے کی طرف دھکا دے دیا اور..... جب میرا جسم زمین سے ٹکرایا تو تب میں نے بڑی مشکل سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو مجھے ایک ہیولا سا وہاں کھڑا دکھائی دیا پھر وہ غائب ہو گیا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

میں حیرانگی کے عالم میں حسن کے منہ سے یہ تفصیل سن رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے حسن پر پھر کچھ دیر بعد غشی طاری ہوئی اور پھر اس کے بعد اس کی آنکھیں پھر کبھی نہ کھلیں، اسی بے ہوشی میں ہی اس کی موت ہو گئی میں غم سے اس قدر غمگین تھا کہ حسن کی موت کا سنتے ہی ہاتھوں کی طرح حسن کی گلی کی طرف بھاگا جہاں وہ بوڑھی عورت بیٹھا کرتی تھی مگر کتنی حیرت کی بات تھی جب میں وہاں پہنچا تو اس عورت کا کہیں بھی نام و نشان نہ تھا۔

حسن کی موت کے ساتھ ہی وہ عورت بھی وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ آج حسن کو مرے ہوئے کئی سال بیت چکے ہیں مگر حسن کی پراسرار باتیں اور بہت سے سوالات مجھے آج بھی چین سے رہنے نہیں دیتے وہ عورت کون تھی کیا وہ واقعی آسیب تھی اور حسن کی موت کا باعث وہی تھی؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب نہ میرے پاس ہے نہ ہی کسی اور کے پاس! مگر یہ بھی حقیقت ہے حسن کی موت کے بعد میں روزانہ ایک عرصہ تک حسن کی گلی میں جانا رہا اور اس خالی میدان کو دیکھتا رہا جہاں وہ بوڑھی عورت بیٹھا کرتی تھی مگر وہ عورت پھر کبھی دکھائی نہیں دی۔

میں نے کال اینڈ کی تو دوسری طرف حسن کے بھائی کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنا کی دی۔ فردی بہت برا ہوا ہے حسن نے خود کشی کی کوشش کی ہے۔ کیا۔ میں حیرت سے اچھل پڑا۔ مگر کیوں..... اب آپ کہاں ہیں؟ حسن کا بھائی تیزی سے بولا۔ اسپتال میں ہیں ہم سب تم بس جلدی سے یہاں پہنچو اسپتال کا نام نوٹ کرو۔ اسپتال کا نام سنتے ہی میں فوراً اسپتال پہنچا میری گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ میں جس حلیے میں سوکراٹھا تھا ہی میں اسپتال چلا آیا تھا حسن کے تقریباً سب ہی گھر والے اس وقت وہاں موجود تھے اور پریشانی کے عالم میں خدا سے حسن کی زندگی کی دعا مانگ رہے تھے حسن کی حالت کافی سربلین تھی اس نے اپنے تین منزلہ مکان سے کوڑ کر خود کشی کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں اس کے سر پر شدید چوٹیں آئیں تھیں اور ہتایا جا رہا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر بہت گہری اور خطرناک چوٹ آئی تھی ڈاکٹر ز حسن کو بچانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے مگر ساتھ ڈاکٹر نے یہ بھی غصہ ظاہر کیا تھا۔ اگر حسن بچ گیا

پھر بھی ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ کی وجہ سے وہ معذور ہو سکتا ہے۔ یہ خبر انتہائی افسوس ناک تھی۔ مگر ابھی ہم سب تمام انڈیشیوں سے بالاتر ہو کر حسن کے بچ جانے کی دعا مانگ رہے تھے۔ شام تک حسن کو کچھ ہوش آیا ہوش میں آتے ہی اس نے مجھے اپنے پاس بلایا حسن کا سارا سر نیچوں سے لپٹا ہوا تھا اور اس کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا میں اس کی حالت دیکھ کر رو پڑا۔ وہ با مشکل بولا۔ تم نے دیکھ لیا میرے ساتھ



چنگھاڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

”کیا.....؟ بارش تیز ہوگئی ہے؟ تم فوراً کسی چیز کی اوٹ میں ہو جاؤ۔ اگر تمہیں فوراً ہو گیا تو ہمارے کسٹمرٹ کا تو ستیاناس ہو جائے گا۔“ مشہور پاپ سٹار ڈوالٹرین اپنے میوزیکل گروپ کی ساتھی ”آیوشی“ سے بات کر رہا تھا۔

”ایک منٹ رکو آیوشی! مجھے دور کہیں سے کوئی مکان سا نظر آرہا ہے شاید مجھے وہاں کوئی پناہ مل سکے۔“ ڈوالٹرین نے فون بند کیا اور پھرتی سنبھالا ہوا مکان کی سمت بھاگے لگا۔ بارش بھی آج خوب جی بھر کر برس رہی تھی۔

مکان تک پہنچتے پہنچتے بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اور مکان کے اندر داخل ہونے تک بارش بالکل ہی ختم ہو چکی تھی۔ تاہم ہر چیز ابھی بھی گیلی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کا پیچھا چھوڑا اور وہ اونٹن سے زمین پر جاگرا۔ لان کی گیلی میں نے اس کے کپڑوں کا حشر نشر کر دیا تھا اس کے گلے میں موجود سونے کی چین بھی کچھڑ میں لٹ پت ہوگئی تھی۔ یہ چین انتہائی مہنگی تھی سونے کی زنجیر میں ہیروں سے بنا ہوا چھوٹا سا گائڈ لنگ رہا تھا۔

ڈوالٹرین نے بے بسی سے اپنی لاکھوں کی مالیت چین کو کپڑوں میں لٹ پت دیکھا اور اسے صاف کرنے کی غرض سے پانی کی تلاش میں اور گرد و نگاہ دوڑائی وہ ایک ٹکون عمارت تھی۔ جس پر گہرے نیلے رنگ سے روغن کیا گیا تھا اس کے وسط میں ایک بہت بڑے الو کا مجسمہ قرارے کے طور پر نصب کیا گیا تھا جس کی آنکھوں اور منہ سے پانی کی موٹی موٹی دھاریں نکل رہی تھیں۔

ڈوالٹرین اٹھ کر تیزی سے اس جانب آیا اور اپنی چین قرارے کے پانی سے دھونے لگا اچانک چین اس کے ہاتھوں سے پھسل کر قرارے کے پانی میں غائب ہوگئی وہ بانگوں کی طرح پانی میں ہاتھ مارنے لگا۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ قرارے کی زمین اس کے ہاتھوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اس کے

جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی مگر اب پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ سمت کے اندازے لگاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئی گئی۔ بائیں بھی ہولناک اندھیرا اس کا منتظر تھا۔ ڈر کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ پالکوں کی آواز کا دوبارہ ظہور پذیر ہونا اس پر مزید افتادہ پا کر رہا تھا۔

اب وہ آواز اس کے قریب تر ہوتی جا رہی تھی گھبرا کر اس نے ریٹک پر ہاتھ رکھا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی کیونکہ چھن چھن کی آواز نیچے کی جانب سے آ رہی تھی۔ اس کے میڑھیوں پر قدم رکھتے ہی آواز آنا بھی بند ہوگئی تھی سیڑھیاں ختم ہوتے ہی اس نے اس عمارت کی دوسری منزل پر قدم رکھا اور وہیں بیٹھ کر سر جھکا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ کسی سرسراہٹ کی آواز پر اس نے جونہی اوپر سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی روح فنا ہوگئی وہی پراسرار لڑکی اس کے اوپر چھلی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ حیا فوراً ہی کھڑی ہوئی اور پیچھے ہٹی۔

”کیو آئی ہے تو یہاں؟“ لڑکی غصے سے دھاڑی حیرت انگیز طور پر اس کے صرف ہونٹ مل رہے تھے چہرے کے تمام عضلات بالکل ساکت تھے۔ ”مم..... میں..... میں یہاں۔“ حیا کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو گیا تھا وہ اگلے قدموں چلنے لگی کہ اچانک ہی اسے اپنی گردن پر کسی شے کا احساس ہوا وہ کوئی غیر انسانی پنجہ تھا..... سیاہ گھنے بالوں سے بھرا ہوا..... دیکھتے ہی دیکھتے اس غیر مرئی بچے کی گرفت حیا کی گردن پر سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔

حیا کی آنکھیں باہر کو پلٹنے لگی تھی پراسرار لڑکی بے تاثر چہرہ لئے زندگی کی آخری سانسیں لیٹی حیا کو کچے جا رہی تھی عین اسی لمحے مگر بے سیاہ بادل چاند پر چھا گئے اور چاروں طرف اندھیرا جمیل گیا۔ جیسروں نے نیند کی وادی میں جانے سے قبل آخری بار اپنی نخوس

وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھی کہ لائٹ ایکدم آف ہوگئی اور پوری عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ اس نے اچانک باہر نکلنے کی کوشش کی تو اندھیرے کی وجہ سے کارز میں رکھے گلدان سے ٹکرائی گئی گلدان اس کے سر سے اس زور کا ٹکرایا کہ اسے اپنے چاروں طرف تارے سے نظرا آنے لگے۔ بالوں سے بہتی ہوئی نمی سے احساس ہو رہا تھا کہ چوٹ گہری ہونے کی وجہ سے خون بھی بہہ رہا ہے۔ اور پھر گھٹا ٹوپ اندھیرے کی وجہ سے اسے کمرے سے باہر نکلنے کا رستہ بھی نہیں مل رہا تھا خوف کی وجہ سے اس کے سانس دھونکی کی طرح چلنے لگی۔

کالی ویر بعد چاند اپنے پورے جون پر تھا کھڑکی سے چاندنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ باہر چلنے والی ہلکی ہوا سے مظلوم ہو کر کھڑکی پر لگے سفید باریک پردے ادھر ادھر لہرا رہے تھے ہمت کر کے وہ کھڑکی ہوئی اور کھڑکی تک آئی چاند کی چاندنی میں باہر کا ماحول بہت پراسرار لگ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف پشت کر کے کھڑی ہوگئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

معا ہے چھن چھن کی آواز آنے لگی۔ وہ بہت بھاری آواز تھی۔ جیسے کسی نے بہت بڑے بڑے اور بھاری ٹھنکھ دبانہ رکھے ہو۔ ابھی وہ اسی بات پر غور کر رہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے کھڑکی کے دوسری طرف کسی اور وجود کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف پھیرا تو جیسے اس کی آنکھیں پتھر اگئی وہ کوئی فریبی مائل لڑکی تھی جس نے اپنے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی لمبی تھی وہ میکانیکی انداز میں کھڑکی سے ہوتی ہوئی گزر رہی تھی چلتے ہوئے جونہی اس کا شالہ کھڑکی کے شیشے سے مس ہوا تو شیشے میں وہیں باریک سی دراڑ پڑ گئی جیسے وہ اس لڑکی کے وجود کا احساس سہ نہ رکھا ہو۔ وہ لڑکی حیا کی موجودگی سے سکرا لگ رہی تھی۔ حیا کے تو جیسے کاٹو بدن میں ابونئیں..... وہ

ڈرڈائجسٹ کا مشہور و معروف سلسلہ

نمبر 5 اور 6

رولو کا

پراسرار قوتوں کا مالک

مکمل اور طویل ترین داستان حیرت کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قط نمبر 47 سے قط نمبر 58 تک

قط نمبر 59 سے قط نمبر 70 تک

تحریر: اے وحید قیمت فی کتاب = 150/-

نادیدہ قوتوں کی زور آزمائی، کالی دنیا کی بدردھوں کی شرانگیزی، جنات کی دیدہ دلیریاں، خون کی آتماؤں کی تحیر انگیز اور حیرت انگیز ناقابل فراموش ہاتھ پائی اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے خونچکاں بھونچکاں معرکہ جیسے پڑھ کر پڑھنے والے مہبوت اور انگشت بدنداں رہ جائیں گے اور طویل ترین عرصہ تک یہ تمام کہانیاں ذہن کے پردے پر جھلکتی رہیں گی۔

ڈرڈائجسٹ کی کیشنز کتاب مارکیٹ لیو اور ویا انکر اچی

Ph: 32744391

ساتھ ہی کسی کھلونے کی طرح اس کی ٹانگیں اوپر فضاء میں معلق ہو گئیں اور پل بھر میں چھ فٹ کا یہ انسان فوارے کی عام سی گہرائی والے پانی میں غرق ہو گیا تھا۔ فضاء میں پہلے جیسا سکون چھا گیا تھا۔ البتہ الو کے مجسے کے منہ اور آنکھوں سے پانی کی موٹی دھاروں کی بجائے اب تازہ تازہ گاڑھا خون باریک دھاروں میں نکل رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

تارکول کی سڑک پر دو رنگ جھٹکے مسلے ہوئے چہ بکھرے پڑے تھے۔ اس کے قدم ٹھنڈی نم سڑک پر دھیسے پڑنے لگے تھے ایک بوڑھی راہجو عورت گدھا گاڑی پہ گھاس کے گھنڑ رکھے گدھے کو ہانپتی آ رہی تھی سمیتوں کے کنارے ویران پڑے سفید پھولوں کے جھنڈ تھے آسمان پر گھنے بادل منڈلا رہے تھے۔ سنبل کے درختوں کا طویل سلسلہ آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا بیٹگی ہوا کی شرارت سے سنبل کے لالچے درخت ذرا سا جھٹکتے تو روٹی کے سفید گالوں سے فضاء بھر جاتی۔

گر اگر مگر کافی کاگ تھ میں کپڑے وہ کوئی بارڈا ڈائجسٹ پڑھنے میں مگن تھی۔ لان میں ہر سو چاندی چمکی تھی سبک روٹی سے چلتی ٹھنڈی ہوا سے گل بوٹے سرشاری بھڑے انداز میں جھومتے گویا وعدہ لاشریک کی حمد و ثناء میں مصروف تھے دور کہیں سے لاڈا ایتیکر میں پڑھائی جانے والی ترواح میں کی جانے والی قرأت کی خوش الحان آواز ایک تواتر سے سماعتوں میں مقدس بھرا سر گھول رہی تھی

”بی بی جی! کھانا لگا دیا ہے“ ان کی خاندانی ملازمہ ”رضیہ“ نے آ کر بتایا اور واپس پلٹنے ہی لگی تھی کہ اسے رکنا پڑا۔

”جی افق بی بی!“ رضیہ اب اپنے ہاتھ، میلے دوپٹے سے پونچھ رہی تھی۔

”تم نے کبھی کوئی ایسا گھر دیکھا ہے؟ جہاں بھوتوں کا بئیرا ہو اور وہ وہاں آنے والے ہر بندے کو مار دیتے ہوں۔“ افق اب ڈائجسٹ بند کر کے رضیہ

سے پوچھ رہی تھی۔

”فضول باتیں ہوتی ہیں یہ ساری، کسی اور کے سامنے مت کہنا ورنہ لوگ تمہیں خطبی سمجھنے لگیں گے۔“ رضیہ کی بجائے افق کی بڑی بہن ماہین نے جواب دیا اور اٹھ کر اندر کی طرف چل دی یہ دیکھتے ہوئے افق نے بھی ڈائجسٹ میز پر رکھا اور ماہین کے پیچھے چل پڑی۔

”میں نے ایسا گھر دیکھا ہے بی بی جی۔“ رضیہ کی آواز پر افق کے چلتے قدم رک گئے۔

”اوہ ریٹلی.....؟ مجھے لے چلو گی وہاں؟“ افق نے اشتیاق سے کہا۔ جس پر رضیہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

عید الفطر سے فارغ ہو کر افق اب رضیہ کے آبائی گاؤں میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے رنگ میں قدیم طرز کی ٹکنوئی عمارت تھی۔ جو نیلے رنگ سے مکمل طور پر ڈھکی ہوئی تھی۔ ”یہ تو ابراہام مصر کی طرز کا کوئی شاہکار رنگ رہا ہے۔“ افق نے عمارت کی خوبصورتی کو سراہا۔ ”جی! یہ ہمارے گاؤں کے وڈیرے چوہدری گھڑا خان کی کوشی ہے۔ انہوں نے بڑے چاؤ سے یہ کوشی بنوائی تھی نیلا رنگ ان کی لاڈلی بیگم ”زرتا“ کا پسندیدہ رنگ ہوا کرتا تھا اسی لئے انہوں نے اس کوشی پر بھی نیلا رنگ کروایا تھا۔ اس کے فرشوں پر تمام قالین نیلے رنگ کے ہی بچھائے گئے تھے فرنیچر بھی نیلے رنگ کا تھا غرض کہ اس کوشی کی ہر چیز کو نیلے رنگ میں نہلا دیا گیا تھا سوائے پردوں کے۔۔۔ پردے وڈیرا سائیں نے اپنی پسند کے رکھوائے تھے۔

حمیر ہوا چلنے کے سبب جب سفید پردے نیلے فرنیچر اور نیلی دیواروں والے لمبے کمروں پر لہراتے تو یہ منظر بہت بہت خوف ناک سا لگتا مگر انفس۔۔۔ کہ خواہوں کا یہ کل وڈیرا سائیں اور ان کی بیگم کو نصیب نہ ہو سکا اور وہ دونوں اس سپنوں کے محل کے کبھی باسی نہ بن سکے۔ رضیہ سانس لینے لگے۔

”کیوں.....؟ آخر کیا ہوا تھا؟“ افق نے استفہار کیا۔

”وہ ایک روشن دن تھا زرتا بڑے چاؤ سے شیشے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ اس نے نیلے صفوں کی بھڑکیلی ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر سلور رنگ کا پڑاؤ کیا گیا تھا۔ سلور رنگ کے بڑے بڑے ستارے نقشی دیکھی اور سلور گوٹے کنارے کا کام، اس گہری نیلی ساڑھی کو ایک جلا بخش رہا تھا۔ سیاہ گھوڑا نکھیں اور شکرنی لیا، دبا پتلا نازک سر اپا اور صبیح ملکوتی نقوش سے سجا چہرہ۔ وہ اتنی خوبصورت تھی جتنی اس دنیا کی کوئی بھی لڑکی ہونا چاہتی تھی۔ اس کی جلد اتنی شفاف اور بے داغ تھی کہ لگتا تھا دو دھیا سوسے اس کا سانچا ڈھالا گیا تھا۔ ذرا سا بھی کسی نے چھوا تو مٹلی ہو جائے۔

ایک پل کیلئے بھی جو ساکت ہو کر ٹپٹھکی تو اس پر کسی معصوم کی حسین تصویر کا گمان ہونے لگا۔ اس دنیا میں دلکش چہروں کی کمی نہیں ہے مگر اس میں بلاشبہ کچھ ایسا ضرور تھا جو الگ تھا..... اور منفرد تھا۔

وہ..... اور وڈیرا سائیں، خواہوں کے اس نیلے محل میں رہائش کی پہلی رات ہی مردہ پائے گئے تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے بے جان زرد جسموں کے پیچھے کیا ہوا تھا؟ اب تو بس سب لوگ اتنا ہی جانتے ہیں کہ جو کوئی بھی اس نیلی کوشی میں جاتا دیکھا گیا۔ دوبارہ وہ اس دنیا میں نظر نہیں آیا۔ ”رضیہ نے سر جھکا لیا۔“

”ان بلیو ہیل.....“ افق ناقابل یقین انداز میں بولی۔

”زرتا بیگم کو نیلے رنگ سے عشق تھا..... جنون تھا..... وہ ہر وقت نیلے رنگ کو کسی نہ کسی صورت میں پاس رکھتی تھیں۔ کبھی نیلی انگوٹھی نیلے ٹنگن، نیلے کپڑے، نیلے پتھر کی چوڑیاں، حتیٰ کہ نیلے جوتے بھی انہیں دیوانگی کی حد تک نیلے رنگ سے عشق تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگ تو یوں بھی کہتے تھے کہ ”زرتا جیسی حسین صورت بنی ہی نیلے رنگ کیلئے ہے۔“ انہوں نے اپنی وصیت میں کہہ رکھا تھا ”مرنے کے بعد اسے کفن بھی نیلے رنگ کا دیا جائے اور اس کی قبر پر نیلے ماربل کے پتھر لگائے جائیں۔“

میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی میت کو نیلے

رنگ کے کفن میں دیکھا تھا۔ خوبصورتی میں چاند کے مقابلے پر آتے والی زرتا، اس وقت نیلے رنگ کے کفن میں بہت عجیب لگ رہی تھی۔ اسے ایسی بھونڈی وصیت نہیں کرنی چاہیے تھی جس کی اس نے سزا بھی پائی۔ ”رضیہ کو افق کی آواز پر اچانک چپ ہونا پڑا۔

”کیسی سزا؟ کیا مرنے کے بعد زرتا کے ساتھ کچھ ہوا تھا؟“ افق کو لگ رہا تھا کہ رضیہ من گھڑت کہانی سن رہی ہے۔

”وڈیرا سائیں کو دفنانے کے بعد جب لوگ زرتا بیگم کی میت کو قبر کی طرف لے جا رہے تھے کہ نہ جانے کہاں سے بھیڑیوں کی خونخوار فوج نمودار ہو گئی۔ چونکہ قبرستان گاؤں سے کچھ فاصلے پر ہے اس لئے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بھیڑیے جنگل کی طرف سے آئے ہوں گے بھیڑیوں کی اچانک افتاد سے گھبرا کر لوگوں نے زرتا بیگم کی میت کو وہیں چھوڑا اور لے قدموں بھاگ نکلے۔

اگلی صبح اس جگہ لوگوں نے دیکھا تو میت کی ہڈیاں تک غائب تھیں بس کفن کی نیلی چادر کے حصے اس جگہ بکھرے پڑے تھے۔ لوگوں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور تو یہ تو یہ کرنے لگے۔ وہ عذاب خداوندی تھا۔ ”رضیہ دور غلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی۔

”نہیں..... وہ عذاب خداوندی نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے کفن کے لئے سفید کپڑا ہونا کوئی شرط تو نہیں..... لوگ تو اپنے مردوں کیلئے یہ رنگ محض اس لئے چنتے ہیں کہ ”سفید“ پاکیزہ رنگ ہے۔ ورنہ کفن کیلئے کپڑے کا سفید ہونا کوئی شرط تو نہیں ہے۔“ افق کو رضیہ کی سنائی گئی کہانی پر ذرا برابر بھی یقین نہیں آیا تھا۔

”اگر آپ کو لگتا ہے کہ کفن کے لئے کپڑے کا سفید ہونا شرط نہیں ہے تو آپ بھی اپنے لئے نیلا کفن سلوا لیجئے گا۔ ورنہ میرے خیال میں تو پروردگار کے سامنے جانے کے لئے پاکیزہ ترین رنگ سفید کا ہی انتخاب کرنا چاہئے۔“ رضیہ نے سرد لہجے میں

کہا اور وہاں لوٹ گئی۔

”تم..... دو ٹکے کی نوکرانی..... تجھے تو میں چھوڑ دیتی ہوں..... بڑی آئی کیٹ ملڈن کی ہم شکل.....“

”افق مارے غصے کے بے قابو ہوئے جاری تھی۔ اور جو منہ میں آیا بول رہی تھی جبکہ رضیہ اس کی باتوں سے بے نیاز دور نکل گئی تھی۔

جون خیر بے رحم تلامذہ لہریں جب سمندر کے سینے پر ادا جم جاتی، شور برپا کرتی ادھر سے ادھر بھاگتی پھرتی ہیں تو یوں لگتا ہے، کوئی ان کے طوفانی تہوں پر بند نہیں باندھ سکتا..... کسی انہونی کا پیش خیمہ بنی سرسراہٹ ہوائیں اور خوفناک جواد بھانا، پچھائیں کھاتے سمندر کو ہیپ ٹاک بنا دیتا ہے۔ بھیرے ہوئے پانی کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے جیسے دنیا پر کرب جانے کا گھر کچھ دیر بعد اس طوفان کا نام و نشان تک نہیں ہوتا اور سمندر کی مفتوح کی طرح چپ چاپ قصور دار نظر آنے لگتا ہے۔ تجسس اور خوف کا ایک ایسا ہی طوفان افق کے دل میں اٹھا اور اس نے نیلے رنگ کی اس کوٹھی میں جانے کی ٹھان لی۔

اس نے وکٹوریہ بیگم فیشن لائن کا وہ ٹاپ پہنا تھا جو اس کی وارڈ روپ میں سب سے زیادہ مہنگا تھا اور شان دار بھی..... ٹاپ شولڈر لیس تھا شولڈر کوکور کرنے کے لئے اس نے ٹاپ کی ہم رنگ سفید آدمی آستینوں والی جیکٹ پہنی۔ وائنٹ ٹاپ کے اوپری حصے پر گولڈن ٹیکسٹوں کا ستاروں جیسا چمک کاؤ تھا اور یہی اس ٹاپ کی دلکشی تھی وہ ایک بہترین مغربی لباس تھا جو گھٹنوں تک تھا اس کے ساتھ ہی اس نے سفید ٹائٹس پہنا۔ ہائی ہیل اور گلے میں قیمتی نعلیں..... یہ ڈریس اسے اس کی کزن انوری نے برطانیہ سے بھجوا دیا تھا۔

نیلے کوٹھی میں جانے کے لئے وہ بالکل کسی پارٹی کی طرح تیار ہوئی تھی کچھ دیر میں وہ اپنی مطلوبہ جگہ تھی گیٹ ہلکا سا زور لگانے پر کھٹکا چلا گیا۔ اندر ہوا کا عالم طاری تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتی گئی الو کی ساخت پر سبے فوارے سے نکلتا پانی بہت دلکش لگ رہا تھا۔ اس کوٹھی کے حسن کو دیکھ کر وہ حیران ہوئے

جاری تھی رضیہ کی بتائی جی سب باتیں سچ معلوم ہو رہی تھیں۔ اندر ہر چیز نے نیلے رنگ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اتنے پیش قیمت ڈریس میں چلتی ہوئی وہ کوئی شہزادی لگ رہی تھی۔ دفعتاً اسے اپنے کندھوں پر بہت سارا بوجھ محسوس ہوا جیسے کسی نے ٹٹوں کے حساب سے اس پر بوجھ لا دیا ہو بوجھ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ وہیں چٹختی چلی گئی۔ اس کے بعد بھی بوجھ کم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ سفید ٹاپ میں لمبوں، گولڈن ہال کرپس، پھرائے اس وقت وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

بوجھ کی شدت میں مزید اضافہ ہوا اور اس کے منہ سے کراہ سی نکلی یہ مشکل اس نے گردن اٹھا کر ادا کر دیکھا تو اسے آسمان گھومتا ہوا محسوس ہوا اس کے کندھے پر ایک چھپیں ستائیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی اس لڑکی کی ٹانگیں لنگ کرافٹ کے سینے پر آ رہی تھیں افق کے منہ سے جیج سی نکلی۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہوتی وہ بھیایک لڑکی آنا فلانا غائب ہو گئی۔ سارا بوجھ بھی یک ٹٹ ہٹ گیا تھا۔

افق ایک بہادر لڑکی تھی۔ اس کی یہی عادت اسے یہاں تک لاتی تھی اس نے خوف زدہ ہونے کی بجائے وہاں سے بھاگنے کی ٹھانی۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھی اور سہٹ دوڑ لگا دی۔ ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ چھت سے لکڑی کا ایک بہت بڑا شہتیر اس پر آگرا، مگر وہ خوش قسمت تھی کہ بچ نکلی۔ اور شہتیر محض اس کی کمر کی جلد کو چھیلے ہوئے نکل گیا تھا۔ وہ سانسوں سانس تھی کمر پر شدید جلن کا احساس بھی ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور کمرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

اب وہ ایک تنگ سی راہداری میں تھی۔ دروازے میں لگی کیلوں کی وجہ سے اس کا قیمتی سفید ٹاپ اب چھتروں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ چہرے پر بھی جگہ جگہ خراشیں تھیں اسے وہ کوٹھی کے بیرونی حصے میں آگئی تھی جہاں اسے اس کی پرانی کلاس فیلو ”حیاء“ نظر آئی۔ وہ بھاگ کر گئی اور حیاء سے لپٹ گئی۔

”حیاء تم یہاں کیسے؟ ہمیں یہاں سے فوراً نکلتا ہوا کیا۔“ وہ اب رو بہاں ہو کر کہہ رہی تھی۔

”لالہ کیسی ہے؟ کیا کرتی ہے وہ اب؟ میں بھی بینک کر یہاں آ گئی ہوں۔ بس دونوں یہاں سے بھاگ نکلے ہیں۔“ حیاء نے افق کا ہاتھ پکڑا۔ اور دونوں تیزی سے باہر کی طرف بھاگنے لگیں۔ باہر پہنچ کر الو کی ساخت والے فوارے کے پاس پہنچ کر حیاء ایک دم رک گئی اور الو کو دیکھنے لگی۔ افق کوٹھی مجبوراً رکنا پڑا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں موجود حیاء کا ہاتھ اچانک بہت سرد ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ اکڑتا بھی جا رہا تھا۔ بالآخر افق کو یوں لگا کہ اس نے ہاتھ میں لکڑی پکڑ رکھا ہے۔

اس نے حیران ہو کر حیاء کو دیکھا۔ حیاء کے نقوش اب بگڑ چکے تھے اور اب وہ غیر انسانی آوازیں نکالتے ہوئے افق کے چہرے پر پل پڑی۔ وہ اپنے لمبے اور نیلے دانتوں سے افق کے چہرے کو کھرچنے لگی۔

مانند پڑتی سانسوں کے ساتھ افق نے ٹاپ کی پاکٹ سے لائٹر نکالا اور اسے فوراً آن کیا۔ لائٹر سے آگ نکلنے کی دھیمی کہ حیاء کی روح چٹکھٹاتی ہوئی غائب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

گڈریا نے ہمت کر کے کوڑے کرکٹ میں دبی اس لڑکی کو باہر نکالا۔ لڑکی میں انہی سانس باقی تھی۔ وہ گڈریا کے بازو کا سہارا لے کر یہ مشکل چل رہی تھی ”تمہارا نام کیا ہے۔“ گڈریا لڑکی کے بارے میں کچھ جاننا چاہ رہا تھا۔

”اف..... افق.....“ لڑکی بہ مشکل گویا ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے جان ہو کر گڈریا کے بازوؤں میں جھول گئی۔ گڈریا ایک دم گرتے گرتے سنبھلا وہ تنکلی باندھ لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا۔

کانی دیر بعد افق کو ہوش آیا تھا۔ اس نے مندی مندی آنکھیں کھولیں پانی کی تیز دھاریں مسلسل اس کے اوپر گر رہی تھیں۔ وہ الو کے تجسس کے نیچے پڑی تھی وہ مجسمہ ایک طرح کا فوارہ تھا۔ افق گھبرا کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر موت کے دہانے تک آئی تھی اس کے چاروں طرف کوٹھی کے نیلے دروایا تھے۔

”اس کوٹھی کی حدود دیکھنا آئے والا آج تک زندہ نہیں بچ سکا، تو پھر تم زندہ کیسے بچ سکتی تھی۔“ عقب سے آنے والی آواز پر افق نے مرکز دیکھا تو سامنے وہی گڈریا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

”تم بہت ہوشیار ہو۔ مگر تم اب کی بار نہیں بچ سکتی۔ پہلے ہی اس چوہدری کے بچے نے ہماری جگہ پر یہ کوٹھی تعمیر کر دیا کہ غلطی کی تھی۔ اس کی خوبصورت بیوی اور وہ خود اس کوٹھی میں رہائش کی پہلی رات ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔“

یہ جگہ ہماری ہے۔ صرف ہماری..... وہ آواز اس لڑکی کی تھی جسے ایک بار افق نے اپنے کندھوں پر سوار دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی افق کو اپنے جسم میں ہزاروں سوسائیاں چھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ افق کی گردن غیر ارادی طور پر بائیں طرف کو گھومی اور کرکٹ کی آواز کے ساتھ ہی گردن ایک طرف کوڑھلک گئی۔

کئی موسم آئے اور گزرے۔ نیلی کوٹھی آج بھی اپنے جاہ و جلال کے ساتھ اسی طرح موجود ہے۔ لوگ آج بھی وہاں جانے سے گریز کرتے ہیں اب وہاں جنگلی کبوتروں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اور اللہ کی بنائی پیدا کردہ آتش خلوں وہاں پوری شان و شوکت سے راج کرتی ہے۔



بدروحوں کا مسکن

صفر شاہین - ملتان

رات کے سناٹے میں بدروحوں کے قہقہے قیامت ڈھانے لگے وہاں پر موجود لوگوں کی ریڑھ کی ہڈی کی سردی میں تیز لہر دوڑ گئی اور پھر ایک گھٹا شوپ اندھیرے میں ایک پراسرار ہیبت ناک اور خوفناک آواز گونجی۔

دل دماغ کو خوف دہرا س کے ٹکڑے میں جکڑتی ہوئی اپنی نوعیت کی ایک ناقابل یقین کہانی

شاہدہ پولیس اسٹیشن میں میری تعیناتی کو ابھی پندرہ سولہ دن ہی گزرے تھے کہ مجھے ایک خوفناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا، ہوا یوں کہ ایک دن میں پولیس ہیڈ کوارٹر لاہور کی کام سے گیا۔ وہاں سے بارہ بجے واپس آیا تو تھانے کے احاطے میں پندرہ بیس افراد بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو کھڑے ہو کر سلام کرنے لگے۔ میں سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ پٹی کیپ اتار کر میں کرسی پر بیٹھا اور گھنٹی بجائی، فوراً ہی میرا دل اُترا آ گیا۔

”کل محمد..... باہر کون لوگ ہیں۔ کیا معاملہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”صاحب۔ یہ لوگ نیگم کوٹ سے آئے ہیں۔ چوری کا کیس ہے۔ تفصیل کا علم تھی صاحب کو ہوگا۔“ گل محمد نے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے۔ مٹی کو سمجھو.....“ میں نے اسے ہدایت کی تو گل محمد باہر نکل گیا۔

مجھے حیرت تھی کہ چوری کی رپورٹ درج کرانے کے لئے پندرہ بیس افراد کیوں آئے تھے جبکہ اس مقصد کے لئے تین چار افراد بھی کافی تھے۔ اتنے

میں مٹی محروظہ اندر آ گیا اور اس نے مجھے سلام کیا۔
”ظفر۔ تم نے ان لوگوں کی چوری کی رپورٹ درج کرنی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔
”کیسے درج کرتا سر..... یہ کوئی عام چوری نہیں ہے.....“ ظفر نے کہا۔

”کیا مطلب.....“ میں نے بے اختیار چونک کر کہا۔
”کیا اب چوریاں بھی خاص اور عام ہونے لگی ہیں؟“
”جی ہاں۔ اسی لئے میں نے آپ کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔“ ظفر نے کہا۔
”یہ لوگ صبح ساڑھے نو بجے سے یہاں بیٹھے ہیں۔“

”بے وقوف آدمی۔ ان بے چاروں کو اتنی دیر بٹھائے رکھنے کا کیا فائدہ تھا۔ تم رپورٹ درج کر لیتے۔“ میں نے غصے سے کہا۔
”لیکن صاحب کس کے خلاف رپورٹ درج کرتا۔ مددہ چور کو جانتے ہیں اور نہ کسی پر شک کا اظہار کرتے ہیں۔“ ظفر نے کہا۔

”کمال ہے۔“ میں نے اسے گھورا۔
”کیا تم نہیں جانتے کہ ایسی رپورٹ نامعلوم افراد کے خلاف درج کی جاتی ہے؟“

”مجھے معلوم ہے صاحب۔ لیکن چوری کسی مکان یا دکان میں نہیں ہوئی بلکہ قبرستان میں ہوئی ہے۔“ ظفر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اوہ.....“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کیا قبرستان سے کسی چور نے درخت کاٹے ہیں یا کسی کا نعش چرایا ہے؟“

”نہیں صاحب۔ کفن کے بجائے پوری لاش ہی چوری کر لی گئی ہے۔“ ظفر نے تیزی سے کہا۔ ”کیا.....“ میں بے ساختہ اچھل پڑا۔ ”لاش چوری کر لی گئی ہے؟“

”بس سر.....! اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ عام چوری نہیں ہے۔“ ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسی لئے رپورٹ نہیں لکھی کہ ہو سکتا ہے کہ آپ مدعی سے کچھ پوچھا پسند کریں۔“

”مدعی کون ہے؟“ میں نے کرسی پر پیلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

”لاش کا بھائی..... میرا مطلب ہے مرنے والے کا بھائی۔ دوسرے لوگ اس کے رشتے دار اور پڑوسی ہیں۔“ ظفر نے جواب دیا۔

”یہ کب کا واقعہ ہے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”گزشتہ رات کا.....“ ظفر بولا۔ ”کل شام لاش دفنائی گئی اور رات میں کوئی اسے قبر سے نکال کر لے گیا۔“

یہ حیرت انگیز اور دلچسپ کیس معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ظفر سے کہا۔ ”مدعی اور اس کے رشتہ داروں کو بلاؤ۔“

”ظفر سر کو جنبش دیتا ہوا باہر چلا گیا۔ میرے لئے یہ امر حیرت کا باعث تھا کہ چوروں نے نقب چوری کرنے کے بجائے پوری لاش چوری کر لی تھی۔ بھلا ایک بے جان لاش سے کیا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ نہ وہ کھانے کی نہ پہننے کی۔ میں نے سوچتے ہوئے سگریٹ سٹاکایا۔ چند لمحوں بعد تین افراد ظفر کے ساتھ

اندر آئے۔ انہوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیتے ہوئے انہیں سامنے دگنی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئے۔ ان میں دو اوجیر عمر تھے جبکہ تیسرا جوان آدمی تھا۔ اس کی عمر تیس اور پچیس کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔

”صاحب جی..... یہ مدعی ہے۔“ ظفر نے جوان آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس کا ماموں اور یہ چچا ہے۔“

”آپ کا نام.....؟“ میں نے مدعی سے پوچھا۔ ”کیا کام کرتے ہیں.....؟“

”جی میرا نام اکبر ہے۔“ اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ ”بیکم کوٹ میں میری چناری دکان ہے اکبر جزل اینڈ چناری اسٹور۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ بتائیں کہ کیا قصہ ہے۔ بلا جھجک ہر بات مکمل اور تفصیل سے بیان کریں۔“

پھر میں نے ظفر سے کہا کہ وہ کاغذ قلم لائے اور مدعی کا بیان نوٹ کرتا جائے۔ ظفر واپس آیا تو اکبر بیان دینے لگا۔

☆.....☆.....☆

اکبر کے بیان کے مطابق اصغر اس سے آٹھ برس چھوٹا یعنی چوبیس برس کا خوب صورت اور صحت مند نوجوان تھا۔ لاہور میں واقع ایک پرنٹنگ پریس میں کام کرتا تھا۔ وہ روزانہ صبح کام پر جاتا اور شام سات بجے تک واپس گھر آیا کرتا تھا۔ دو دن پہلے یعنی مرنے سے ایک دن قبل وہ صبح کام پر جاتے ہوئے گھر میں بتا کر گیا تھا کہ وہ آج رات قلم دیکھ گا اس لئے دیر سے گھر واپس آئے گا۔ چنانچہ اس روز گھر والے اس کا انتظار کئے بغیر ہی سو گئے۔ لیکن ماں کو اصغر کی فکر میں نیند نہ آئی۔ اکبر نے اس رات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”رات کے ساڑھے بارہ بج گئے تو ماں نے مجھے جگا کر پریشان لہجے میں کہا۔ ”اکبر، تمہارا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔“

میں نے گھڑی پر وقت دیکھ کر کہا۔ ”ممکن ہے اس نے آخری شو دیکھا ہو۔ اس وقت شو ختم ہو چکا ہوگا اور اصغر واپس آ رہا ہوگا آپ فکر نہ کریں۔“

میری ماں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے دوبارہ نیند نہ آئی۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا مگر اصغر واپس نہ آیا تو مجھے بھی فکر ہوئی اتنے میں ماں دوبارہ میرے پاس آئی۔

”اکبر بیٹے۔ اصغر ابھی تک نہیں آیا۔ خدا خیر کرے۔ تم اس کا پتا کرو۔“

”اماں۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ وہ کوئی بچہ تو نہیں ہے جو راستہ بھول گیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ممکن ہے اسے سواری نہ ملی ہو اور وہ پیدل آ رہا ہو۔ گزشتہ کرسیوں میں بھی تو اسے ایک دوسرے پیدل آنا پڑا تھا۔“

”مگر بیٹے وہ کرسیوں کا موسم تھا۔ لوگ گھروں سے باہر سوتے تھے۔“ ماں نے کہا۔ ”آج کل سردیاں ہیں، لوگ گھروں میں ٹھہرتے ہیں اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ باہر کوئی حادثہ یا واقعہ رونما ہوا ہے۔ سڑکیں گلیاں آٹھ نو بجے ہی سنسان ہو جاتی ہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں بس اسٹاپ تک اسے دیکھنے جاتا ہوں۔“

میں نے اپنی ہائیکل لی اور باہر نکل آیا۔ ہمارا گھر چیم کوٹ کی آبادی کے آخری سرے پر ہے۔ وہاں سے بس اسٹاپ کا فاصلہ ایک میل ہے۔ بس اسٹاپ سے دو فرلانگ آگے مین روڈ سے ایک چھوٹی سڑک ہمارے گھر کی طرف آتی ہے۔ لیکن اس راستے پر آبادی کے بجائے کھیت ہیں یا پھر قبرستان۔ اس کے علاوہ دوسرے مین روڈ کا فاصلہ بھی زیادہ ہے۔ بہر حال میں سائیکل پر ہمارے گھر بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ لیکن راستے میں کچھ کہیں بھی اصغر نظر نہ آیا۔ بس اسٹاپ بھی دیران پڑا تھا۔ رات کے اوقات میں وہاں سے لاہور یا شیخوپورہ جانے والے ٹرک ٹرالیاں گزرتے ہیں۔ ایک بجے کے

بعد کوئی بس سواری ادھر نہیں آئی۔ میں چند منٹ وہاں ٹھہر کر سوچتا رہا کہ اصغر کیوں نہیں آیا۔ پھر میں واپس چل دیا۔ گھر پہنچ کر میں نے صحن میں سائیکل کھڑی کی تو میری ماں باہر نکل گئی۔ میں صحن کا دروازہ بند کر کے برآمدے میں آیا۔

”کچھ پتا چلا اصغر کا.....؟“ ماں نے بے قراری سے پوچھا۔

”نہیں ماں۔ بس اسٹاپ تک دیکھ آیا ہوں۔ شاید وہ آج پریس میں ہی سو گیا ہے۔ ورنہ اب تک آ چکا ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”ماں کی تسلی نہ ہوئی۔ میں اس کے ساتھ کمرے میں آیا یہی تھا کہ چاک باہر کا دروازہ دروازہ سے پٹیا جانے لگا۔ میں چونک کر پٹیا۔ نہ جانے کون تھا، اصغر تو ہمیشہ آرام سے ویسٹک دیا کرتا تھا۔

”کون ہے؟“ میں نے برآمدے میں آ کر بلند آواز سے پوچھا۔

اسی لمحے باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بھاری شے زمین پر گری ہو۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے دوبارہ پوچھا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے باہر کا دروازہ کھولا تو سامنے میرا بھائی اصغر زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

”اصغر..... اصغر..... کیا ہوا۔“ میں اسے سیدھا کرتے ہوئے چلایا۔

لیکن اصغر پر بے ہوشی طاری تھی اور جسم اس کا بہت ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میری آواز سن کر میری ماں اور بیوی دوڑتی ہوئی باہر آئیں۔ اصغر کی حالت دیکھ کر ماں کی چیخ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے اصغر کو اٹھایا اور کمرے میں لا کر بستر پر لٹایا۔ اصغر کی آنکھیں اس طرح پٹی ہوئی تھیں جیسے اس نے کوئی خوفناک چیز دیکھی ہو۔ میری ماں اور بیوی رونے لگیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔ اصغر کو مکمل اور لحاف اوڑھایا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ چند منٹ بعد اسے ہوش آیا۔ ہم نے اسے گرم دودھ پلایا۔ اسے ہوش میں

دیکھ کر ماں کو کچھ اطمینان ہوا۔ امغر کو تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی دیر کہاں رہا ہے اور بے ہوش کیوں ہوا تھا تو وہ کہنے لگا۔

”ظلم کا شواہد ہے بارہ بجے ختم ہوا۔ میں یادگار چوک پر پہنچا اور راولپنڈی جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ جب شاہدہ موٹر پر بس سے اترا تو اس طرف آنے والی کوئی گاڑی وہاں موجود نہ تھی۔ کچھ دیر بعد لاہور سے ایک ٹرالر آیا جو شہر خورہ جا رہا تھا میں نے اسے روک کر ڈرائیور کی منت سماجت کی تو اس نے مجھے پیچھے بٹھالیا۔ ٹیکم کوٹ کا اسٹاپ آیا تو میں نے ڈرائیور کو پکارا اور کہا کہ مجھے یہاں اتار دے۔ اس وقت ٹرالر فل رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ ہوا کے زبردست شور میں سہیل تو ڈرائیور میری آواز نہ سن سکا اور جب میں نے دروازے پر ہاتھ مار کر اسے متوجہ کیا تو میرا مطلب سمجھ کر وہ بریک لگانے لگا۔ اتنی دیر میں بس اسٹاپ کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ میں ٹرک سے اترا اور ٹرک آگے بڑھ گیا۔

میں بس اسٹاپ کی طرف جانے کے بجائے قبرستان والے راستے پر ہولیا۔ جو ٹی میں قبرستان کے قریب پہنچا مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو خوف سے میرے روٹنے لگے۔ کھڑے ہو گئے۔ قبرستان میں ایک قبر کے پاس تین کفن پوش کھڑے تھے۔ ان کے کفن ہوا سے لہرا رہے تھے۔ لیکن مجھے ان کے چہرے نظر نہ آئے۔ کیونکہ ستاروں کی روشنی بہت مدھم تھی۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اپنی رفتار بڑھا دی۔ شاید وہ مردے تھے۔

”امغر بھائی..... ادھر آؤ دیار.....“ اسی لمحے ان میں سے کسی نے مخاطب کر کے کہا۔

اپنا نام سن کر خوف سے میرے پسینے چھوٹنے لگے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اپنی رفتار بڑھا دی۔

”امغر..... یار بات تو سنو..... ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تم ہو کہ پروا نہیں کر رہے

ہو۔“ مجھے دوبارہ وہی آواز سنائی دی۔

یہ سن کر میں نے ان کفن پوشوں کی طرف دیکھا۔ تو وہ تینوں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں دہشت زدہ ہو کر دوڑنے لگا۔ مجھے پیچھے سے ان کے قہقہے سنائی دیے۔

”لو..... وہ تو بھاگ رہا ہے۔ جلدی کرو..... اسے پکڑو.....“ ایک کفن پوش مردے کی آواز بلند ہوئی۔

”رہنے دو۔ یہ کل رات ہمارا مہمان ہوگا۔ ہم نے اس کے ساتھ دوستی کا آغاز کر دیا ہے۔“ دوسرے کفن پوش کی آواز سنائی دی۔

میں اتنا دہشت زدہ تھا کہ دوبارہ ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور اندھا دھند دوڑتا ہوا یہاں آ پہنچا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے پوری قوت سے دروازے پر ہاتھ مارے تھے۔“

امغر نے آخر میں کہا۔

اصغر کی بات سن کر ماں فوراً اس پر آیت الکرسی دم کرنے لگی اور امغر چند منٹ بعد سو گیا۔ لیکن صبح تک اس کا بخار بہت تیز ہو گیا۔ بخار کی غشی کے دوران وہ بڑبڑاتا رہا۔ میں اسے ٹیکم کوٹ کے سرکاری اسپتال لے گیا۔ لیکن ڈاکٹر کے معائنہ کرنے سے پہلے ہی امغر مر گیا۔“ اکبر نے کہا تو اس کی آنکھیں پھرتی تھیں اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اکبر دوبارہ کہنے لگا۔

”ہم نے شام مغرب سے پہلے اسے قبرستان میں دفنایا۔ آج صبح میں اس کی قبر دیکھنے گیا کہ کہیں کسی جانور نے کچھ قبر کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ میں قبرستان پہنچا تو امغر کی قبر پوری طرح کھلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے کدال یا پھوڑے کی مدد سے قبر کھودی ہو۔ میں نے قبر میں جھانکا تو اس میں امغر کی لاش موجود نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بڑی احتیاط سے اندرونی حصے کی اینٹیں ہٹا کر لاش نکالی تھی۔ کیونکہ اگر یہ کسی جانور کی کارروائی ہوتی تو وہ قبر میں ایک سمت سے سوراخ کرنا

اور قبر سے لاش کا کوئی ٹکڑا اور کفن کی وہجیاں لٹیں۔ میں نے فوراً رشتے داروں اور پڑوسیوں کو اطلاع دی۔ وہ لوگ میرے ساتھ قبرستان آئے۔ سب کی رائے تھی کہ لاش کسی انسان نے نکالی ہے۔ چنانچہ ہم وہاں سے سیدھے یہاں چلے آئے تاکہ رپورٹ درج کر سکیں اور پولیس میرے بھائی کی لاش تلاش کرے۔“

اکبر خاموش ہو گیا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اور میں دل میں سوچنے لگا کہ پولیس امغر کی لاش کو کہاں تلاش کرے گی۔ بہر حال میں نے ان لوگوں کو تسلی دی۔

”پولیس پوری کوشش کرے گی۔ آپ کو کسی پر شک ہے تو بتائیں تاکہ اسے پکڑ کر پوچھ لے جائے۔“ میں نے زری سے کہا۔

”ہمیں صرف انہی کفن پوش بدروحوں پر شک ہے جو امغر کو قبرستان میں نظر آئی تھیں۔“ اکبر کے ساموں نے کہا۔

”کیا پہلے ہی اس قبرستان سے کوئی لاش چوری ہوئی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں جناب۔“ اکبر کے چچانے جلدی سے کہا۔ ”گزشتہ پچاس برسوں میں تو وہاں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا اور نہ کسی نے سنا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ جائیں۔ میں تھوڑی دیر بعد قبر کا معائنہ کرنے آؤں گا۔“ میں نے ان لوگوں سے کہا۔ ”وہاں قبر کے آس پاس قدموں کے نشانات تو ہوں گے۔“

”پہلے تو ہمیں خیال بھی نہیں آیا تھا۔“ اکبر نے کہا۔ ”جب خیال آیا تو وہاں محلے داروں کے قدموں کے نشانات پڑ چکے تھے۔ اتنے نشانات میں سے لاش چوری کرنے والوں کے قدموں کے نشانات کیسے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔“

منشی ظفر اکبر کا بیان نوٹ کر چکا تھا۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں کو رخصت کیا اور خود بھی ٹیکم کوٹ جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر تین بجے میں اپنے ہاتھوں عادل اور نازک کو کہ بالترتیب خالد اور سب انسپکٹر تھے۔ اور وہ سپاہیوں کے ساتھ ٹیکم کوٹ کے قبرستان میں پہنچا تو وہاں کچھ لوگ ایک میت کو دفن کر رہے تھے۔ امغر مرحوم کا بھائی اکبر بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کے ساتھ جیب سے اترا تو اکبر جلدی سے ہمارے قریب آ گیا۔ ہم اس کے ساتھ امغر کی قبر پر پہنچے۔ میں نے قبر کا جائزہ لیا۔ قبر کھدی ہوئی تھی۔ ایک طرف مٹی کا ڈھیر اور قبر سے نکالی گئی جچی اینٹیں پڑی تھیں۔ بلاشبہ وہ انسانی کارنامہ تھا۔ کسی نے بڑی احتیاط سے قبر کشائی کی تھی۔ چند منٹ بعد میں نے اکبر کو ہدایت کی کہ وہ قبر بند کر دے تو اس نے گورکن کو بلا کر قبر بند کرنے کو کہا۔

”کسی کی میت دفنائی جا رہی ہے۔؟“ میں نے اکبر سے پوچھا۔

”ہمارا ایک محلہ دار تھا۔ آج دس بجے انتقال کر گیا تھا۔“ اکبر نے کہا۔ ”بے چارہ نو جوان تھا۔ دو ماہ پہلے ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔“

مجھے خیال آیا کہ لاشیں جرانے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ آج رات اس نئی لاش کو بھی چرایا جائے۔

”ٹھیک ہے۔ آج رات پولیس یہاں پہرا دے گی۔ لیکن یہ بات خود تک محدود رکھنا کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اکبر سے کہا۔

”واپسی تھانے آ کر میں شام تک ذہن میں پروگرام دیتا رہا۔ رات آٹھ بجے میں نے سب انسپکٹر نازک کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ وہ دروی اتار کر سادہ لباس پہن لے۔ میں نے اسے اپنا پروگرام بتایا۔ نازک کافی جی دار اور ہم جو قسم کا نو جوان تھا۔ وہ سادہ لباس پہن کر آیا تو اتنی دیر میں میں بھی سادہ کپڑے پہن چکا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے ہم نے جرسیاں اور مظفر لے لئے تھے۔ سرکاری ریوالور بھی ہمارے پاس تھے جبکہ میری ہدایت پر نازک نے ایک ٹارچ بھی لے لی تھی۔

نوبت ہم بیگم کوٹ کے بس اسٹاپ پر پہنچے۔ سرکاری جیب ہماری نشاندہی کر سکتی تھی کہ ہم پولیس والے ہیں۔ اس لئے ہم وہاں ٹنگی میں آئے تھے۔ چائے کا تھرماس ہمارے پاس تھے۔ ہم نے وہاں ایک ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا اور تھرماس میں چائے بھر کر پیدل ہی سڑک کے کنارے آگے بڑھنے لگے۔ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے ہم اس جگہ پہنچے جہاں سے ایک بچی سڑک بیگم کوٹ کی آبادی کے آخری حصے کی طرف جاتی تھی۔ اس کے راستے کے دونوں جانب سبز یوں کے کھیت تھے۔ قبرستان کا فاصلہ دو ڈھائی فرلانگ کے قریب تھا جبکہ قبرستان سے آبادی بھی اتنے ہی فاصلے پر تھی۔

سرو کی کل کی نسبت کچھ زیادہ ہی تھی اور اس کا سبب سر پر کے بعد چلنے والی تیز ہوا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بھی موجود تھے۔ میں نے نازک سے کہا کہ چادریں اوڑھ لینی چاہئیں۔ اس نے سامان کے تھیلے میں سیاہی اور چادریں نکالیں اور ایک مجھے دے دی۔ ہم نے چادریں اوڑھیں اور چہروں کو سر دھوا سے بچانے کے لئے چہرے پر ناک تک منظر لیٹ لے۔ پھر ہم کچے راستے پر چل پڑے۔ میں آج دفنے جانے والے نو جوان کی قبر پر پہرہ دینا چاہتا تھا۔ اصولاً تو مجھے چاہئے تھا کہ وہاں چند سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دیتا۔ لیکن میں ایڈوٹجر پسند ہوں اور مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالنا میرا مشغلہ ہے۔ اسی لئے میں نے خود ہی اس نئی قبر کی نگرانی کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اصغر کی لاش چرانے والے اس نئی میت پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کریں گے اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہیں عام انسان یا بدرویں جنہیں اصغر نے دیکھا تھا اور جنہوں نے کہا تھا کہ آئندہ رات اصغر ان کا مہمان ہوگا۔

چادریں اوڑھ لینے سے ہم دیہاتی باشندے لگ رہے تھے۔ اول تو اس وقت سڑک پر دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہی سمجھتا کہ ہم اس علاقے کے رہنے والے

ہیں۔ سب انجیکٹر نازک نے چادر کے نیچے تھپکا بغل سے لٹکا رکھا تھا جس میں چائے کا تھرماس، دو کپ اور چھیل والی نارنج تھی۔ ہم بڑے اطمینان سے چل رہے تھے۔ تاریکی میں ہم زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہمیں روشنی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ہمیں خود کو دوسروں کی نگاہوں سے ہر ممکن طور پر پوشیدہ رکھنا تھا۔ جب ہم قبرستان کے قریب پہنچے تو میری رستہ داچ پر ساڑھے دس بجے رہے تھے۔ قبرستان تین اطراف سے گھنی جھاڑیوں اور درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ صرف سڑک کی جانب سے کھلا تھا اور لوگ ادھر سے ہی قبرستان میں آتے جاتے تھے۔ قبروں کی ابتداء سڑک کے کنارے سے ہو رہی تھی۔ میں نے چند قدم پیچھے سے ہی رخ بدلا اور دائیں جانب چلنے لگا۔ اس جانب ایک کھیت تھا۔ قبرستان کا اس طرف شمال پہلو تھا اور ادھر درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ سامنے سے قبرستان میں داخل ہونے میں یہ خطرہ تھا کہ اگر قبرستان میں کوئی موجود ہوتا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ پندرہ بیس قدم مغرب کی جانب چلنے کے بعد ہم نے قبرستان کی طرف رخ کر لیا۔ چند لمحوں بعد ہم قبرستان کے بیرونی درختوں کے پاس پہنچ گئے۔ درختوں کے ساتھ گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بیگم کوٹ کا قبرستان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میری معلومات کے مطابق مغل شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں بیگم کوٹ آباد ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ قبرستان بھی تقریباً چار سو سال پرانا تھا۔ ماضی میں یہ قبرستان کئی بار سیلاب سے بیوند زمین ہوا تھا۔ میں نازک کے ساتھ گھنی جھاڑیوں میں احتیاط سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پندرہ سولہ قدم چلنے کے بعد ہم قبرستان میں پہنچ گئے حیدر آگے بڑھنے کے بجائے ہم اس جانب کی پہلی قبروں کے پاس رک گئے۔ یہ قبریں زمین سے تین چار فٹ بلند اور پختہ تھیں۔ ہم دونوں ایک قبر کی آڑ میں رک کر قبرستان کا جائزہ لینے لگے۔

قبرستان پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ نازک بھی میرے پیچھے چو پائیوں کی طرح چل رہا تھا۔ امجد کی قبر کے سر ہانے کی جانب دس پارہ قدم کے فاصلے پر ایک بلند چوڑے والی قبر نظر آ رہی تھی جس کا کتبہ کافی چوڑا اور بڑا تھا۔ میں نے ادھر کا رخ کیا۔ جلد ہی ہم اس قبر کے سر ہانے کی جانب پہنچ گئے۔ قبر کے سر ہانے چند فٹ کے فاصلے پر ایک جھاڑی تھی۔ جس کی شاخیں قبر پر جھکی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمیں پشت کی جانب سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ جبکہ سامنے قبر کا بلند اور کشادہ کتبہ تھا۔ یہاں سے ہم بے آسانی امجد کی قبر کی نگرانی کر سکتے تھے۔

نازک نے تھرماس والا تھیلیا زمین پر رکھا اور نارنج نکال لی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ جب تک میں نہ کہوں وہ نارنج نہ چلائے۔ ہم دونوں کتبے کی آڑ میں کھڑے ہو کر دائیں بائیں سے امجد کی قبر اور اس کے آس پاس کی نگرانی کرنے لگے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ قبرستان پر سناٹا اور تاریکی کا راج تھا۔ ہلکی سردی ہوا سے ہمارے ہاتھ ٹھہر رہے تھے۔ ہماری آنکھیں جلد ہی تاریکی سے مانوس ہو گئیں۔ پھر آسمان بھی بادلوں سے صاف ہو گیا تھا اس لئے ہم دور تک دیکھ رہے تھے۔

”سر..... کیا یہ ضروری ہے کہ اصغر کی لاش چوری کرنے والے امجد کی لاش بھی نکالنے آئیں۔“ نازک نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا۔ لیکن سناٹے میں مجھے

اس کی آواز بھی بہت تیز محسوس ہوئی۔ میں نے اسے مزید آہستہ بولنے کی ہدایت کی اور کہا۔ ”نہیں۔ ضروری نہیں۔ لیکن ہمیں اس کس کو حل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ آج نئی لاش نہ بھی دفن کی جاتی تب بھی میں حقیقت معلوم کرنے کے لئے یہاں آتا۔ مجھے کچھ فیصد امید ہے کہ امجد کی لاش نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔“

”فرض کیا کہ چور لاش نکالے آ جائیں تو کیا ہم انہیں روکیں گے۔؟“ نازک نے سوال کیا۔ ”نہیں..... میں نے آہستہ سے کہا۔ ”پہلے ہم دیکھیں گے کہ وہ لاش نکالنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر وہ لاش نکال کر لے گئے تو ہم احتیاط سے ان کا پیچھا کریں گے اور ان کے ٹھکانے تک پہنچیں گے کیونکہ ہمیں ان سے امجد اور اصغر کی لاش برآمد کرنی ہے۔“

اجا تک عقب سے ایک آواز ابھری اور نازک بے اختیار پھل پڑا۔ وہ آواز اسی ہی تھی جیسے کوئی چوبایا کوئی جانور دودھ کر رہا ہے۔ گزرا تھا اور خشک پتے چرماتے تھے، نازک پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لیکن جھاڑی کے نیچے گہری تاریکی کے سبب کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ ”سر..... یہ کیا ہوا تھا.....؟“ نازک نے مجھے مخاطب کیا تو اس کے لہجے سے خوف یکبارہ تھا۔

”کوئی چوبایا نیولا گزرا ہوگا۔ ایسے جانور قبرستانوں میں عام ہوتے ہیں۔“ میں نے نازک کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو نازک کا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ لیکن قبرستان کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خود خواہ گھبرا جاتا ہے۔

”حواس قابو میں رکھو نازک۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ چائے نکال کر پو اور مجھے بھی پلاؤ۔“ میں نے اس کا کندھا ہتھپتاتے ہوئے کہا۔

نازک بیٹھ گیا۔ اس نے دو پیالیوں میں چائے ڈالی اور ایک مجھے دی۔ میں چائے پیتے ہوئے سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔ امجد کی قبر کے آس پاس کئی پختہ

اور بلند تعویذوں والی قبریں تھیں لیکن دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چائے پینے کے بعد نازک پھر کھڑا ہو گیا۔

”سر۔ آپ چند منٹ بیٹھ جائیں۔ تنگ جائیں گے۔ میں گمرانی کرتا ہوں۔“ نازک نے مجھ سے کہا اور میں بیٹھ گیا۔ وہ امجد کی قبر کی گمرانی کرنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میرا اندازہ غلط نہ نکلے۔ بارہ بج گئے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور ہم دونوں باری باری کھڑے ہو کر اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ نازک کے حلق سے سرسراہٹ ہوئی آواز نکلی۔ ”سر.....!“

”کیا ہوا.....؟“ میں نے چونک کر تیزی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

نازک کچھ نہ بولا۔ میں نے سامنے کی جانب دیکھا تو ایک تسمہ کے لئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ امجد کی قبر سے دس بارہ قدم دور سفید لباس میں کوئی چل رہا تھا۔ اس کا رخ امجد کی قبر کی طرف تھا۔ وہ سفید لباس کفن معلوم ہوتا تھا۔ جس میں اس کا سر اور چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میں کانپ گیا کہ وہ زندہ انسان کے بجائے کوئی بدروح یا لاش ہے۔

”سر..... سر..... یہ تو کوئی بدروح ہے.....“ نازک نے کانپتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

”شاید۔ مگر تم حوصلہ رکھو..... ڈرو مت۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”پتا رہیو اور نکال کر ہاتھ میں لے لو۔“

اسی لمحے میری نظر بائیں جانب اٹھی اور میں چونک پڑا اس طرف سے دو کفن پوش بدرویں امجد کی قبر کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ نازک سمٹ کر میرے قریب ہو گیا۔ اس کا کندھا میرے کندھے سے ٹکرا رہا تھا اور وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی آواز نکل رہی تھی۔ شاید وہ آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنے بنگلی ہولسٹر سے ریو اور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ مگر یہ احتیاطی تدبیر تھی۔ ورنہ میرا گولی چلانے کا کوئی

ارادہ نہ تھا۔ میں نے دائیں جانب دیکھا تو دوسرے ایک بدروح آ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ چاروں کفن پوش بدرویں امجد کی قبر کے پاس پہنچ گئیں۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا اور میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ تمام تر بہادری کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔

”کام شروع کیا جائے.....؟“ اچانک ان میں سے ایک بدروح کی آواز بلند ہوئی۔ مجھے وہ آواز غیر انسانی محسوس ہوئی۔ بالکل سپاٹ اور کسی تاثر کے بغیر۔ یقیناً وہ قبر کھودنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

”ٹھہرو۔ یہاں۔ کوئی اور بھی ہے۔“ دوسری بدروح کی آواز سنائی دی اور وہ چاروں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

نازک بری طرح کپکپا رہا تھا۔ اسی لمحے ہمارے پیچھے جھاڑی سے پروں کی پھر بھڑاہٹ بلند ہوئی اور نازک کے حلق سے دہلی و بی سی خوفزدہ چیخ نکلی گئی۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھالا تو وہ میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ دہشت کے مارے اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے سرگھما کر بدرویں کی طرف دیکھا تو بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ غائب ہو چکی تھیں اور دور تک ان کا نام و نشان نہ تھا۔ میں نے نازک کو زمین پر لٹا دیا۔ مجھے اس پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے اس کی چیخ سن کر بدرویں کہاں غائب ہو گئی تھیں میں دوبارہ قبر کی آڑ سے امجد کی قبر کی طرف دیکھنے لگا کہ شاید وہ کفن پوش بدرویں دوبارہ نمودار ہوں۔

”انسپیکٹر کاشف.....“ دفعتاً مجھے عقب سے کسی نے پکارا اور میں بے اختیار اچھل پڑا۔ پلٹ کر دیکھا تو مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ جھاڑی کے نیچے گمری تار کی تھی۔ میں نے جبکہ کر نازک کے ہاتھ میں دہلی ہوئی نارنج نکالی اور سیدھا ہوا ہی تھا کہ مجھے وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

”نارنج روشن مت کرنا انسپیکٹر۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ اس آواز نے کہا۔ ”کون ہو تم۔ سامنے آؤ.....“ میں نے ہمت کر کے کہا۔

”میں سامنے آ گیا تو دہشت کے مارے تمہارا کچھ پیٹ جائے گا۔“ جواب میں آواز ابھری۔ ”تم اسٹنہ ریوڑ نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ دیکھو تمہارے ہاتھ میں ریو اور کیسے بری طرح کانپ رہا ہے۔“ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ خوف کے مارے میرا ہاتھ ہی نہیں پورا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ریو اور پر گرفت مضبوط کر لی۔

”انسپیکٹر کاشف۔ جاؤ، یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اپنے ساتھی کو بھی لے جاؤ، ورنہ صبح تمہیں اس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔“ آواز پھر سنائی دی۔ ”تمہارا زعمہ انسانوں پر بس چلتا ہے۔ لیکن ہم مادی جسم سے آزاد روحیں ہیں۔ نہ ہمیں گرفتار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ہم پر کوئی اثر کر سکتی ہے۔ میں تمہیں یہاں سے نکلنے کے لئے پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر اس وقفے میں تم یہاں سے دفع نہ ہوئے تو مجبوراً ہمیں امجد کے بجائے تمہارے خون پر گزراہ کرنا پڑے گا۔“

بدروح کی دھمکی سن کر دہشت کی شدت سے میرا بدن پسینے میں تر ہو رہا تھا اور میرے بدن پر لرزہ طاری تھا۔

☆.....☆.....☆

کئی لمحے گزر گئے مگر وہ پراسرار آواز دوبارہ نہ سنائی دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بدروح کے حکم کی تعمیل یا اپنے فرض کی ادا؟ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے فورس کے بغیر وہاں آ کر غلط کی تھی۔ اگر میں چھ سات سپاہیوں کو مہراہ لے آتا تو شاید نازک خوف سے بے ہوش بھی نہ ہوتا اور بدروح کو بھی مجھ سے مخاطب ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ میں اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید بدروح وہاں سے چلی گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر امجد کی قبر کی سمت دیکھا تو وہاں کفن پوش بدرویں دوبارہ نمودار ہو چکی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ ایک بدروح کے پاس ایک کمال دکھائی دے رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کمال سے امجد کی قبریں کھودیں گے۔

”چلو۔ شروع ہو جاؤ۔!“ ایک بدروح کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ”شاید انہیں اب میرا خوف نہیں رہا تھا۔ یا پھر انہیں یقین تھا کہ میں قبرستان سے جا چکا ہوں۔ حالانکہ بدروح کی طرف سے دی گئی مہلت میں سے ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے۔ کدال بردار بدروح امجد کی قبر کے سر ہانے کی جانب آئی اور پھر کدال سے قبر کھودنے لگی۔ نازک بے ہوش پڑا تھا اور میں تنہا ان کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے ٹھکانے تک جا پہنچتا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ میں انہیں امجد کی لاش چوری کرنے سے روکتا۔ میں نے فوراً ہی نارنج کا رخ ان کی طرف کر کے نارنج روشن کر دی۔ طاقتور فز لائٹ کا دائرہ امجد کی قبر اور بدرویں پر پڑا تو وہ بدرویں فوراً ہی چپتی ہوئی دائیں بائیں بھاگنے لگیں۔ ٹھیک اسی لمحے عقب سے کوئی بھاری چیز میری پشت سے آ ٹکرائی۔ میرا سر قبر کے سگی کتبے سے ٹکرا اور میں گر پڑا۔ کتبے سے کئی لمحوں بعد میرے ہاتھ سے چھوٹ کر بجھ گئی اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

آکھ کھلی توج کا اجالا بھیل رہا تھا۔ میرے سر میں شدید درد تھا۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہاں گومڑا ابھرا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر امجد کی قبر کی طرف دیکھا تو قبر کھدی ہوئی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں نے نارنج اٹھائی اور دوڑتا ہوا امجد کی قبر کے پاس پہنچا۔ قبر میں تار کی تھی۔ میں نے قبر میں نارنج کی روشنی ڈالی اور طویل سانس لے کر رہ گیا۔ قبر خالی پڑی تھی۔ اور اس میں سے امجد کی لاش غائب تھی۔ یقیناً میرے بے ہوشی کے دوران بدرویں وہاں سے لاش نکال کر لے گئی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ سورج نکلنے ہی امجد کے عزیز اس کی قبر دیکھنے آئیں گے اور اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو پولیس پر سے ان کا اعتماد ختم ہو جائے گا کہ پولیس کی موجودگی میں لاش چوری کر لی گئی تھی۔ چنانچہ میں جلدی سے واپسی آیا جہاں نازک بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کی تو چند لمحوں بعد ہی وہ ہوش میں آ کر بیٹھا۔

”کیا ہوا سر۔۔۔“ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا بولا۔

”فی الحال تو یہاں سے نکل چلو۔ راستے میں بتا دوں گا۔۔۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

چند لمحوں بعد ہم جس طرف سے قبرستان میں داخل ہوئے تھے اس طرف سے باہر آئے اور مین روڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے راستے میں نازک کو بتایا کہ کس طرح امجد کی لاش چوری کر لی گئی ہے۔

”تمہاری بزدلی کے سبب یہ سب کچھ ہوا ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”مگر تم نہ چیتے تو بدر دھوں کو ہمارا پتہ نہ چلا کہ ہم یہاں ہیں۔“

”سوری سر۔۔۔“ نازک نے خجالت سے کہا۔ ”مگر میں کیا کرتا سر۔ بدر دھوں نے ہماری بوسونگھ لی تھی۔“

”بس۔ بس۔ چپ رہو۔ تمہاری حماقت نے ساری محنت ضائع کر دی۔“ میں نے جل کر کہا۔

”ہم بس کے ذریعے واپس شاہدرہ پہنچے۔“

تھانے پہنچ کر میں نے منشی ظفر کو ہدایت کی کہ لاش چوری کا کیس آئے تو وہ رپورٹ درج کر لے۔ پھر میں نے اپنے کوارٹر میں آکر غسل کیا اور ناشتہ کر کے کچھ دیر کے لئے سو گیا۔ گیارہ بجے میں تیار ہو کر آفس پہنچا تو منشی ظفر سے پتہ چلا کہ امجد کے لواحقین لاش چوری کی رپورٹ درج کرائے آئے تھے۔ شام کے وقت میں نے ایک سپاہی کو ٹیکم کوٹ بھیجا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کوئی نئی مرگ تو نہیں ہوئی۔ ایک گھنٹہ بعد اس نے آکر بتایا کہ

ایک عورت کا انتقال ہوا جو دو بچوں کی ماں تھی اور چاروں پہلے ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہوئی تھی اس کا نام بانو اور عمر اکیس برس تھی۔ جب وہ بیناں ٹیکم کوٹ پہنچا تو بانو کا جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی لاش چوری ہونے کے خدشہ کے پیش نظر اس کا شوہر فیصل چند افراد کے ہمراہ آج رات بانو کی قبر پر پہرہ دے گا۔

اس اطلاع کے بعد میں نے نازک کو طلب

کر کے کہا میں آج رات بھر ٹیکم کوٹ جا رہا ہوں۔ وہ تیاری کر لے۔ اگرچہ نازک نے گزشتہ رات ہمت سے کام نہیں لیا تھا۔ لیکن میرے ہاتھوں میں اس سے زیادہ مناسب اور کوئی نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجے ہم ٹیکم کوٹ کے قبرستان میں اسی جانب سے داخل ہوئے جہر سے گزشتہ رات آئے تھے۔ قبرستان کے تقریباً وسط میں ایک قبر پر چار افراد پہرہ دے رہے تھے۔ قبر کے بائیں جانب الاؤ روشن تھا جبکہ قبر کے تعویذ پر چلتی ہوئی لائین رکھی تھی۔ آگ اور لائین کے سبب وہاں خاصی روشنی تھی۔ لیکن ہمیں ان سے چھپ کر قبر کی نگرانی کرنا تھی۔ چنانچہ ہم دبے پاؤں اور قبروں کی آڑ لیتے ہوئے بانو کی قبر کے بائیں طرف ایک اونچے تعویذ والی قبر کے پیلو میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ وہاں سے بانو کی قبر تقریباً پندرہ قدم کے فاصلے پر تھی۔ پہرہ دینے والے افراد قبر کی دوسری جانب الاؤ کے گرد بیٹھے باقیں کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

آسان پر شام سے ہی گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش کا امکان تھا، اس لئے ہم اپنی چھتریوں ساتھ لائے تھے، الاؤ کی روشنی میں پہرہ دینے والے چاروں افراد کی شکلیں واضح نظر آ رہی تھیں۔ وہ صحت مند اور بٹے کٹے نوجوان تھے اور ان کی عمریں بھی تیس برس سے کم تھیں۔ ان میں سے ایک بانو کا شوہر فیصل تھا جس کا حلیہ مجھے سپاہی نے بتایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ چاروں وہاں سے چلے جاتے یا چھپ کر پہرہ دیتے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ بدر دھیں آگ سے ڈرتی ہیں۔ اس لئے مجھے اندیشہ تھا کہ آگ کی موجودگی میں بدر دھیں آج نہیں آئیں گی۔ جبکہ میری خواہش تھی کہ وہ بدر دھیں آئیں تاکہ میں ان سے اپنی گزشتہ رات کی شکست کا بدلہ لے سکوں یا ان کا تعاقب کر کے ان کے ٹھکانے تک پہنچوں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ چاروں پہرہ دار قبر سے دور ہٹ جاتے اور آگ بھی بجھا دیتے لیکن میں انہیں وہاں سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح ان لوگوں کو ہماری موجودگی کا پتہ چل

انسان کی حقیقت؟

Genetic Engineering کی حقیقتات

انسانی جسم کے ہر خلیے میں اتنی مجموعی ثابث کرہکی ہیں، جہاں ”ڈس کروڈ“ صفحات کے برابر معلومات تحریر کی جاسکیں۔ بغیر خوردبین کے نظر نہ آسکنے والا معمولی خلیہ اپنے اندر اتنی وسیع دنیا لئے ہوئے ہے۔ ”روز آخرا اللہ رب العزت کے حکم پر انسانی جسم کا ہر خلیہ اپنی ساری سرنوشت زبان حال سے سنائے گا اور انسان کا سب کیا دھرا اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر دے گا۔“ (ایس حبیب خان۔ کراچی)

نارج بھی۔ ہم دبے پاؤں درختوں سے گزر کر دوسری طرف پہنچے تو ہمارے سامنے ایک قدیم عمارت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ انگریزوں کے دور کا کوئی ریٹ ہاؤس یا فونی چوک تھی۔ درختوں سے عمارت کا فاصلہ دس بارہ قدم سے زیادہ نہ تھا۔ عمارت کے آس پاس کسی ذمی روح کا نام و نشان نہ تھا۔ سامنے کی جانب عمارت کا چوٹی دروازہ تھا جو بند نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہی عمارت بدروحوں کا مسکن تھی۔ میں نے نازک کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں عمارت کے دروازے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دروازے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالا تو چرچاہٹ کی تیز آواز بلند ہوئی اور دروازہ کھلا چلا گیا۔ اندر گہری تاریکی تھی۔ میں دروازے کے پہلو میں رک کر دروازہ کھلنے کے رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے گزر گئے لیکن کچھ نہ ہوا۔ تب میں نے اللہ کا نام لے کر دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔ لیکن ابھی میرا دوسرا پاؤں باہر ہی تھا کہ اچانک عمارت سے تیز اور پراسرار آوازیں بلند ہونے لگیں اور میرا دل دہل گیا۔

یوں لگتا تھا جیسے عمارت کے اندر بیسیوں بدروحیں مل کر مین کر رہی ہوں۔ میں اپنی جگہ ساکن ہو کر رہ گیا۔ عمارت سے ابھرنے والی پراسرار اور خوفناک چیخ

بدروحیں جلد ہی اس جانب دافع جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں داخل ہو کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ ہم بھی اور کئی زمین پر احتیاط سے قدم نہ مارتے ہوئے ان درختوں کے پاس پہنچے۔ یہ جگہ اس مقام سے تقریباً بیس قدم پر تھی جہاں بدروحیں جھاڑیوں میں داخل ہوئی تھیں۔ ہم دونوں بھی جھاڑیوں میں گھس گئے۔ جھاڑیوں سے گزر کر ہم کھلی جگہ پر آئے تو وہ بدروحیں کھیتوں کے درمیان ایک پلڈنڈی پر چل رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا میں ان کے نکل لہرا رہے تھے۔ ہمارے سامنے قد آدم جوار کے کھیت تھے۔ ہم ان کھیتوں کے پہلو میں بدروحوں کے ستوازی چلنے لگے۔ میں نازک سے ایک قدم آگے تھا۔

”سر..... وہ کہاں جا رہی ہیں.....؟“ نازک نے چلے چلے پوچھا۔

”معلوم نہیں..... لیکن جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

جوار کے کھیتوں کی آڑ میں چلے ہوئے بدروحیں نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن جب کھیت ختم ہو گئے تو کچھ فاصلے پر اندھیرے میں ڈوبی کسی عمارت کا ہیولا دکھائی دینے لگا۔ بدروحیں اسی عمارت کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ شاید وہی عمارت ان کی منزل تھی۔ عمارت تک راستے میں کوئی فصل نہیں تھی۔ اسی لئے ہم متلا ہو کر چلنے لگے۔ اس منٹ بعد وہ بدروحیں عمارت کے گرد موجود درختوں کی آڑ میں پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں تو میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ نازک بھی تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ اس خیال سے خوشی کے مارے میرا دل بیلیوں جھل رہا تھا کہ میں نے بدروحوں کا مسکن معلوم کر لیا تھا۔ وہ بلند عمارت ان درختوں کے دوسری جانب تھی۔ جن میں بدروحیں غائب ہوئی تھیں۔ جلد ہی ہم ان درختوں کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے احتیاطاً اپنی رفتار کم کر دی تاکہ آہٹ پیدا نہ ہو۔ میں نے نازک کو روکا اور ہاتھ میں لینے کی ہدایت کی اور اپنا رپو اور بھی نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں

”سر..... یہ تو وہی ہیں۔ کل رات والی بدروحیں.....“ نازک نے سرگوشی کی۔

”ہاں۔ مگر تم کل رات والی حرکت مت کرنا۔“ میں نے اسے تنبیہ کی۔ ”ڈر لگ رہا ہو تو ان کی طرف مت دیکھو۔“

”بہت ڈھیت آدمی تھا بانو کا شوہر.....“ اچانک بدروحوں میں سے ایک کی آواز بلند ہوئی۔

”ہاں۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ چلا گیا۔“ دوسری بدروح نے ہنس کر کہا۔ ”ورنہ ہمیں دیکھ کر اس کا دم نکل جاتا.....“

”شکر ہے آج انکسپر کا شفع نہیں آیا۔ ورنہ کافی دیر ہو جاتی.....“ ایک بدروح نے کہا۔

”وہ بے چارہ ہماری دہشت سے بخار میں پھنک رہا ہوگا.....“ کدال بردار کفن پوش نے کہا۔

”خیر..... تم اپنا کام کرو۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے.....“ پہلی بدروح نے کہا تو کدال بردار بدروح قبر پر کدال چلانے لگی۔

جاتا اور بدروحیں آج بھی لاش نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاتیں تو سارا الزام پولیس پر آ جاتا۔ اتفاق سے ایک گھنٹہ بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ہم نے فوراً چھتریاں کھول کر تان لیں۔ بارش سے آگ بجھنے لگی اور پھر لائیں بھی بجھ گئی۔ لیکن وہ چادروں وہاں بیٹھے رہے۔ چند لمحوں بعد آگ پوری طرح بجھ گئی اور وہاں اندھیرا پھیل گیا۔ بارش تیز ہونے لگی۔ بارش کی بوندیں قبر کے تعویذ پر گر کر نے سے ہم پر بھی چھینے پڑ رہے تھے اور ہماری گرم چادریں کھلی ہوئی جا رہی تھیں۔

”فیصل بھائی۔ بارش میں چورزوں کے آنے کی امید نہیں ہے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔“ فیصل کے ایک ساتھی کی آواز سنائی دی۔

”ہاں یار۔ چوروں نے آنا ہوتا تو اب تک آچکے ہوتے۔“ دوسرے نے کہا۔

”تم لوگ جانا چاہو تو بے شک چلے جاؤ۔“ میں تنہا پرہردول گا۔

”پاگل تو نہیں ہو یا.....“ ایک اور آدمی بولا۔

”یہاں بارش میں کب تک بھیکتے رہو گے صبح تک تو تمہیں غوٹنا ہو جائے گا۔“

میں اور نازک خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ چند لمحوں کی بحث کے بعد فیصل وہاں سے جانے پر راضی ہو گیا۔ انہوں نے بھی ہوئی لائین اٹھائی اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد نازک اور میں تھرماس میں لائی ہوئی چائے پینے لگے۔ بارش کم ہونے لگی تھی۔ ایک بچہ بوندا باندی رک گئی تو ہم نے چھتریاں بند کر کے تھیلے میں ڈال لیں۔ پھر میں چادر اتارنے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ میری نگاہ بانو کی قبر کی طرف اٹھ گئیں اور میں جلدی سے دوبارہ بیٹھ گیا۔ میں نے قبر کے تعویذ سے ڈرا بلند ہو کر دوبارہ اس طرف دیکھا تو نازک نے بھی میری تھلید کی۔ بانو کی قبر کے پاس پانچ کفن پوش بدروحیں موجود تھیں۔ ایک کے پاس کدال تھی۔

ڈھانچے مسلسل آگے ہی آگے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور درختوں کی طرف دوڑنے لگا۔ درختوں میں بچھ کر میں ایک درخت کی آڑ میں رکھا اور ہانچتے ہوئے عمارت کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مگر اسی لمحے دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے چند لمحوں میں اپنے سانس پر قابو پایا۔ میں ڈھانچوں کی گرفت میں آنے سے بچ گیا تھا۔ لیکن میں وہاں سے ناکام واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی کھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بج چکے تھے۔ میں نے چند منٹ انتظار کیا۔ پھر دبے پاؤں آگے بڑھا اور نازک کے پاس پہنچ گیا جو زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور درختوں کی دوسری طرف لاکر زمین پر لٹا دیا۔ پھر میں دوبارہ ادھر گیا اور وہ تھکلا اٹھالیا جس میں چائے کے تھرماس کے علاوہ میرا سرکاری موبائل فون بھی تھا۔ میں نے تھیلے سے فون نکالا اور تھکلا نازک کے پاس چھوڑ کر عمارت کی مخالف سمت چلنے لگا۔ وہاں سے تقریباً سو قدم دور آ کر میں رک گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بدردھوں سے آج ہی نمٹوں گا تاکہ وہ آئندہ کسی کی لاش چوری نہ کر سکیں۔ میں نے موبائل پر اپنے تھکانے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور جلد ہی رابطہ قائم ہو گیا۔

”ہیلو..... شاہدہ پولیس اسٹیشن.....“ دوسری طرف سے حوالدار غشی ظفر کی آواز سنائی دی۔

”کاشف بات کر رہا ہوں ظفر.....“ میں نے بتایا! ”اوہ..... السلام علیکم سر.....“ ظفر کا لہجہ مودبانہ ہو گیا جس میں حیرت کی آمیزش تھی۔

میں نے اسے چند ہدایات دیں اور آخر میں کہا۔ ”تم لوگوں کی ذرا کوتاہی سے کام بگڑ سکتا ہے اس لئے انتہائی ہی محتاط رہنا۔“

”آپ بے فکر ہیں سر..... آپ کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا جائے گا.....“ ظفر نے کہا۔

میں نے موبائل آف کیا اور درختوں کی طرف چل دیا۔ وہاں نازک بدستور بے ہوش پڑا تھا۔ عمارت

کی طرف سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے تھرماس سے چائے نکال کر پی اور درختوں میں سے گزر کر عمارت کی جانب آ گیا۔ ☆.....☆.....☆

خون کا عمارت کا صدر دروازہ بدستور بند تھا۔ میں عمارت کے ساتھ ساتھ دائیں جانب بڑھنے لگا۔ میں عمارت کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ اس میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ بھی ہے یا نہیں۔ عمارت کے گرد گھوم کر میں عقبی جانب پہنچا تو ادھر میری ایک چھوٹی سا دروازہ تھا مگر وہ بند تھا۔ میں دروازے کے پاس آیا اور اس سے کان لگا کر سن گئی۔ لینے کی کوشش کی۔ لیکن اندر سے کوئی آواز نہ سنائی دی میں نے احتیاط سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر دبا ڈالا لیکن دروازہ نہ کھلا۔ یقیناً وہ اندر سے بند تھا۔ دروازے کے سامنے کی جانب درختوں کا ایک جھنڈ واقع تھا۔ میں ان درختوں کی طرف بڑھا اور جھنڈ سے گزر کر میں دوسری طرف پہنچا تو بے ساختہ اچھل پڑا۔ جھنڈ کے عقب میں ایک کار کھڑی تھی اور وہاں سے ایک کپڑا راستہ مغرب کی سمت جا رہا تھا۔

بدردھوں کے مسکن کے پاس کار کی موجودگی سے میرے دماغ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور میں سوچنے لگا کہ کار کا وہاں کیا کام؟ یہ تو زندہ اور مادی جسم رکھنے والے انسانوں کے استعمال کی چیز ہے جبکہ بدردھوں مادی جسم سے آزاد تھیں۔ میں دبے پاؤں کار کے پاس پہنچا۔ آخری راتوں کا چاند طلوع ہو چکا تھا۔ جس سے تاریکی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ میں نے کار کا جائزہ لیا۔ وہ بانوے ماڈل کی ٹیڈا کرولا تھی۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازے مقفل تھے۔ میں نے کچھ سوچا اور حوالدار ظفر کو دوبارہ فون کرنے کے لئے وہاں سے کچھ دور پہنچ گیا۔ میں نے تھکانے کے نمبر ملائے تو فوراً ہی رابطہ قائم ہو گیا۔ میں نے ظفر کی آواز سن کر اسے پروگرام میں تھوپی ہی تبدیلی کی اطلاع دی پھر فون بند کیا اور اس سمت چل دیا جہاں نازک بے ہوش پڑا تھا۔

میں واپس پہنچا تو مجھے ایک بار پھر حیرت کا جھٹکا

لگا۔ سب انسپکٹر نازک اپنی جگہ سے غائب تھا۔ تھرماس والا تھکلا ابھی نظر نہ آ رہا تھا حالانکہ دس منٹ پہلے تک وہ یہاں موجود تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید میری غیر موجودگی میں نازک کو ہوش آیا ہوگا اور وہ تھکلا اٹھا کر سڑک کی جانب روانہ ہو گیا ہوگا۔ میں نے عمارت کی مخالف سمت نظریں دوڑائیں۔ لیکن حدنگاہ تک مجھے نازک یا اس کا ہیولا نہ دکھائی دیا۔ شاید وہ اتنی دیر میں جوار کے کھیتوں کی آڑ میں پہنچ چکا ہوگا۔ میں نے سوچا مگر میرا ذہن مطمئن نہ ہو سکا۔ مجھے یقین تھا کہ نازک مجھے وہاں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ میں نازک کے بارے میں اندازے قائم کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے میری غیر موجودگی میں بدردھوں باہر آئی ہوں اور نازک کو اٹھا کر اندر لے گئی ہوں۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اگر بدردھوں نے اسے لے جانا ہوتا تو اس وقت لے جاتیں جب میں عمارت میں پھنسا ہوا تھا۔ مجھے دوسرا خیال آیا کہ شاید نازک ہوش میں آنے کے بعد میری تلاش میں عمارت کی طرف گیا ہو۔ چنانچہ میں درختوں سے گزر کر دبے پاؤں عمارت کے دروازے کی طرف آیا۔ لیکن دروازہ بند تھا اور نازک اس طرف بھی موجود نہ تھا۔ میں پریشان ہو کر واپس اس جگہ آ گیا جہاں سے نازک غائب ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر میں نازک کے بارے میں سوچتا ہوا وقت گزارنے لگا۔

چار بجے تو میں اٹھا اور باہر ہی باہر عمارت کے عقب کی جانب بڑھنے لگا جہاں میں نے ٹیڈا کار دیکھی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں ایک درخت کی آڑ میں رکھا اور مغربی جانب دیکھنے لگا جہاں سڑک جاتی تھی۔ چند منٹ بعد اسی راستے پر چند ہیولے دکھائی دینے لگے۔ جلد ہی وہ ہیولے قریب آ گئے، مجھے انہی کا انتظار تھا۔ میری ہدایت کے مطابق حوالدار ظفر بارہ مسلح سپاہیوں کے ہمراہ وہاں آ پہنچا تھا۔ میں درختوں کی آڑ سے نکل کر راستے پر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ میرے قریب آ رکے۔ میری ہدایت کے مطابق انہوں نے موبائل گاڑی وہاں سے کافی دور چھوڑی تھی اور پیدل ہی یہاں تک آئے تھا۔ میں نے حوالدار ظفر سے راج لی اور

اسے ہدایات دینے لگا۔

”تم چھ آدمیوں کے ساتھ مشرقی جانب عمارت کے صدر دروازے کے سامنے درختوں کی آڑ میں پوزیشنز لے لو۔ ادھر سے جو بھی آئے، اسے بھون ڈالنا، کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔“ میں نے کہا۔

”سر..... مجرم کون ہیں.....“ حوالدار ظفر نے پوچھا۔

”میں نے سوچا کہ اگر میں بدردھوں کا نام لوں تو وہ لوگ خوف کے سبب اپنے فرائض انجام نہ دے سکیں گے۔“ چنانچہ میں نے کہا۔

”وہ اسمگلرز ہیں۔ انہوں نے پولیس سے بچنے کے لئے سفید کفن جیسے لباس پہنے ہوئے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کوشش کرنا کی فائرنگ سے ان کی صرف ٹانگیں چھلکتی ہوں تاکہ وہ زندہ ہاتھ آئیں۔“ حوالدار ظفر جیسے سپاہیوں کے ساتھ عمارت کے سامنے کی طرف چلا گیا تو میں نے ایک سپاہی کو کار کے پاس متعین کیا اور ہدایت کی کہ اگر مجرم کار کے ذریعے فرار ہونا چاہیں تو فائر کر کے کار کے ٹائر برست کر دینا۔ پھر میں نے بقیہ پانچ سپاہیوں کو ہدایت کی کہ میرے اشارے کے بغیر کوئی نہیں چلائیں گے اور کسی مجرم کو فرار بھی نہ ہونے دیں گے۔ اس کے بعد میں انہیں ساتھ لے کر عمارت کے مغربی دروازے کی طرف چل دیا۔

☆.....☆.....☆

ہم دبے پاؤں درختوں کے جھنڈ سے گزر کر عمارت کے دروازے کے سامنے پہنچے۔ میرے اشارے پر سپاہی رک گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے سے لگان لگا یا تو اندر سے قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ وہ آہٹیں دروازے کی طرف آ رہی تھیں۔ آہٹیں ایک ہی افراد کی معلوم ہوتی تھیں۔ میں دروازے کے پہلو میں دیوار سے لگ گیا اور سپاہیوں کو بھی سامنے سے ہٹا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ آہٹیں قریب آتی چلی گئیں۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک کفن پوش بدردھ باہر آئی۔ میں نے بھرتی سے ایک ہاتھ اس کے منہ پر جماتے ہوئے

دوسرے ہاتھ میں موجود یو لور کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر رسید کر دیا۔ بدروح کے حلق سے نکلنے والی چیخ منہ میں ہی گھٹ گئی اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی۔ میں نے اسے تھکیت کر دیوار کے برابر ڈالا اور پھر سپاہیوں کو اپنے پیچھے آ کر اشارہ کرتا ہوا دے پاؤں عمارت میں داخل ہو گیا۔

اندر تارکئی تھی۔ میں نے حوالدار ظفر سے لی ہوئی نارنج روشن کر کے اس کی محدود روشنی میں وہاں کا جائزہ لیا۔ ایک چھوٹی سی راہداری تھی جس میں آنے سامنے چار کمرے تھے۔ لیکن ان کے دروازے نہیں تھے۔ فرش پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ میرے سپاہی بھی اندر آ گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک کمرے میں روشنی ڈالی۔ وہ خالی تھا اور اندر خور و گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اگلے دو کمرے بھی دیکھ ڈالے۔ لیکن وہ بھی پہلے کمرے کی طرح ویران تھے۔ پھر میں چوتھے کمرے کی طرف بڑھا۔ قریب آ کر میں نے اندر روشنی ڈالی اور چونک پڑا۔ وہ کمرہ بھی خالی ہی تھا۔ لیکن اس کے وسط میں فرش پر ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ خلا کے آس پاس خور و گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس خلا کے اندر روشنی مخصوص ہو رہی تھی۔ شاید نیچے کوئی تہ خانہ تھا۔

میں نے سپاہیوں کو کمرے سے باہر ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ کسی سیاہ جانور نے بائیں جانب سے مجھ پر چھلانگ لگائی اور میرے ہاتھ سے نارنج چھوٹ کر نہ جانے کہاں جا گری۔ میں لڑکھڑایا اور اسی لمحے اس جانور نے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ باہر سے کسی سپاہی کی خوفزدہ سی چیخ بلند ہوئی۔ میں نے جلدی سے مستحیل کر فرش کے خلا کی طرف دیکھا تو اس میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ جس کے سبب مجھے خلا نظر نہ آیا۔ دوسرے ہی لمحے عمارت بدروحوں کی ہمایاں کی چیخ و پکار سے گونجنے لگی۔ میں نے تیزی سے دروازے کی طرف رخ کرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا کہ وہ تارچیں روشن کر لیں۔ لیکن ان میں سے صرف ایک

کے پاس نارنج تھی۔ اور وہ بھی پٹیل نارنج تھی۔ اس نے نارنج روشن کی اور میں باہر آ گیا۔ میں نے اس سے نارنج لی۔ وہ سب خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ بدروحوں کی چیخ و پکار دل ہلا رہی تھی۔ ”گھبراؤ مت۔۔۔۔۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”دیوار کے ساتھ پوزیشن لے لو۔ جو بھی اس کمرے سے باہر آئے اسے بھون ڈالو۔“

پھر میں نے نارنج بجھا دی اور انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد بدروحوں کی چیخ و پکار بند ہو گئی اور عمارت پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ میں دیوار سے لگ کر کمرے میں جھانکنے لگا۔ چند لمحوں بعد اندر خلا میں دوبارہ روشنی ہو گئی۔

”معلوم کرو۔ اوپر کون ہے۔ جو بھی ہو بخیر نہ جانے پائے۔ شاید وہ اسٹیشنر پھر آ گیا ہے۔“ ایک آواز سنائی دی۔

وہ آواز اسی خلا سے بلند ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد خلا سے ایک کفن پوش بدروح باہر آئی تو میں نے جلدی سے اپنا چہرہ چھپے بھائیالیا۔ پھر جو بھی اس بدروح کے قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آئی، میں نے ایک دم نارنج کارخ اس کی جانب کر کے نارنج روشن کی اور ریو لور کی نال اس کے سینے سے لگا دی۔

”خبردار۔۔۔۔۔“ میں نے محمانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ”ہاتھ بلند کرلو۔ ورنہ سنے میں سوراخ ہو جائے گا۔“ اس بدروح کے حلق سے خوفزدہ سی چیخ نکلی اور اس نے ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ میری نارنج پر مارا۔ میرے ہاتھ سے نارنج گر گئی اور میں نے بے اختیار فائر کر دیا۔ بدروح کے حلق سے ہمایاں کی چیخ نکلی اور وہ تڑپتی ہوئی گر گئی۔ ایک مرتبہ پھر عمارت کے مختلف گوشوں سے پراسرار خوفناک چیخ و پکاری آوازیں ابھرنے لگیں۔ ہمارے پاس مزید نارنج نہیں تھی۔

گرنے والی نارنج گرتے ہی بجھ گئی تھی۔ اس لئے اسے تلاش کرنا دشوار تھا۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا اور خلا میں جھانکنے لگا۔ خلا میں نیچے جانے کے لئے زیپ تھے

اور زیپوں کے اختتام پر دائیں بائیں راہداریاں تھیں۔ وہاں چند کفن پوش بدروحیں کھڑی تھیں۔ وہ بھی اوپر کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ خلا سے آنے والی ہلکی ہلکی روشنی میں انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔

”انسپکٹر کاشف۔۔۔۔۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔“ ان میں سے ایک بدروح نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیا اس بند کرو۔۔۔۔۔“ میں ریو لور کارخ ان کی طرف کرتے ہوئے غرایا۔ ”پولیس نے چاروں طرف سے اس عمارت کو گھیرے میں لے لیا ہے۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔“ مجھ سے مخاطب بدروح نے قہقہہ لگایا۔ ”پولیس ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ ہم تو صرف روحیں ہیں جنہیں نہ پکڑا جا سکتا ہے اور نہ مارا جا سکتا ہے۔“

”بدروح کے بچے۔ میں تمہاری ڈرامے بازی سمجھ چکا ہوں۔ تمہارا ایک ساتھی ہماری گرفت میں ہے ہوش پڑا ہے اور دوسرا ہلاک ہو چکا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”زندگی چاہتے ہو تو تم سب ہاتھ بلند کر کے اوپر آ جاؤ۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔“

میری وہ تمسکی سن کر اس بدروح نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں چیخ و پکار کی آوازیں بند ہو گئیں۔ میں نے سپاہیوں کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”تم لوگ اندر آ جاؤ۔ جو بھی فرار ہونے یا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے اسے چھینٹ کر دو۔“

یہ کہہ کر میں نے تہ خانے میں جھانکا تو بدروحیں غائب ہو چکی تھیں۔ ٹھیک اسی لمحے باہر سے فائرنگ کی آواز بلند ہونے لگی۔ شاید بدروحوں نے صدر دروازے کی طرف سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور میرے ماتحتوں نے ان پر فائرنگ کر دی تھی۔

☆☆☆

میں نے سپاہیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خلا میں زیپ پر اترنے لگا۔ نیچے کوئی نہ تھا۔ راہداری میں چار کمرے تھے جن کے دروازے سلامت تھے۔

راہداری کے اختتام پر زیپ تھے جو اوپر جا رہے تھے۔ ان زیپوں کے اختتام پر ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ راہداری کی بائیں دیوار کے ایک طاقے میں پیٹر ویکس لیپ چل رہا تھا۔ کمروں میں بھی روشنی تھی۔ میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا تو حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔ اندر لیپ کی روشنی میں ایک آپریشن ٹیمیز کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں ایک میز پر ایک نوجوان عورت کی لاش رکھی تھی۔ یقیناً وہ بانو کی لاش تھی جو میرے سامنے قبر سے نکال کر یہاں لائی گئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ مختلف میزوں پر شیشے کے بڑے بڑے مرتبان رکھے تھے جن میں مختلف انسانی اعضا نظر آ رہے تھے۔

میں نے جلدی سے دوسرے کمرے بھی دیکھ ڈالے، ان میں سے دو بیڈروم تھے جبکہ چوتھا کمرہ کچن تھا۔ ایک بیڈروم میں سب انسپکٹر نازک بستر پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ تلاشی کے دوران مجھے ایک نارنج بھی مل گئی۔ میں نے دو سپاہیوں کو وہاں چھوڑا اور تین سپاہیوں کے ساتھ راہداری کے اختتام پر واقع زیپوں کی طرف چل دیا۔ زیپے طے کر کے میں کھلے دروازے سے باہر آیا تو اس جانب وہ راہداری تھی جس کے سرے پر عمارت کا صدر دروازہ تھا اور دروازہ کھلا تھا۔

”ظفر۔۔۔۔۔“ میں نے باہر نکلنے سے پہلے حوالدار کو آواز دی۔ ”فائرنگ مت کرنا۔“

پھر ہم باہر آ گئے۔ باہر چار کفن پوشوں کی لاشیں پڑی تھیں جبکہ ایک کفن پوش میرے ماتحتوں کے گھیرے میں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی بدروح تھی جس نے تہ خانے میں مجھ سے بات کی تھی۔

اگلی صبح دس بجے شاہدرہ تھانے میں میرے سامنے لاہور کے ممتاز اخبارات کے تین رپورٹرز بیٹھے تھے۔ میں انہیں بدروحوں کا قصہ سناتا تھا۔ جبکہ زندہ گرفتار ہونے والی بدروح کفن میں ملبوس میرے بائیں



قوم جنات

حافظ محمد ہاشم ہوت۔ میرپور خاص

دیکھتے ہی دیکھتے اچانک ہوانے جھکڑ کی شکل اختیار کر لی اور پھر ہوا سمٹتے سمٹتے ایک جگہ ٹھہر گئی پھر ہوا میں ایک عجیب و غریب ہیولہ ظاہر ہونے لگا، جب وہ ہیولہ مکمل ہوا تو اسے دیکھ کر.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ قوم جنات کی عمریں ہزاروں سال ہوتی ہیں۔ ثبوت کہانی میں موجود ہے

پاس رہتی ہے۔ لیکن وہ ہمیں دکھتی نہیں۔ اور وہ مخلوق ہے۔ ”قوم جنات“.....

ویسے تو اللہ نے بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں جس کا شمار اس ذات الہی کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں ہے۔ رات کے دس بج رہے تھے رضوان، کا شیف اور کا شیف کا چھوٹا بھائی آصف یہ تینوں دوست آج گاؤں سے تھوڑا دور ایک پھیل کا درخت تھا۔ اس کے نیچے بیٹھے

اس کا مطلب ہے کہ ”فَعُوذُ بِاللّٰهِ“ تو قرآن پاک کا معجزہ ہے۔ کیونکہ قرآن پاک نے تو واضح طور سے یہ بتا دیا ہے کہ انسان کے علاوہ بھی اللہ نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جس کا انسانوں کی طرح آخرت میں حساب کتاب ہوگا اور جیسے انسانوں میں قوم اور قبیلے اچھے برے ہیں۔ اس طرح اس مخلوق میں یعنی اس مخلوق میں بھی قوم اور قبیلے ہیں اور وہ مخلوق ہمارے آس

روز میں نے اس بات پر غور کیا کہ وہ بدرو میں مجھ سے کیوں خوفزدہ تھیں۔ اگر انہیں میرا ڈر نہیں تھا تو میری پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مجھے گمان ہوا کہ وہ اصل رو میں نہیں ہیں۔

پھر دوسری رات جب انہوں نے بانو کی لاش نکالی تو انہیں میری اور سب انسپکٹر نازک کی موجودگی کا احساس نہ ہوسکا حالانکہ رو میں دور تک اور ٹھوس اشیاء کے پار تک دیکھ سکتی ہیں۔ ہم نے ان کا تعاقب کیا تب بھی انہیں ہمارا پتہ نہ چلا جس سے میرے شبہ کو تقویت ملی۔ عمارت کے دروازے میں داخل ہوتے دقت اور پھر رابداری میں یکے بعد دیگرے جو مختلف پراسرار آوازیں سنائی دی تھیں، ان سے میں خوفزدہ تو ضرور ہوا تھا لیکن بعد میں غور کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ آوازیں اس طرح بلند ہوتی یا بند ہوتی تھیں جیسے کسی ٹیپ ریکارڈ کا ٹین آؤن کرنے سے یکدم آواز آنا شروع ہو جاتی ہے اور ٹین آف کرنے سے فوراً بند ہو جاتی ہے۔

بس انہی محسوسات نے میرا شبہ یقین میں بدل دیا کہ بدرو میں اصلی نہیں ہیں اور میں نے آپریشن کے لئے تھانے سے فوراً طلب کر لی۔ تلاشی کے دوران وہاں سے بانو کی لاش سلامت ملی۔ میری طرف متوجہ ہونے کے سبب انہیں لاش کو چہرے نہ بھانپنے اور دل گردے یکجہرہ لگانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ افسر اور امجد کی لاشوں سے نازک اعضاء نکالنے کے بعد انہیں عمارت کے اندر ہی دفن کیا گیا تھا۔

پھر میرے اشارے پر سپاہیوں نے ڈاکٹر مارٹن کے سر اور چہرے سے کفن ہٹایا اور اخباری فوٹو گرفتار اس کی تصویریں بنانے لگے۔ اگلے دن اخبارات کی ہیڈ لائن اس واقعہ کے متعلق تھی۔ اس آپریشن کا ہیرو مجھے یعنی انسپکٹر کا شیف لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر مارٹن کو عدالت میں پیش کیا گیا اور عدالت نے اسے پھانسی کی سزا سنائی۔



جانب کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سرکاری زلیور تھے اور دو سپاہی اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ اس بدروح نے کفن کے نیچے آکر بڑی سوٹ پہنا ہوا تھا۔

”اس بدروح کا نام ڈاکٹر مارٹن ہے اور یہ دیسی عیسائی ہے۔“ میں نے رپورٹر کو بتایا۔ ”اس کا گھر نیگم کوٹ میں ہے۔ اس نے انسانی اعضاء کی اسمگلنگ کا منصوبہ بنایا اور اس ویران ریست ہاؤس کے تہہ خانے میں آپریشن تھیٹر قائم کیا۔ پھر اس نے اپنے ہم مذہب کے چھ سات آدمیوں کو ساتھ لایا اور اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اس کے لئے انہوں نے قبرستان سے تازہ دفن شدہ لاشیں چوری کرنا شروع کر دیں۔ یہ رات کے وقت کفن پکن کر بدروحوں کی مانند قبرستان میں جاتے اور وہاں سے تازہ لاش نکال کر قبر کو بند کر دیتے۔ ریست ہاؤس کی عمارت میں انہوں نے ایک کمر نصب کر رکھے تھے جس کے ذریعے ٹیپ شدہ چیخ و پکار نشر کی جاتی تھی۔ گزشتہ دنوں انہوں نے وقت بچانے کے لئے افسر کی لاش نکالنے کے بعد قبر کھلی چھوڑ دی تھی جس سے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ لاش چوری کر لی گئی ہے۔ معاملہ ہم تک پہنچا تو ہمارے لئے یہ کیس ایک چیلنج بن گیا۔“

میں نے صحافیوں کو اپنی تحقیقات سے آگاہ کیا اور مجرموں کے اڈے پر جو واقعات پیش آئے تھے، وہ بھی بیان کر دیئے۔ ”آپ کو کس مرحلے پر احساس ہوا کہ بدروحیں اصل نہیں ہیں یا یہ کفن پوش زندہ انسان ہیں؟“ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

”اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے قبر کھودنے والے کے ہاتھ میں کدال دیکھی۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”ہم سمجھ جاتے ہیں اور بزرگوں سے بھی سنتے آتے ہیں کہ روح کا کوئی مادی جسم نہیں ہوتا اور جسم سے نکلنے کے بعد وہ دنیاوی ضروریات اور مسائل سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ اسے کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ قبرستان میں پہلی رات بدروحوں نے مجھے مخاطب کیا اور مجھے قبرستان سے بھاگ جانے کا حکم دیا تھا۔ دوسرے

تھے۔ اور یہ لیکچر آج رضوان کاشف کو دے رہا تھا۔ جو اس بات کو مانتا ہی تھا کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ جن بھوت یا چڑھلیں وغیرہ ہیں۔ بلکہ کاشف تو جن بھوت کے وجود سے ہی مسکرتھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ جن بھوت قصے کہانیوں میں ٹھیک لگتے ہیں۔ ان چیزوں کا اس دور میں وجود ہے ہی نہیں۔

کاشف رضوان کی بات پوری ہونے کے بعد بولا۔ ”یہ بات نہیں کہ میں قرآن پاک کا مسکر ہوں۔ لیکن یہ تو تو بھی سوچ کہ اس زمانے میں جبکہ انسان نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب تو ماشاء اللہ سائنس دان چاند پر پہنچ رہے ہیں۔ اور اتنے ترقی یافتہ دور میں کون باطل کا بچہ ایسی بات اپنے منہ سے نکالے گا کہ میں نے جن بھوت یا چڑھل کو دیکھا ہے۔ اور ہاں تجھے تو پتا بھی ہے کہ میں تقریباً روزانہ رات کو دروینوں میں پھرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا کام ہی کچھ ایسا ہے کہ کبھی کبھتوں میں پانی لگاتا، کبھی بہرا دیتا۔ تو بھائی میں نے آج تک ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔ اس سے یہ اندازہ لگاؤں کہ یہاں جنوں بھوتوں یا چڑھلوں کا بئیرا ہے۔“ یہ بات کاشف کہہ رہا تھا۔ جس سے تقریباً دو گھنٹوں سے رضوان مغز ماری کر رہا تھا۔

اور اس کا مطلب ہے کہ تو اس بات کو بالکل نہیں مانے گا کہ قوم جنت کا وجود آج بھی ہے۔ لیکن بھی بات تو یہ ہے کہ میں اس قوم کو مانتا ہوں۔ کیونکہ ایک مشہور واقعہ جو میں نے.....“

”ہاں ہاں پتا ہے اب تو یہ کہے گا کہ یہ واقعہ مجھے میرے ماموں یا میرے دوست نے سنایا ہے۔ بھئی اگرچہ مانے تو تیری کوئی بھی جھوٹی کہانی نہیں سنوں گا، اور اگر یہ سناے گا تو پھر بھی میں اعتبار نہیں کروں گا.....“ کاشف نے رضوان کی بات کو کچھ میں کاٹ کر کہا۔

کاشف کا بھائی آصف جو ابھی تک ان دونوں کی گفتگو کے درمیان بہت بنا بیٹھا تھا۔ ایک دم بول پڑا۔ اور کہنے لگا۔ ”یار! رضوان تو مجھے سنا اگر کوئی واقعہ تیرے ذہن میں ہو۔ اور رضوان تجھے پتا بھی ہے کہ بڑے بھائی

کبھی بھی تیری بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ بھائی کاشف جب بھی اپنی ضد پر آجاتا ہے تو پھر اس پر کسی کی بات کا اثر نہیں پڑتا۔ حالانکہ قرآن پاک میں تو اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ..... میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اتنے بڑے ثبوت کے بعد جب کہ قرآن پاک میں اور بھی اللہ تعالیٰ کے کئی ارشاد اس کی گواہی دے رہے ہیں کہ اس دن میں پر قوم جنت کا وجود ہے اور سورۃ جن میں دیکھو کیا بتایا گیا ہے۔ اگر اب بھی کوئی اور نہ مانے تو بھی سوائے اس کے ایمان پر شک کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ اور اتنے بڑے ثبوتوں کے بعد بھی کوئی نہ مانے تو اس کا اللہ حافظ ہے۔“

”تو سنا میں سنوں گا۔ سچ مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ ایسے پر اسرار قصے اور کہانیاں سن کر.....“

کاشف نے کہا۔ ”بھئی میں تو چلا۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔ مجھے نہیں سننی ایسی الٹی سیدھی باتیں۔ اور ہاں رضوان صاحب اگر ہو سکے تو آخر میں بھائی آصف کو ایک پرسی بھی دکھا دیتا۔“ اتنا کہہ کر کاشف جیسے ہی اٹھنے لگا تو آصف نے کاشف سے کہا۔ ”کاشف بھائی اگر آپ کو یقین نہیں تو تاسی کی کم از کم میری خاطر ہی بیٹھیں ساتھ چلیں گے۔ مجھے ڈر لگے گا۔ اکیلے جاتے ہوئے.....“ اور پھر کاشف نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے چھوٹے بھائی آصف کی خواہش پر بیٹھ گیا۔ اور رضوان سے کہنے لگا رضوان ذرا جلدی لے لی مجنوں کی داستان ختم کرنا کیونکہ ابھی مجھے کبھتوں میں بھی جانا ہے۔“

رضوان نے کہا۔ ”کاشف مجھے پتا ہے۔ بلکہ یقین ہے کہ تو میری باتوں پر اعتبار نہیں کرے گا۔ پھر بھی ایک بات میں بتاؤں کہ یہ مخلوق جو ہمارے آس پاس ہی موجود ہے وہ پہلے تو ہمارے سامنے نہیں آتی۔ ہاں اگر کوئی ان کو تنگ کرتا ہے، تو پھر یہ اس کا چچھا نہیں چھوڑتی اس کا ایسا حشر کرتی ہے کہ آدمی قیامت تک اس کا غذاب یاد کرتا ہے۔ اور یہاں تک کہ دیکھا اور سنا گیا ہے کہ جو بھی ان کو تنگ کرتا ہے یہ مخلوق اس کے خاندان

تک کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ ایسی ضدی مخلوق ہے کہ کیا بتاؤں..... لیکن ان میں کچھ اس قسم کے جن موجود ہیں جو اس پسند ہیں.....“

”چھوڑ بھئی! مجھے معاف ہی کر! تو بھائی آصف کو سنا جو بھی جھوٹ تیرے پاس ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ۔ اور ویسے بھی میں آصف کی ضد کی وجہ سے بیٹھ گیا ہوں۔ ورنہ میں تو کب کا جا چکا ہوتا۔“ کاشف نے رضوان کو ٹوٹے ہوئے کہا۔

”بھائی رضوان آپ بڑے بھائی کی باتوں کا برا مت مانو۔ آپ مجھے سنائیں میں سن رہا ہوں۔“ آصف نے اپنے بڑے بھائی کی بات پوری ہونے کے بعد کاشف کی طرف سے معذرت بھی کی اور ایک مرتبہ پھر رضوان سے فرمائش کر دی۔ لیکن رضوان بھی آج اپنی ضد منوانے کے موڈ میں تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ تو کاشف کو جن دکھانے کے چکر میں تھا۔ اور اس لئے وہ کاشف کی کسی بھی بات کا برا نہیں مان رہا تھا۔ اور وہ کاشف کی بات کو نہایت سکون کے ساتھ سنتا اور پھر کوئی نہ کوئی دلیل اس کے سامنے رکھ دیتا، جس کو کاشف کا ذہن پتا نہیں کیوں تسلیم ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ رضوان کی بات کو پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیتا۔ اور اپنی طرف سے تو اس کی یہی توجش تھی کہ کسی طرح رضوان تنگ آ کر کوئی واقعہ نہ سناے اور ان دونوں بھائیوں کو جانے دے۔

لیکن رضوان اس کی ہر توجش کو ناکام بنا دیتا۔ اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب بھی تھا۔ کیونکہ رضوان کے ساتھ آصف بھی تو تھا۔ اور پھر رضوان نے ایک واقعہ سنا شروع کر دیا۔ جو کچھ اس طرح تھا کہ..... ”عثمان نامی ایک شخص جو ہمارے گاؤں کا ہی رہنے والا تھا۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ تیری ہی طرح کاشف صاحب رات کو کبھتوں میں پہرہ دیتا تھا اور یہی پانی لگاتا ہوتا تھا۔ وہ بے چارہ اکیلا آدمی تھا۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا لیکن وہ بچپن کی عمر میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ اس لئے عثمان بے چارہ اکیلا رات کو اپنے

کبھتوں میں پہرہ دیتا تھا۔ کیونکہ اس کے کھیت گاؤں سے کافی دور تھے۔ اور ان کبھتوں کے قریب ہی ایک جنگل چھوٹا سا تھا۔ جس میں جانور وغیرہ تھے جو ظاہر ہے رات کو رزق کی تلاش میں نکلتے تھے۔ اور پھر عثمان کے کبھتوں کی حالت ابتر کر دیتے تھے اس لئے وہ بے چارہ ساری رات چاہے سردی ہو، برسات ہو یا کچھ بھی ہو لیکن وہ بندہ خدا کا کبھتوں میں پھر رہا ہوتا تھا۔

جس علاقے میں عثمان کے کھیت تھے وہ علاقہ صدیوں سے غیر آباد پڑا تھا۔ یعنی انسانوں کی آبادی سے کافی دور تھا۔ اور وہاں کچھ کھنڈرات بھی تھے۔ اور ایک پرانی مسجد کے آگے جا رہی تھی جو آباد نہ ہونے کی وجہ سے بالکل کھنڈر بن گئی تھی۔

اس مسجد کے بارے میں بلکہ اس پورے علاقے کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ علاقہ آسب زدہ ہے اس لئے ہر وقت یہاں دیرانی کا راج تھا اور بالکل سناں وغیرہ آباد علاقہ تھا۔ لوگ یہاں رات تو دور کی بات دن کو بھی کم ہی جاتے تھے۔ وجہ وہ آسب حالانکہ اتنی دیرانی ہونے کے باوجود عثمان بے چارہ مجبور اس پر اسرار اور دیران کھنڈروں کے پاس ساری رات پہرہ دیتا تھا۔ اور لوگ اس بات پر حیران بھی تھے کہ اتنے پر اسرار اور خوفناک علاقے سے عثمان زندہ واپس کیسے آتا ہے۔ اور کچھ لوگوں نے ازراہ ہمدردی عثمان کو کہا بھی کہ ان کبھتوں کو چھوڑ کوئی اور کاروبار کرلو، ورنہ خوفناک اور پر اسرار کھنڈرات سے تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ اور کون جانے گا تمہاری لاش لینے ان جنوں سے۔

عثمان کہتا۔ ”آخر میں کون سا کاروبار کروں مجھے تو کسی اور کاروبار کا تجربہ ہی نہیں ہے۔ اور نہ تو اگر میری ان کھنڈروں میں لکھی ہوئی ہے تو وہ ضرور آئے گی۔ ویسے بھی مجھے ان کھنڈروں کے بارے میں تحقیق کرنے کا کوئی شوق بھی تو نہیں میں تو اپنے کبھتوں میں ساری رات کام میں لگا رہتا ہوں۔ مجھے کیوں جن یا بھوت تنگ کریں گے۔“

اور ہاں کاشف صاحب! اب بھی وہ علاقہ ایسے

آپ کے نام

مالک نوکر سے: ”یہ خط کس بے وقوف

نے لکھا ہے؟“

نوکر: ”جناب آپ کے بیٹے نے۔“

مالک: ”کس بے وقوف کے نام لکھا

ہے؟“

نوکر: ”جناب آپ کے نام پر۔“

(شمالہ حماد۔ سرائے سدھو)

کاشف کہنے لگا: ”چل چھوڑ! تو تو جان ہی نہیں

چھوڑ رہا، خیر اپنی داستان غم سنا۔“

یہ الفاظ کاشف نے ٹوکنے کے انداز میں کہے۔

اور رضوان پھر سوچوں میں گم ہو گیا تو کاشف کہنے لگا: ”

کیوں بھائی آگے جھوٹ نہیں بن رہا جو خاموش ہو گیا۔

رضوان نے کہا: ”نہیں یہ بات نہیں، میں تو

سوچ رہا ہوں کہ بات کہاں چھوڑی تھی۔“

تو کاشف جھٹ سے بولا: ”تو تم نے کہا کہ اس

جن نے کہا کہ ہم قوم جنت سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”ہاں یاد آیا۔“ تو جن نے مزید کہا کہ۔

”اللہ کے فضل و کرم سے ہم مسلمان جن ہیں۔

بالکل ایسے جیسے آپ اللہ کو ایک مانتے ہیں، ویسے ہی ہم

بھی اللہ کو ایک مانتے ہیں اور ہاں ایہ الگ بات ہے کہ

تم انسانوں کی طرح ہماری قوم میں بھی فتنے فساد والے

کچھ قبیلے موجود ہیں جو شیطان کی اور آگ! سورج کی

پوجا کرتے ہیں لیکن ہم الحمد للہ اللہ کی عبادت کرتے

ہیں۔ اور اللہ کی ذات سے ڈرتے بھی ہیں اور یوم

حساب پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اللہ

تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ اور نبی آخر

الزمان ﷺ پر بھی ایمان رکھتے ہیں آپ پر درود ملی

پڑھتے ہیں۔ یہ باتیں میں اس لئے بتا رہا ہوں کہ پھر

سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی آواز بہت

ہی اچھی اور پیاری ہے اس لئے مجبور ہر کرم یہاں ٹھہر

گئے۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ورنہ تو اس اللہ

سے چاہیے جس نے انسانوں کو مٹی سے اور جنوں کو

آگ سے پیدا کیا ہے پھر آپ کو کوئی نقصان نہیں

پہنچا سکتا ہے۔“

جب اس جن نے یہ آخری الفاظ کہے تو عثمان کو

کچھ سکون ملا۔ اور ڈرتے ڈرتے اس جن سے پوچھا کہ

”آپ کا نام کیا ہے؟“

تو اس جن نے جواب دیا: ”میرا نام اسماعیل

ہے اور اللہ کے فضل سے میں نے چارج بھی کئے ہیں

۔ ہم تقریباً دو سو سال سے اس علاقے میں رہ رہے

تو دکھتا، وہ بے چارہ خاموش بت بنا کھڑا رہا اور متلاشی

نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اور پڑھنا بھی

بند کر دیا تھا ڈر کی وجہ سے اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ

کیا کرے۔ اس مصیبت سے تو آج پہلی مرتبہ اس کا

سامنا ہوا تھا، ابھی وہ ڈری ہوئی نظروں سے چاروں

طرف گھور رہا تھا کہ خدا غواستہ اگر کچھ ہو تو نظر آ جائے۔

لیکن وہاں اندھیری رات، سسنان علاقہ اور جنگل کے

علاوہ کچھ دیکھائی نہ دے رہا تھا۔

ابھی وہ خاموشی سے سوچ رہا تھا کہ کیا کرے

اتنے میں آواز آئی جو بالکل سامنے کی طرف سے آئی،

کوئی کہہ رہا تھا کہ ”آپ کی آواز سن کر آئے ہیں بڑی

پیاری آواز ہے آپ کی، بڑا ہی اچھا انداز ہے آپ

کے پڑھنے کا۔“

آواز تو آ رہی تھی لیکن آواز والی ہستی کا دور دور

تک نام و نشان نہ تھا۔ اور عثمان بے چارہ اپنے سامنے

کسی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سوائے اندھیرے

کے اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی آواز والی

ہستی عثمان سے کہہ رہی تھی کہ ”بھائی کیا دیکھنے کی کوشش

کر رہے ہیں آپ کو نظر نہیں آئیں گے کیونکہ ہمارا تعلق

قوم جنت سے ہے۔“

اچھا تو تو اس وقت عثمان کے ساتھ تھا عثمان نے

تجھے خواب میں یہ داستان سنائی ہے، تو تو ایسے بتا رہا ہے

جیسے یہ سارا واقعہ تیرے سامنے ہوا ہو۔“ کاشف جو ابھی

تک رضوان کو تنگ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ یہ بات

کاشف نے رضوان کی بات پوری ہونے کے بعد کی۔

تو رضوان نے کہا: ”نہیں میں ساتھ تو نہ تھا اور

مافی عثمان نے خواب میں مجھے بتایا۔ بلکہ یہ بات تو

سارے گاؤں والوں کے علم میں ہے کہ اس ویران

علاقے میں عثمان کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے تھے

یہ باتیں جن لوگوں نے کی تھیں ان میں کچھ تو بے

چارے مر گئے ہیں اور کچھ اپنی زندگی کی گاڑی کو دھکیل

رہے ہیں۔“

ہی غیر آباد پڑا ہے۔ کسی کو پتا نہیں وہاں کون آباد تھے اور

کب سے وہ علاقہ غیر آباد ہوا کسی کو پتا نہیں! ہاں البتہ

اتنا یہ ضرور ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھے لیکن تھے مسلمان

کیونکہ اس علاقہ میں جو مسجد بھی اس سے تو پہلی لگتا تھا کہ

وہ لوگ تھے مسلمان۔ اور ہاں ایک چھوٹا سا قبرستان بھی

ہے۔ جس میں مشکل سے آٹھ یا دس قبریں آج بھی

موجود زیادہ پتا نہیں وہاں اور کتنی قبریں بھی ایک مرتبہ

میں بھی اس قبرستان کے پاس سے گزرا تھا۔“

”چھوڑو یار تو سننا کیوں مجھے تنگ کرنے کے

چکر میں ہے۔“ کاشف نے رضوان کی بات پوری ہونے

کے بعد بولا۔ اور رضوان پھر شروع ہو گیا۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ عثمان وہاں پر پہرہ دیتا

تھا۔ عثمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ جب بھی اکیلا

ہوتا تو اس کی زبان پر قرآنی آیتوں اور سورتوں کا درود

ضرور ہوتا تھا۔ چاہے دن ہو یا رات لیکن اس کی یہ

عادت کچی تھی اور اسی وجہ سے لوگ اس کی عزت بھی

کرتے تھے۔ شاید اسی لئے وہ اپنے کھیتوں میں سے

زندہ واپس آتا تھا۔

ایک رات حسب معمول وہ اپنے کھیت میں پانی

لگا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کلام پاک کا بلند آواز میں ورد

بھی اس کی زبان پر جاری تھا۔ کہ عثمان کو، اپنے قریب

سے آوازیں آنے لگیں ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے قریب میں

کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں ان کی آوازیں سن

کر عثمان کو تو پسینہ آ گیا کیونکہ آوازیں بالکل قریب سے

آ رہی تھیں اور دیکھنے میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

وہ بھارا ایک تو اکیلا اور دوسری بات یہ کہ جس

کھیت میں وہ پانی لگا رہا تھا اس کے بارے میں وہ اچھی

طرح سے جانتا تھا کہ یہ آسب زدہ علاقہ ہے۔ اس

لئے اس بے چارے کا ڈر نا جائز تھا۔ اور مزے کی بات

یہ تھی کہ رات کا وقت اور وہ بھی اندھیری رات آبادی

سے کافی دور کن اس وقت اس بے چارے کی مدد کرنے

کو آتا۔ سوائے اللہ کے۔

سو وہ بے چارہ لگا ادر ادر دیکھنے۔ لیکن کچھ ہوتا

ہیں۔ ہم جب سے اس علاقے میں آباد ہوئے ہیں یہ علاقہ اسی طرح ویران اور سسنان پڑا ہے۔ حالانکہ ہماری نظر میں یہ علاقہ آباد ہے لیکن انسانوں کی نظر میں یہ علاقہ خوفناک کھنڈرات میں شامل ہے۔ بہر حال ہم جب سے اس علاقے میں آئے یہ علاقہ ویرانی میں ڈوبا ہوا ہے۔

میرے قبیلے والوں کو یہ علاقہ بہت ہی مناسب لگا کیونکہ اس جگہ دو خاص چیزیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے ہم یہاں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ ان دونوں میں سے ایک تو یہ ویرانی تھی۔ یعنی انسانوں کی آبادی کا کافی دور چونکہ ہمیں ویرانوں میں رہنے کا حکم ہے۔ اسی لئے ہی یہاں پر آباد ہو گئے۔ اور دوسری خاص چیز ہماری توجہ کا مرکز بنی۔ وہ بھی یہ سامنے والی مسجد، یہ مسجد پتا نہیں کتنے سالوں سے غیر آباد ویران پڑی تھی۔ ہم نے سوچا کہ چلو خدا کا گھر ہے۔ اس کو ہٹانے والے ختم ہو چکے ہیں۔ یا کہیں اور جا چکے ہیں۔ تو کیوں نہ ہم خدا کے اس گھر کو آباد کریں۔ اور پھر ہم اس مقصد کے لئے یہاں آباد ہو گئے۔ اللہ ہمارے مقصد کو قبول فرمائے۔“

عثمان کی آئین کے ساتھ ان کی آوازیں بھی بلند ہوئیں، یعنی ان جنوں نے جو اسماعیل کے ساتھ تھے

آمین کہا۔

عثمان نے کہا: ”آپ کتنے لوگ اس وقت آئے ہیں۔“

تو اسماعیل نے کہا کہ اس وقت میرے ساتھ میرے قبیلے کے پانچ جن اور موجود ہیں۔ ہم ساتھ والے قبیلے کے پاس سے آرہے ہیں۔ کچھ ضروری مذاکرات کرنے گئے تھے۔ کیونکہ یہ جن ہماری برادری کے جنوں کو تنگ کرتے ہیں۔ اور اس قبیلے کے ساتھ ایک بڑا جادوگر بھی ہے۔ اس لئے ایک سردار ہونے کے ناطے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ اپنے قبیلے کی حفاظت کرنا، اور ہم واپس جا رہے تھے کہ آپ کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی اس لئے ہم رک گئے۔ ہم امن پسند جن ہیں۔ ہمیں جو بھی تنگ کرتا ہے تو پہلے اس کو درگزر کرتے ہیں۔ لیکن جب دیکھتے ہیں کہ تنگ کرنے والا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ تو میں اپنے قبیلے میں سے ایک دو جوان بھیجتا ہوں اور اس کے ساتھ خاص کر یہ تاکید بھی کرتا ہوں کہ کسی کو جانی و مالی نقصان نہ پہنچائیں۔ اور تھوڑا سا ذرا دھکا کر واپس آجائیں۔ تاکہ آئندہ وہ ایسی کوئی حرکت کرنے سے دور رہے۔ لیکن آج تک میرے قبیلے والوں کو آپ کے گاؤں یا آپ کے آس پاس گاؤں والوں سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ ہاں بانی جو قبیلے ہیں۔ ان میں شرانگیز جن موجود ہیں۔ اور سب سے بڑی بات کہ ان کے ساتھ شیطانی طاقت بھی ہوتی ہے۔ ان کا کام ہے کہ اس دنیا میں شیطان کی حکومت ہو۔ اور وہ اسی ارادے سے اس دنیا میں ہی تم انسانوں کی دنیا میں آتے ہیں اور ان کا ارادہ ہوتا ہے کہ اصل دنیا میں ان کی حکومت ہو اور اسی غرور اور تکبر کی وجہ سے وہ اکثر انسانوں کی آبادیوں میں نکل جاتے ہیں اور ان کا ارادہ ہوتا ہے کہ کوئی انسان ان کو تنگ کرے اور وہ اس کو ایسا سبق سکھائیں کہ اس کی آنے والی نصیب تک یاد کریں، اور پھر وہ انسانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے رہتے ہیں۔ اور پریشان کرتے رہتے ہیں۔ جس

میں کبھی تو بے چارے انسان کام میں آجاتے ہیں۔ اور کبھی یہ شیطان چن جاتے ہیں۔ اور وہ بھی انسانوں کی طرح جیسے انسان بے چارے ان شیطانوں سے تنگ آکر ان سے معافی مانگتے ہیں۔ ویسے ہی وہ جن بھی اس عامل سے جس کے یہ قبضے میں ہوتے ہیں۔ اس سے زندگی کی بھیک مانگتے ہیں۔

اور کوئی عامل اس سے قول و اقرار کر کے ان کو آزاد کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر خدنی جن جو غور و کی وجہ سے اس عامل سے معافی نہیں مانگتے وہ تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر دم دوڑ دیتے ہیں۔

اور جی بات یہ ہے کہ مجھے جب یہ علم ہوتا ہے کہ فلاں قبیلے کا جن انسانوں کو تنگ کرتے کرتے اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ تو مجھے ایک قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے لیکن خوشی کے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی رہتا ہے کہ جس عامل نے اس شیطان کو اپنے انجام تک پہنچایا ہے۔ اس شیطان کے دوست یا رشتے داروں میں سے کوئی بھی اس عامل کو یا اس کے خاندان والوں میں سے کسی سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں اس میں کچھ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن بعض کا انجام بہت ہی برا ہوتا ہے۔“

”ارے! چنانچہ میں کیا کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ اسماعیل نے بات پوری کرنے کے بعد یہ جملہ کہا اور عثمان سے کہا: ”آپ اپنا نام تو بتائیں۔“

تو عثمان نے کہا: ”میرا نام محمد عثمان ہے۔ ادھر میرے کھیت ہیں۔ میں روزانہ رات کو اپنے کھیتوں میں سپرہ دیتا ہوں۔ اور کبھی پانی لگاتا ہوں۔ اور میری یہ عادت ہے کہ جب بھی میں اکیلا ہوتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کرتا ہوں۔ میں نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے۔ اور اللہ کے کلام کی برکت سے میرے کھیتوں میں برکت بھی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ میرے کھیت اس خوفناک جنگل میں ہیں۔ لیکن فصلیں تمام اچھی اگتی ہیں۔ یہ سب میرے مالک کے کلام کی وجہ سے ہے۔ میرا اس میں کوئی کمال نہیں ہے، میرا کام

ہے اچھا بیج اور اچھی کھاد زمین میں ڈالنا، باقی کام تو میرے پروردگار کا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خالق کائنات نے کبھی بھی مجھے پاپس نہیں کیا۔ الحمد للہ ہر سال میری فصل اس سارے علاقے یعنی میرے گاؤں والوں کی فصل سے اچھی ہوتی ہے۔ آج بھی میں اپنی فصل کو پانی لگا رہا تھا کہ آپ کی آوازیں کر میں خاموش ہو گیا۔

اسماعیل جن نے عثمان کی بات سن کر بولا: ”عثمان صاحب اگر ناراض نہ ہوں تو ایک عرض کروں۔“ عثمان بے چارہ جو کافی دیر سے ان جنوں کے رحم و کرم پر تھا وہ بے چارہ کیا جواب دیتا۔ وہ کہنے لگا: ”اسماعیل صاحب میں بھلا آپ کی بات سے کیوں ناراض ہوں گا۔“

تو اسماعیل جن نے کہا: ”آپ کے کھیت میں میرے قبیلے کے کچھ جوان پہراویں گئے اور آپ ہمارے بچوں کو قرآن پاک پڑھانا۔ جو بھی ہم سے ہوا ہم آپ کی مدد کریں گے۔ بانی حقیقی معاوضہ تو اللہ ہی دے گا۔“

عثمان نے کہا: ”ٹھیک ہے، میں آپ کو آپ کے بچوں کو قرآن پاک پڑھاؤں گا اور وہ بھی خالص اللہ کی رضا کی خاطر پڑھاؤں گا۔ اور اس کا معاوضہ میں طلب نہیں کروں گا۔ باقی میری شرط ہے۔ اگر آپ میری شرط پر پوری طرح اترتے ہیں تو میں انشاء اللہ تعالیٰ بچوں کو قرآن پڑھاؤں گا۔“

اسماعیل نے کہا: ”ویسے تو اسلام نے شرط پر پابندی لگا دی ہے لیکن آپ بتائیں آپ کی کیا شرط ہے؟“

عثمان نے کہا: ”میری شرط یہ ہے کہ آپ یا آپ کے قبیلے والوں میں سے کوئی بھی میرے سامنے ڈراؤنی شکل میں نہ آئے۔“

اسماعیل نے جواب دیا: ”ٹھیک ہے یہ شکایت نہیں ہوگی ہمیں آپ کی یہ شرط منظور ہے۔ اور اس دن کے بعد عثمان روزانہ رات کو کھنڈروں میں

جنوں کے بچوں کو قرآن شریف پڑھانے جاتا تھا۔ اور یہ بات تو تقریباً ہر کسی کے علم میں ہے اور اسماعیل کے قبیلے کے جن عثمان کے کھیتوں میں سپرہ دیتے تھے اور جن لوگوں نے یہ سپرہ دیکھا ان میں سرفہرست وہ بوڑھا شاکر جو کاشف صاحب تمہارے دادا کا دوست ہے۔“

وہ کہتا ہے کہ ”ایک مرتبہ جب میری عمر مشکل سے سولہ یا سترہ برس کی تھی میں دن کے وقت تقریباً سوا بارہ کا ناٹم تھا۔ عثمان کے کھیتوں میں سے گزرا تو میں نے کچھ گھڑسواروں کو دیکھا جو پورے کھیت کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے کبھی ادھر تو کبھی ادھر پورے کھیت میں چکر لگا رہے تھے۔“

دور ہونے کی وجہ سے ان کے چہروں کو پہچان نہ سکا۔ میں سمجھا کہ کوئی چور یا ڈاکو ہیں جو ان کھنڈروں میں چھپے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ دن کے وقت کھنڈر سے باہر کیا کر رہے ہیں۔ میں چھپتا چھپاتا اس جنگل سے نکلا اور انہی سوچوں میں گمراہ ہوا تھا کہ یہ کون ہیں؟ اور پھر میں نے سوچا کہ یہ تو چچا عثمان کے کھیت کے پاس ہی چکر لگا رہے تھے۔ مجھے چچا عثمان کو ابھی سے بتادینا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ چچا عثمان رات کو کھیتوں میں جا پہنچے اور یہ ڈاکو ان کو مار ڈالیں۔“ اور پھر میرا رخ چچا عثمان کے گھر کی طرف تھا۔ میں دوڑتا ہوا چچا عثمان کے گھر پہنچ گیا۔ دیکھا تو چچا سو رہے تھے۔ میں نے آواز دی۔ ”چچا عثمان۔۔۔۔۔ چچا عثمان۔۔۔۔۔ جلدی جلدی ان کو اٹھانے لگا۔ میں بھاگتا ہوا آیا تھا اس لئے میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ چچا عثمان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور پوچھا: ”شاکر بیٹا! خبر تو ہے۔ تو پریشان کیوں ہے؟“

اور پھر میں نے چچا عثمان کو سارا واقعہ سنا دیا اور آخر میں کہا: ”چچا میرا بیٹا کر کے آج آپ کھیتوں پر نہ جانا کہیں وہ ڈاکو آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ کیونکہ وہ سارے گھوڑوں پر سوار تھے اور وہ آپ کے کھیتوں کے چاروں طرف دن دھاڑے بے خوف و خطر چکر لگا

رہے ہیں۔“

تو چچا عثمان منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے۔ جس کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ..... ”اچھا تو اب یہ دن کو بھی سپرہ دینے لگے ہیں۔“ اور پھر جیسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا اور چچا عثمان یکدم خاموش ہو گئے۔

میں نے پوچھا۔ ”چچا کون سا پیرا؟“
تو چچا جو چٹائیں کس سوچ میں گم تھے۔ چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں نے تم سے کچھ کہا ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں آپ نے کہا کہ اچھا اب یہ دن کو بھی سپرہ دینے لگے ہیں۔ چچا یہ کون سا پیرا ہے۔ جس نے آپ کو اتنا پریشان کر دیا ہے۔“
پہلے تو چچا عثمان ٹال ٹال سے کام لینے لگے۔ لیکن شاکر کہتا ہے کہ ”میرے بار بار اصرار پر چچا عثمان نے ساری بات بتا دی۔ اور آخر میں کہا۔ ”شاکر بیٹا آئندہ تم بھول کر بھی وہاں نہ جانا۔“

تو شاکر نے کہا۔ ”چچا تو میں ساتھ والا گاؤں جو جنگل کی پر پی طرف ہے اس گاؤں کا کام سے گیا تھا اس لئے وہاں ہی پر یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ لیکن اب تو میری باپ کی بھی توبہ جو آئندہ میں آپ کے کھیتوں میں گیا۔ اور شاکر اٹھ کر اپنے گھر چلا آیا۔“

لیکن بقول شاکر کے پھر بھی وہ عثمان کے کھیتوں میں نہ گیا، اور ایک دو دروازے بھی ہیں جن کے ساتھ ایسے عجیب و غریب واقعات پیش آئے، جن میں کچھ تو بے چارے مر گئے اور ایک دزدنہ ہیں۔

کاشف صاحب اگر میری بات کسی بات کا بھی تمہیں اعتبار نہ ہو تو کسی سے بھی پوچھ لیتا۔ اور شاکر کی مثال جو میں نے تمہیں سنائی ہے وہ تو تیرے سامنے ہے۔“

کاشف نے کہا۔ ”کوئی ضرورت نہیں مجھے کسی سے پوچھنے کی اور ہاں جیسا کہ تو کہہ رہا تھا کہ ہمارے آس پاس یہ قوم ریتی ہے تو میں اس قوم سے درخواست

کرتا ہوں کہ کوئی جن یا بھوت یا جینیل آئے اور وہ مجھے اپنی شکل دکھائے تاکہ مجھے بھی یقین ہو جائے کہ اس دنیا میں اس مخلوق کا وجود ہے۔“

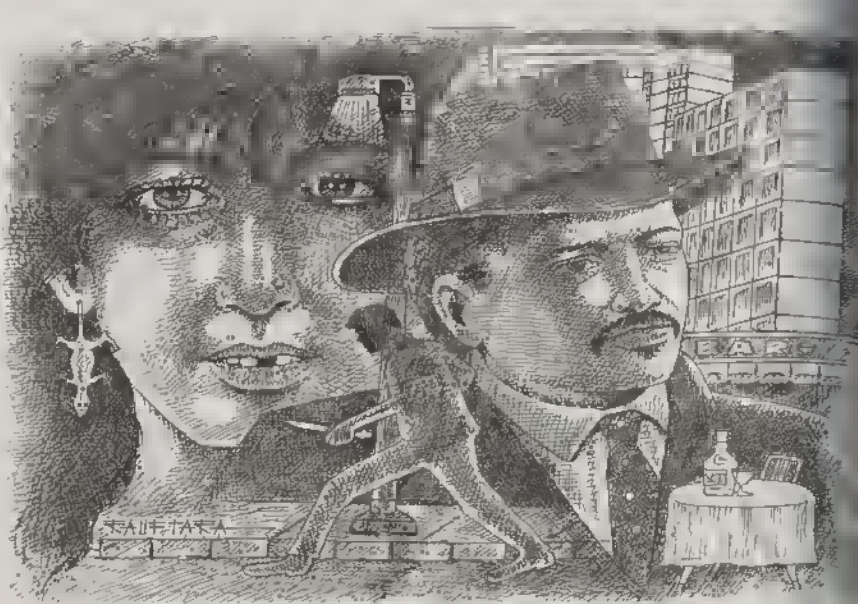
”ضرور! ضرور! اے نوجوان تیری خواہش پوری ہوگی اور میں حاضر خدمت ہوں، میں تیری کیا خدمت کروں؟“ اس آواز نے تینوں کے ہوش اڑا دیئے۔ اور اس آواز کی وجہ سے تینوں خاموش ہو گئے۔ اور لگے لگے دوسرے کا منہ کھٹنے.....

”کاشف اگر ہم اپنی ضد پر آجائیں تو ضرور شکل دکھاتے ہیں۔ اور اب تو تمہاری فرمائش کو مد نظر رکھتے ہوئے میں تمہارے سامنے حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہوں، اور ہاں اگر تم اجازت نہ بھی دو تب بھی میں حاضر ہونے کی بڑی غلطی کروں گا۔ تاکہ تمہیں یقین آجائے۔“ اس آواز نے پھر ایک بار ان تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور اس کا خاص نشانہ کاشف ہی تھا۔ آواز ایک بار پھر آنے لگی۔

کاشف میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ میں نے اپنا نام سنا اور پھر اپنا نام سن کر میں ٹھہر گیا اور تمہیں بتا چلے کہ تمہارے علاوہ بھی اس دنیا میں بہت کچھ ہے۔“
اور ان تینوں کے سامنے ایک ہیولا ظاہر ہونے لگا۔ اس ہیولے نے خوفناک شکل اختیار کر لی اور پھر ان تینوں کے سامنے ایک خوفناک شکل والا جن کھڑا تھا۔ جس کا ٹارگٹ خاص کر کاشف ہی تھا، اور وہ جن کاشف کو کہہ رہا تھا۔

”کاشف یہ حقیقت ہے، اس دنیا میں قوم جنات موجود ہے۔ جس کا جیتا جاگتا ثبوت اس وقت تمہارے سامنے موجود ہے۔ اور ہاں ایک بات اور کہ اسمائیل میرا ہی نام ہے۔“

لیکن کاشف تو اس کی شکل دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ اور آصف رضوان کے ساتھ چپکا بیٹھا تھا اور رضوان مسکرا رہا تھا۔ کیونکہ کاشف کو ثبوت مل چکا تھا۔



ڈیٹھ ہاؤس

احسان سحر-راولپنڈی

اچانک کئی ڈھانچے نمودار ہو گئے اور نوجوان سے مخاطب ہوئے جلد ہی تم بھی ہم سے آن ملو گے ہم تمہیں اپنی دنیا میں خوش آمدید کہیں گے، غم نہ کرو ایسے غم سے کیا فائدہ جس سے تمہاری جان آزاد نہ ہو سکے اور پھر تمہیں.....

خوف و وحشت کے شکار میں جکڑنے والی ایک مادرائی مخلوق کی لرزہ خیز داستان حیرت

یہ ان ایام کا قصہ ہے جب میں جوان تھا اور مرحلت نیوی میں سیل تھا اور ”سی کنگ“ نامی ایک مال بردار جہاز پر کام کرتا تھا جو ایک برطانوی نژاد فلپائنی مسٹر ایف نیگروس کی ملکیت تھا۔ یہ ایک پرانا اور سال خوردہ جہاز تھا جسے اب کبازئیے کے ہاتھ چلنے کی ضرورت تھی، مگر ماسٹر ایف نیگروس اسے اس وقت تک سمندر کے سینے پر بوجھ بنائے رکھنا چاہتا تھا جب تک سمندر خود

تک آ کر اسے غرقاب نہ کر دے، سارا عملہ جہاز کی شستہ حالی اور اس کے آلات کی خرابی پر ٹالناں رہتا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ان حالات میں ہمارا بحری سفر کی معرکے سے کم کیا ہوتا ہوگا۔ ایک بار پھر ہم فلپائن سے مال لے کر واپس جا رہے تھے۔ ہم نے وہاں پہنچنے کے لئے ایک ایسے سمندری راستے کا انتخاب کیا جو عام طور پر ملاحوں میں خاصا غیر مقبول ہے۔ زیادہ تر جہاں فلپائن

سے فنی جانے کے لئے پہلے مشرقی تیمور کا رخ کرتے ہیں وہاں سے بحیرہ کورال سے گزرتے ہوئے فنی کی طرف سفر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم نے فلپائن سے نیوگنی کا رخ کیا تھا اور بحر الکاہل سے گزرتے ہوئے جزائر سلیمان اور وہاں سے فنی کا قصد کیا تھا۔ یہ راستہ نسبتاً مختصر تھا اور اسے منتخب کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارا جہاز لہبا سفر کرنے کا تحمل نہ ہو سکتا تھا۔

مگر تقدیر کے آگے تدبیر کیا معنی رکھتی ہے؟ ہم نے اپنے تئیں کہل اور محفوظ راستہ چنا تھا مگر وہی ہمارے لئے نہایت پرخطر اور ہلاکت خیز ثابت ہوا، ہوا یوں کہ ہمارے سفر کے دوسرے روز شام کے وقت جب ہم جزائر سلیمان کے قریب پہنچنے والے تھے، یکایک پرسکون سمندر کے تیمور بدلنے لگے۔ مشرق کی طرف تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ جن کے اثر سے سمندر کے تلاطم میں خوفناک اضافہ ہو گیا، اور ہمارا جہاز چنگھاڑتی ہوئی موجوں کے تھپڑوں سے کسی کھلونے کی طرح ڈولنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کہاں سے سیاہ مہیب بادلوں کے لشکر اٹھے اور آنا ناپورے آسمان کو ڈھک دیا۔ بادل سطح سمندر پر اس طرح جھک آئے کہ عملاً ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور افق ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اگلے ہی لمحے بادلوں کی گرج اور بجلی کی مہیت۔ ناک کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہ میری بحری زندگی کا سب سے خوفناک طوفان تھا۔ عملے کے باقی افراد بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بار بار توبہ کرتے اور اعتراف کرتے تھے کہ انہوں نے ایسا طوفان اپنی زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ طوفان کی شدت کا اندازہ اس امر سے لگایے کہ چار چار پانچ پانچ منزلہ بلڈنگ کی بلندی کے برابر چنگھاڑتی ہوئی موجیں جہاز کی طرف بڑھ رہی تھیں اور جہاز ان کے تھپڑوں سے پھر کی طرح گھونسنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جہاز اب ڈوبنا کہ تب ڈوبا۔ جہاز کے آلات جو کہ پہلے سے ہی خستہ حالت میں تھے اس طوفان میں جواب

دے گئے۔ ہمیں سمت کا بھی تعین نہ رہا اور ہم سب اپنے اپنے انداز میں خدا سے گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے۔ کیونکہ جہاز کو مشینوں سے کنٹرول کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ پھر ایک بہت بڑا سمندری ریلہ آیا جس نے ہمارے جہاز کو عقبی سمت سے توڑ ڈالا اور پھر الٹا دیا۔ ہم سب اچھل کر دیواروں سے ٹکرائے۔ ہر طرف چیخ و پکار اور شور مچ گیا۔

جہاز اٹلنے سے میز، کرسیاں، اوزار اور آلات اور اسی نوع کی دوسری چیزیں ہمارے اوپر گرنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سمندر کا پانی کینٹینوں میں داخل ہونے لگا۔ ہم سب پتھم ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارتے کینٹینوں سے باہر نکلے۔ لائف بوٹ جہاز کے دونوں طرف بندھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کی کشتیاں تو اب سمندر کے اندر اور جہاز کے نیچے چلی گئی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف کی کشتیاں اوپر کی طرف تھیں جہاں پہنچنا اس طوفانی بارش میں ناممکن تو نہیں مشکل ضرور تھا۔

جہاز آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ عملے کے کئی افراد لاپتہ ہو گئے تھے۔ جو بچ گئے تھے وہ جیسے تیسے کشتیوں تک پہنچے اور پھرے ہوئے سمندر کے سینے میں اتر گئے۔ لیکن جو سمندر اتنے بڑے جہاز کو خاطر میں نہ لا رہا تھا اس کے سامنے ان کشتیوں کی کیا حیثیت تھی۔ بہت سی کشتیاں سمندری لہروں کا ایک تھمیرا نہ سہہ سکیں اور غرق ہو گئیں۔

میں جس کشتی میں سوار ہوا اس میں ہم کل چار آدمی تھے، میں، گواکار بنے والا ایک ادھیڑ عمر ہندو ملاں تلمسی داس، ایک فلپائنی ملاں کو کو بان جت اور جہاز کا فرسٹ سیٹ مسٹر سومانو جو انڈونیشیا کا رہنے والا ایک مسلمان آدمی تھا، ہم سب خاصے تجربہ کار لوگ تھے۔ علاوہ ازیں ہم اس جذبے سے بھی سرشار تھے کہ اس قدر ترقی آفت کے سامنے آسانی سے بھٹیا رہیں ڈالیں گے بلکہ حتی الامکان کوشش کریں گے کہ اپنی مکان جان بچا کر کسی جزیرے تک پہنچ جائیں۔ بحر الکاہل میں اس جگہ لاتعداد جزائر تھے۔ قسمت یاوری کرتی تو کسی ایک

جزیرے تک پہنچا جاسکتا تھا۔ بالخصوص ہم نے سیٹ بیلٹ باندھ لئے اور ربر کی ایک لائف بوٹ میں انتہائی منزلوں کا رخ کیا۔

طوفان کی شدت پہلے سے سواتھی۔ اوپر سے سورج بھی غروب ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہمارے لئے چند گز دور دیکھنا بھی محال ہو گیا۔ لہریں ہماری کشتی کو کسی تینکے کی طرح اپنے جلو میں اوپر نیچے اور دائیں بائیں لے جانے لگی۔ ہم موجوں کے تھپڑے کھاتے بارش اور سمندر کے پانی میں شرابور آنکھیں میچ کر اور ہونٹ میچ کر لہروں کے رحموں و کرم پر منحصر رہے۔

ہم سب کے دل اپنے اپنے خدا کے سامنے گڑگڑانے لگے۔ کو بان جت بدھا کو یاد کر رہا تھا۔ تلمسی داس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی موتی تھی جن کے سامنے وہ نہ جانے کیا کیا بدباد رہا تھا۔ رہے ہم دونوں یعنی میں اور فرسٹ میٹ سومانو، تو مسلمان ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے دعا کر رہے تھے کہ وہ ہمیں اپنے حبیب کے عہدے موت کے منہ سے نکال دے۔

ساری رات ہم مہیب سمندر سے لڑتے رہے۔ حتیٰ کہ سپیدہ مخمر نمودار ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی طوفان کا زور ٹوٹنے لگا۔ بادل غنی منزلوں کا رخ کر رہے تھے اور ہوا میں بھی اب ہم سے آگ بگڑ رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ موجوں کا شور بھی ٹھنڈا پڑ گیا اور سورج طلوع ہونے تک سمندریوں پرسکون ہو گیا جیسے اس نے کبھی طوفان کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا۔ ہم خدا کا شکر بجا لارے تھے جس نے ہمیں ہلاکت سے بچالیا تھا۔ اگرچہ ہم کسی جزیرے پر نہیں پہنچے تھے مگر طوفان ختم ہونے سے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ جلد یا دیر پھر کسی جزیرے پر پہنچ جائیں گے۔ ہماری کشتی کو بخیر انداز پر کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور ہم اس پر اب بھی کئی روز سفر کر سکتے تھے۔ اگر مسئلہ تھا تو صرف یہ تھا کہ ہمارے پاس سامان خورد و نوش نہ ہونے کے برابر تھا۔

افرا تقری میں ہم گوشت، مچھلی اور پھلوں، سبز یوں کے چند ڈبے ہی اٹھا سکے تھے۔ اسی طرح پانی

کی تین چار بوتلیں بھی ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ یہ سامان زیادہ سے زیادہ دو دن نکال سکتا تھا اور.....!!!

ہم ایک دن اور ایک رات مشرق کی طرف کوچ سفر رہے۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہم ایک آدھ دن میں جزائر سلیمان پہنچ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم نہ جانے کدھر نکل گئے۔ حد نظر ہی پانی تھا اور خشکی کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ اوپر سے دھوپ کی تہاڑت، ہمارا برا حال ہو گیا۔

ایک دن اور گزرا تو راتیں پانی ختم ہو گیا۔ کو بان جت کو تھکے اور اسہال شروع ہو گئے۔ خود میں بخار میں پھنسنے لگا۔ ہمارے پاس کوئی دوا نہ تھی۔ بخار تو پھر بھی قابل برداشت تھا مگر کو بان جت کا عارضہ دوا کا مقناضی تھا۔ اسے دوا نہ ملی تو اس کی حالت غیر ہو گئی اور بالآخر شام کے وقت اس نے ہمارے سامنے دم توڑ دیا.....!!!

کو بان جت کی موت نے ہمیں ہراسہ بھی کیا اور افسردہ بھی۔ بھوک سے انٹریاں جل رہی ہوں تو انسان کے ذہن میں عجیب اور اچھوتے خیال آتے ہیں۔ جب میں نے اور مسٹر سومانو نے کو بان جت کی لاش سمندر کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تو تلمسی داس نے ہمیں روکتے ہوئے کہا: ”اس کی موت ہمارے لئے بھگوان کی کرپا ہے۔ اسے جل میں مت ڈالو، ہم اس کا ماس کھائیں گے۔“

”تلمسی داس تو تو ہندو ہے۔ تمہارے دھرم میں ماس کھانا پاپ سمجھا جاتا ہے.....؟“

میں نے حیرت سے کہا۔ اس پر تلمسی داس نے جواب دیا اور ”انسان یا مرادار کا ماس تم مسئلے (مسلمان) بھی نہیں کھاتے ہو، مگر مجبوری میں تمہارے دھرم نے بھی اس کی آگیا دی ہے۔ دیکھو دین دھرم تو زندگی کے ساتھ ہے۔ زندگی ہی نہ رہے تو کیسا دین اور کون سا دھرم میں جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔“ تلمسی داس کی بات میں وزن تھا۔ دوسرے خالی پیٹ کو تو بہانہ چاہیے تھا۔ ہم تینوں اپنے ساتھی کی لاش پر پل پڑے اور اس کے بازو، ہڈی اور رانوں سے گوشت کاٹ کاٹ کر کپا ہی

کھانے لگے۔ پیاس بجھانے کے لئے ہمارے پاس پانی کا کوئی متبادل نہ تھا۔ سمندر کا پانی سخت کھارا تھا جسے پینے سے استریوں میں زخم ہوتا یعنی بات تھی۔ پیاس کی شدت زیادہ مجبور کرتی تو ہم سمندر کے پانی میں کپڑے بھگو کر تھوڑا تھوڑا چوس لیتے اس طرح ہم موت سے لڑتے رہے۔

دو دن مزید گزر گئے۔ کوہان جت کی لاش بیخبر میں بدل گئی مگر ہمیں خشکی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ہم بری طرح مایوس اور مذہحال ہو گئے تھے۔ میری طبیعت سب سے زیادہ خراب تھی۔ مجھے بادی سے بخار چڑھنے لگا تھا جس نے مجھے توڑ کر رکھ دیا میں سوچتا تھا کہ موت کا اگلا نشانہ میں بھی ہوں گا۔ مجھے تو اب اپنے دوسرے ساتھیوں سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ اوجھٹے اوجھٹے اچانک میں چونک پڑا تھا کہ کہیں وہ میرا گلہ کھونٹ کر مجھے ماری نہ دیں۔ کیونکہ اب انہیں خوراک کی ضرورت تھی۔ ویسے تسی داس ہم دونوں سے ڈرتا تھا اور ہم وقت موری کو سامنے رکھ کر پارتھنا کرتا رہتا تھا۔ اسے یہ خدشہ تھا کہ یہ دونوں سبلے اسے ماری نہ ڈالیں۔ اور پھر وہی ہوا۔ دوپہر کے وقت جب ہمارا بھوک سے برا حال تھا اور تسی داس کو زورہ دیر کے لئے آنکھ لگی تھی مسٹر سوارنو نے سرکشی کے لیے میں کہا۔ ”مسٹر احسان خوراک کی عدم موجودگی میں ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ ہم تینوں میں کسی ایک کو بانی دو کے لئے قربانی دینا ہوگی اپنی زندگی کی۔ ہم دونوں جوان ہیں اور تسی داس بوڑھا آدمی ہے۔ اس نے اپنی پوری زندگی گزار لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ قربانی اسے دینی چاہئے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے اور؟“

اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی بات سن کر لرز اٹھا میں نے کہا۔ ”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم لوگ اسے قتل کر دیں۔۔۔؟“

”ہاں کیا حرج ہے۔ ویسے بھی سالہا ہندو ہے۔“

”اب بھی ملے گا ہمیں۔۔۔“

اس نے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجا کر کہا اور پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے آگے بڑھ کر بڑے پھل کا ایک چاقو عین اس کے دل کے مقام پر ٹھونک دیا۔

”آہ“ اور تسی داس کے گلے سے ایک ہڑ بڑائی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ اس کی پچھلی پچھلی ہڈیوں میں دنیا جہاں کی حیرت سٹم آئی اور اس کے منہ سے مرتے مرتے یہ الفاظ ادا ہوئے اور ”تم دونوں نے مجھے مار ڈالا اور آہ کا لکادیوی کا اور تیرا آکر دوش اور“ اور اس کے ساتھ ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی، موری جو غالباً کا لکادیوی کی تھی اس کی گود سے نیچے گری اور اس کے سینے سے اٹنے والے خون سے آلودہ ہونے لگی۔ مگر اس پر زیادہ خون نہ گر سکا کیونکہ سوارنو نے عالم وحشت میں آگے بڑھ کر اس جگہ منہ لگا دیا جہاں سے تازہ خون ابل رہا تھا۔ شاید وہ پاگل ہو گیا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر میرا وجود خوف سے تھر تھرا پٹنے لگا تھا۔ میری بھوک ہوا ہو گئی بلکہ طبیعت متلائے ملکی تھی اور میں نے اس نظارے سے بچنے کے لئے رخ پھیر لیا تھا اور پہلو کے بل لیٹ گیا تھا۔ لیکن میرے کانوں میں سوارنو کے کچر کچر گوشت کھانے کی آوازیں آرہی تھیں جو کچھ بیچ میں مجھے بھی دعوت دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا ”حرا“ تسی داس تھا بوڑھا مگر گوشت اس کا بہت مزیدار ہے جیسے کسی جوان مینڈھے کا ہو۔“

وہ بے خوف تھا مگر میرے دل پر ایک انجانا سا خوف چھا رہا تھا۔ تسی داس کی بددعا کا خوف، اس نے مرتے وقت کا لکادیوی کا قہر نازل ہونے کی ہمیں بددعا دی تھی۔ وہ ایک مسکین و عظیم آدمی تھا اور خاصا آجاری (ویندار) ہندو تھا۔ اس کے ساتھ کئی سال سے ایشیہ رینے کی بدولت مجھے معلوم تھا کہ وہ پراسرار علوم سے شفقت رکھتا ہے اور کئی خلیقوں کا مالک ہے۔ ٹھیک ہے وہ شیطانی خلقتیں تھیں مگر ہم جیسوں کو کھانے لگانے کے لئے وہ پوری طرح کارگر ہو سکتی تھیں۔ ہم اسے ویندار اور اچھے لوگ نہ تھے اور نہ اچھے مسلمان کہ رحمانی

تو تیس ہمیں ان شیطانی قوتوں سے بچانے کے لئے میدان میں اتریں اور کچھ دیر گزری تھی کہ میرے اندر کا خوف حقیقت بننا دکھائی دینے لگا۔ ہوا یوں کہ دورا فاق پر کچھ ایسے آثار نظر آتے جیسے چھوٹے چھوٹے جزیروں کا مجموعہ ہو۔ میں نے خوشی سے مغلوب آواز میں مسٹر سوارنو کو اس طرف متوجہ کیا تو وہ بھی اچھل پڑا۔ ہم نے جلدی جلدی کشتی کو اس طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ مگر جب آدھے گھنٹے کے بعد اس جگہ پہنچے تو جو کچھ ہم نے دیکھا اسے دیکھ کر حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

جسے ہم جزیروں کا مجموعہ سمجھ رہے تھے وہ دراصل سمندر کے اندر سے ابھر کر باہر نکلتی ہوئی پتھری درختوں سیڑھیاں تھیں جن کے آخری سروں پر انسانی کھوپڑی کی شکل کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ سیڑھیاں سمندر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باہر ابھری ہوئی تھیں اور ہر کھوپڑی نما کمرے کے دروازے میں ایک انسانی ہویہ نظر آ رہا تھا۔

ایک ایک سیڑھیوں اور کھوپڑی نما کمروں کے مجموعے کے عقب سے ایک حسین نسوانی چہرہ کچھ ایسے نمودار ہوا جیسے سینما کی بڑی اسکرین پر کسی ماڈل کی بڑی سی کلپ تصویر نظر آتی ہے۔ اس کے خوب صورت بالوں نے اس کا آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ابھی میرا ذہن اس نسوانی چہرے کی دلکشی کے سحر سے آزاد نہیں ہوا تھا کہ میری نگاہ اس کے ہاتھ پر پڑی اور میں خوف سے لرز اٹھا۔ اس خوب صورت عورت کے ہاتھ میں انسانی بازو کی ایک بڑی مٹی جس کے ساتھ لگے ہوئے گوشت کو اس نے کھالیا تھا۔ جو مٹی کھوپڑی نما کمروں کے دروازے میں کھڑے ان انسانی بیولوں کو اس عورت کے نمودار ہونے کا احساس ہوا وہ یکدم ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور ہم آواز ہو کر کہنے لگے۔

”کا لکا تو مہان ہے۔ ساگر تیرا استھان ہے۔ جس پہ تیرا آکر دوش ہے۔ وہ کہار بھٹے دان ہے، جو مٹی ان کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے اس حسین عورت نے

عالمی ریکارڈ

پاکستان سے سیریز ہارنے کے بعد دھونی صاحب کو بخار ہو گیا۔

ڈاکٹر نے نمبر پچر چیک کیا تو خاصا حیران ہوا اور کہا۔

”آپ کا نمبر پچر تو 105 درجے تک پہنچ چکا ہے۔“

دھونی نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! کیا یہ عالمی ریکارڈ ہے؟“

(رانا محمد ہاشم نون۔ کراچی)

جو کا لکادیوی تھی۔ غضبناک نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔ ایک کوندا سا لپکا اور ہماری کشتی میں آگ بجڑک اٹھی اور ہم دونوں شعلوں میں گھر گئے۔ ہم سمندر میں چھلانگ نہ لگاتے تو بل کر بھسم ہو جاتے۔ ارے احسان بھائی یہ کیا حقیقت نازل ہو گئی ہے۔“

مسٹر سوارنو نے خوف سے لرزے ہوئے کہا اور ڈوبنے سے بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ”یہ سب تسی داس کی بدعا کا اثر ہے۔ اب تو اس کی دیوی کا غضب بھگتنا پڑے گا۔“ میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

اب ہم دونوں کھلے سمندر میں تیر رہے تھے اور ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا نہ ان سیڑھیوں کی طرف لپکیں جو سمندر سے ابھری ہوئی تھیں۔ ان کے سروں پر بنے ہوئے کھوپڑی نما کمروں میں ابھی تک وہ انسانی ہویے کھڑے تھے۔ جنہوں نے کا لکا دیوی کی مداح سرائی کی تھی۔ البتہ کا لکا دیوی خود غائب تھی۔ ہم دونوں جیسے تیسے ان سیڑھیوں تک پہنچ گئے اور پہلی سیڑھی پر بیٹھ کر سانس استوار کرنے لگے۔

ہم دونوں نے علیحدہ علیحدہ سیڑھی کا انتخاب کیا تھا۔ اسی لمحے ہماری نگاہیں سمندر کی موجوں پر پڑی تو یہ دیکھ کر ہماری سنی گم ہو گئی کہ سیڑھیوں کے ارد گرد کئی

عجب ہو گیا۔
”سنو..... سنو اور خدا کے لئے میری بات سنو۔
یقین کر د میں بے قصور ہوں۔ کالکا کے پجاری تلسی واس
کو میں نے نہیں مسٹر سارا مانو نے قتل کیا تھا۔ مجھے ناکر وہ
گناہ کی سزا نہ دو۔“
میں نے چیخنے ہوئے کہا۔ مگر میری التجا میں صدا
انرا ثابت ہو گئی۔ ”میر کر دوسر۔۔۔“ کئی ڈھانچے
سر رانی ہوئی آواز میں سرگوشتیاں کرنے لگے۔
”جلد ہی تم ہم سے آن ملو گے ہم تمہیں اپنی دنیا
میں خوش آمدید کہیں گے غم کیسا۔“ اور پھر وہ کبھی
اور بھی نہیں لگے۔
شام تک میں اس کال کو فونی میں زنجیر سے بندھا
آسو بہا تا رہا۔ موت مجھے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اپنی گناہ
آلود زندگی کسی فلم کی طرح میرے پردہ ذہن پر متحرک تھی
اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں مر گیا تو میری پیشکش ہرگز نہ
وگی۔ میں گزر آتے ہوئے خدا سے اسے گناہوں کی
معافی مانگنے لگا اور پھر کسی لمحے میری آنکھ لگ گئی۔
عالم خواب میں، میں نے ایک بار لیش بزرگ کو

دیکھا۔ بزرگ نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سبز عمامہ تھا اور ہاتھ میں تسبیح۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”احسان بیٹا تم نماز نہیں پڑھتے تھے اور گناہ آلود زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے تم پر یہ مصیبت نازل ہوئی۔ یاد رکھنا جو انسان نماز کی پابندی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لیتے ہیں۔ مگر جو اپنے نماز کو

وہاں جا کر مجھے پتہ چلا کہ وہ جزیرہ مارشل ہے جو جزائر سلیمان سے شمال کی طرف چھ سات کلومیٹر دور ہے۔ وہاں میں نے کوئٹہ گاڑ کے دفتر میں جا کر ڈیوٹی آفیسر کو رپورٹ کی اور سارا ماجرا سنایا تو اسے یقین ہی نہ آیا۔ بہر حال بعد ازاں اس نے مجھے ایک بحری جہاز پر فلپائن واپس بھجوا دیا۔

چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی ذمہ داری سے بری ہو جاتے ہیں۔“

میں نے روتے ہوئے کہا: ”یا اللہ پاک سے دعا کریں کہ وہ مجھے اس بار معاف کر دے اور اس موت کے گھر سے بچا کر نئی زندگی دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ نیک انسان بنوں گا اور ہمیشہ بچکانہ نماز ادا کروں گا۔“

بزرگ نے کہا: ”اچھی بات ہے میں بھی دعا کرتا ہوں

اب اس واقعے کو عرصہ بیت گیا ہے اور میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں مگر جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرے روتے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہاں اس روز سے آج تک میں باقاعدگی سے نماز ادا کرتا ہوں۔ اپنی اولاد کو بھی میں نے ہمیشہ یہ نصیحت کی کہ بے کردہ نماز بچکانہ کی پابندی کریں کیونکہ شیطان تو تیسرا انہی لوگوں پر غلبہ پالتی ہیں جو بے نمازی اور گناہگار ہوتے ہیں۔“



خونخوار شاد مارک چھپایا نمودار ہو گئیں۔ ہم دونوں بدحواس ہو کر کئی سیڑیاں اوپر چڑھ گئے۔ لیکن اوپر بھی کچا جاتے وہاں ڈراکٹے انسانی ہونے کھوپڑی نما کمروں کے دروازوں میں کھڑے نہیں نکھڑ رہے تھے۔

”آؤ..... آؤ موت کے زینے پر چڑھ کر آؤ، ہم تمہارے خطرہ ہیں۔“ ڈراؤ نے ہولے بھیاں ک انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کورس میں گانے لگے۔
”یا اللہ رحم۔“ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔
”اوپر آؤ۔“ اب اس بیولے نے حکم آ میز لچہ میں کہا جو میرے والی زینے کی آخری سیڑھی پر کھڑا تھا۔ میں نے سہم کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سندر کی طرف جہاں ایک بڑی سی شارک جھلی بار بار منہ کھول کر میری طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نہ جانے دفن نہ باتے مانند والی کیفیت تھی میری۔

دیکھو اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو میں تمہیں سندر میں دھکا دے دوں گا۔" نبیؐ نے مجھے دھکایا۔ اس کی آواز میں ایسی سفاکی تھی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ حکم عدولی کی صورت میں اپنی کہی ہوئی بات پر فوراً عمل کرے گا اور چنانچہ میں چار و ناچار آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ میں نے اس وقت مشرور مانو کی طرف دیکھا تو ابھی میری طرح اوپر چڑھ رہا تھا۔ غالباً اسے بھی یہی دھمکی دی تھی۔

میں اس بیولے کے مقابل پہنچا تو ڈر کے مارے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایک بیولہ ہی تھا اور اس کی شکل واضح نہیں تھی مگر اپنے سامنے ایک غیر انسانی مخلوق دیکھ کر خوفزدہ ہونا فطری امر ہے۔ میں جو بھی اس کے قریب پہنچا بیولے نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا اور حکم دیا کہ ”چلو اندر اور موت کے گھر میں۔“

مجھے اندر جانے میں قدرے تامل ہوا تو اس نے عقب سے مجھے دکھا دیا اور اس میں اس کو کھڑی نما اندھیرے کمرے کے وسط میں منہ کے بل جاگرا۔

جب میں سنبھلا اور آنکھیں اندھیرے میں

دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بہاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے

ٹائیگر نے سوچا کہ الزام تو راگھی پر ہے اور سب انسپکٹر کو اس پر شک ہے اور پھر سرودھ مال جس کے پاس سے برآمد ہوگا وہ چور اور مجرم ہوگا۔ سب انسپکٹر جانتا ہے کہ وہ پرائیویٹ سرائے رساں ہے لہذا اس پر شک اور تعاون کا الزام نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ بے فکر سا ہو گیا۔

”انسپکٹر رام دیال.....؟“ وہ بولی تو اس کی آواز پوری طرح قابو میں تھی۔ ”آپ نے مجھ پر برا گھٹایا الزام لگایا ہے۔“

”مس راگھی ایک دولت مند خاتون ہیں۔ ان کے پاس زیورات کی کوئی کمی نہیں..... ایسے دس بارہوں گے۔ وہ کسی کا ہار کیوں چرانے لگیں.....؟“ ٹائیگر نے اس کی حمایت میں کہا۔

”تو پھر..... یہ رتن کمار سے کیوں ملیں.....؟“ سب انسپکٹر نے راگھی کو گہری اور مشکوک بھری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ وضاحت میں کئے دیجی ہوں۔“ راگھی نے پرسکون لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”کہتے ہیں کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے..... میں کچھ روز پہلے ایک تقریب میں رتن کمار سے ملی تھی لیکن میں نے اس کے کاروباری معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ حالانکہ اس نے مجھے اپنے کاروبار

میں پھانسنے کی بہت کوشش کی۔ میں کوئی بچی تو تھی نہیں کہ جو ان معاملات کی تہہ میں نہیں پہنچتی۔ کیوں کہ مجھے نظر آ گیا تھا کہ اس کی ذریعہ آمدنی جائز نہیں..... گورکھ دھندا ہے۔ میں جب دشواری میں پھنسی تو اس نے مجھے مخلصانہ مدد کی پیش کش کی۔ اس لئے اس نے آج رات مجھے سلور بار میں ملنے کے لئے کہا۔ وہ مجھے کچھ بتانا اور مشورہ دینا چاہتا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”اور اس نے تمہیں کیا بتایا؟“

”بہی کہ اب مجھے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اس نے ان بد معاشوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ جو تنگ اور ہراساں کر رہے تھے۔“

”یہ تو رتن کمار نے آپ پر بڑی مہربانی کی..... لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کبھی کبھی پر بے سبب اور بے غرض مہربان نہیں ہوتا۔“

ٹائیگر جانتا تھا کہ انسپکٹر چون کہ بڑا گھاگ اور تجربہ کار ہے اور روز نجانے اس کا کتنے بد معاشوں اور مشکوں سے واسطہ پڑتا تھا اس لئے اس نے تاڑ لیا تھا کہ راگھی جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ اس سلسلے میں راگھی کے لئے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے پاس ثبوت کوئی نہیں تھا۔ اس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ چنانچہ سب انسپکٹر نے اپنا

آخری پتا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے راکھی کا بیک اٹھایا۔

”مگر یہ سب کچھ درست ہے تو مس راکھی.....! تو میرے خیال میں آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ میں اس بیک کو ایک نظر دیکھ لوں.....! اجازت.....“ اس نے بیک کو تھپ تھپایا۔

راکھی کا چہرہ بے لہو ہو گیا اور ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ہچکچاتی تو ٹائیگر نے فوراً ہی مداخلت کی۔

”اسپیکٹر رام دیال.....! یہ زیادتی ہے۔ آپ کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“

”انکار کی صورت میں انہیں ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا اور یوں ان کی ٹرین نکل جائے گی۔“

ٹائیگر نے راکھی کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلادیا اور اس نے کہا۔

”تمہارے ہاتھ صاف ہیں اور تم نے کوئی واردات نہیں کی اور تم چور نہیں ہو تو چالی اسپیکٹر کو دے دو اور پھر تمہارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ یہی دانش مندی کا تقاضا ہے۔ ضد نہ کرو۔“

راکھی نے میکا کی انداز میں ٹائیگر کی ہدایت پر عمل کیا۔

اسپیکٹر نے ماہرانہ انداز میں بیک کی تلاشی لی۔ بیک میں دو جوڑے نسوانی ملبوسات اور استعمال کی دیگر چیزوں کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹائیگر راکھی کی طرف بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اسپیکٹر کے ہاتھوں پر بھی ہوئی تھیں۔ بظاہر وہ بے تعلق نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسپیکٹر کی تلاشی مکمل ہوتے ہی وہ اپنی حیرت چھپانہ سکی۔

اسپیکٹر کو مطلوبہ چیزیں ملی تھیں۔

راکھی پر بتایا کہ وہ کس لئے راکھی کی تلاشی لیتا جاتا ہے۔ راکھی اس کے ہمراہ ایک ملحق کمرے میں چلی گئی۔ ٹھوڑی دیر بعد آئی۔ مسز رتنا دیوی بولی۔

”سر.....! ہار تو دور کی بات ہے۔ انگوٹھی تک نہیں ملی۔“

راکھی جس طرح پر اعتماد گئی تھی اس طرح واپس بھی آ گئی۔ سب اسپیکٹر پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے اپنی جیکٹ نکال کر کرسی پر ڈال دی۔ اسپیکٹر نے جیکٹ اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ ٹائیگر نے اپنے ہاتھ اور پیر اٹھا کر رکھے تھے۔

”آپ اچھی طرح سے میری تلاشی لیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”آپ کے بشرے سے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ اب بھی پوری طرح مطمئن نہیں نظر آ رہے ہیں؟“

اسپیکٹر نے دوبارہ اس کی سرسری طور پر تلاشی لی اور پھر غرایا۔ ”تم جاسکتی ہو۔ تمہارا پتا میرے پاس موجود ہے۔ ضرورت پڑی تو پھر تم سے رابطہ کریں گے۔“

”بڑی خوشی سے.....“ وہ بولی۔ ”تم بیگنور پولیس سے رابطہ کر کے گھر پر چھاپہ بھی مار سکتے ہو۔“

سب اسپیکٹر رام دیال منہ بناتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اور ٹائیگر بیک میں سامان قریب سے رکھنے میں راکھی کی مدد کرنے لگا۔

راکھی نے بیک مقفل کرنے سے پہلے اس میں سے ایک چھوٹا سا نکالا۔ پھر وہ باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے ڈسٹ بن میں سے اپنے اخبارات کا رول نکالا اور جیکٹ کی اندرونی جیب میں ٹھوس دیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ دونوں پلیٹ فارم پر چلے آئے جس پر کے کے انیکسپریس روٹنگی کے لئے تیار تھی۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کہوں.....!“ راکھی عجیب سی کش کش کے سبھ میں بولی۔

”تم نے اس کا کیا کیا.....؟“

”کس کا.....؟“

”میروں کے ہانکا؟“

”وہ تو میں نے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔“

”کیا کہہ رہے ہو۔“ راکھی کو ایسا لگا جیسے اس کی سانس رک جائے گی۔

”اب تم سکون سے گھر جاؤ اور اچھی بچی بن کر رہو۔ اب تمہیں اس ہار کی فکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں..... میں یہاں کے معاملات سنبھال لوں گا۔ تم پر کوئی آج اور مصیبت نہیں آئے گی۔“ ٹائیگر نے جیسے دلاسا دیا۔

”تم کیا کرو گے اس کا.....“

”میں اس کی مالکہ کو واپس کر دوں گا۔ شام کے اخبارات اور ریڈیو کی مقامی خبروں میں اس کا اتنا پتا بتانے والوں کو دس فیصد کے انعام کا اعلان کیا گیا..... میں اسے تمہاری خدمات کا معاملہ سمجھ لوں گا۔“

ٹائیگر کو ایسا لگا کہ راکھی پر ہسٹریا کا دوزہ پڑنے والا ہے۔

”تم..... تم..... انتہائی ذلیل..... بچہ اور گھٹیا آدمی ہو.....“ کہتے تم نے مجھے ذلیل کر اس کیا..... اگر.....

جیل کے راستے پر ہوتی۔ اب اس سے ہی کوئی سبق لے لو..... گھر جاؤ راکھی.....! اچھی بننے کی کوشش کرو..... تم میں ایک اچھی عورت بننے کی خوبیاں ہیں۔“

ای وقت ٹرین چل پڑی۔ ٹائیگر نے اسے کارڈ دور میں دھکیلا اور خود ٹرین سے اتر گیا۔ ”میرا یہ احسان ہمیشہ ماننا.....“

اس نے جج کر کہا۔ ”لیکن میرا خیال.....!“

ٹائیگر کا خیال تھا کہ قطعی ٹرین کے شور میں وہ اس کی آواز سن نہ سکی ہوگی۔

ٹائیگر اس خیال سے کینٹین میں بیٹھا ہوا کہ وہ کسی قریبی اسٹیشن پر زنجیر کھینچ کر اتر جائے اور لوکل ٹرین سے آجائے۔ کیوں کہ دس بیس ہزار کی مالیت کے ہار کی بات نہ تھی..... پورے پچاس لاکھ کی مالیت کا تھا۔ آج جو سونے اور زیورات کا بھاؤ چل رہا تھا وہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق تراسی لاکھ کا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے حصول کے لئے مہربان ہو کر پانے کی کوشش بھی کر سکتی تھی..... اگر وہ اس انداز سے سوچ رہی ہوگی تو یہ اس کی بھول تھی۔ بلاشبہ وہ تو یہ ممکن تھی۔ دن بھر کے شاید فنی فنی کی پازنٹز پر کی ہوگی۔

وہ ایک گھنٹہ بیٹھا رہا۔ تین اوکل ٹرینیں آئی تھیں اس میں راکھی نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھ گئی ہوگی کہ میں اس کے ہاتھ آئے سے رہا۔ اب اسے واپس جا کر تلاش کرنا لا حاصل ہے۔ صبر کر کے گھر میں بیٹھ جائے۔

ٹائیگر نے سوچا اس اداکارہ اور سابق ملکہ حسن نے اس ہار کی بازیابی کا انعام دس فیصد دینے کا اعلان کیا ہے..... دس فیصد یعنی پانچ لاکھ روپے نقد..... مفت ہاتھ آئیں تو بڑے کیا ہیں؟ یوں بھی یہ ایک بڑی رقم ہے۔ اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے گی۔ یہ انعام اس کی تدبیر اور ذہانت کا ہے..... اور پھر اس قیمتی ہار کا پاس رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ جتنا جلد ہو سکے یہ بوجھ سر سے اتار بیچنا چاہئے۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ٹائیگر ملکہ حسن کی کوٹھی کی اطلاع گھنٹی بج رہا تھا۔ گیٹ دربان نے کھولا۔ اس نے

اطلاع گھنٹی بج رہا تھا۔ گیٹ دربان نے کھولا۔ اس نے

”آپ نے بتایا نہیں کہ یہ ہار کہاں سے ملا ہے۔۔۔۔۔؟ کس کے پاس تھا۔۔۔۔۔ کیا رتن کمار نے چرایا تھا یا راکھی نے۔۔۔۔۔؟“

”آئی ایم ساری۔۔۔۔۔ وہ راستہ پر آگئی تھی۔ آپ سے مخاطب کرنے لگی۔

”میں نے کہا تا کہ آم کھانے سے مطلب رکھیں۔۔۔۔۔ کسی کو تلپانے کی ضرورت نہیں ہار کہاں سے ملا۔۔۔۔۔؟ ورنہ قانونی مجسٹوں میں پھنس جائیں گی۔ کیوں کہ اس کی رسید بھی آپ کے پاس نہیں ہے۔۔۔۔۔ انکم ٹیکس والے بھی رسید طلب کریں گے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”آپ جیسا کہتے ہیں دیا بھی کروں گی۔“

تھوڑی دیر بعد اس کی سیکریٹری آئی تو اس کے ساتھ پولیس بھی تھی۔ ٹائیگر نے اس کی سیکریٹری مانی کو پہچان لیا۔ مانی بھی بڑی مشہور اور مقبول اور بدنام زمانہ ہیر وڈن اور کال گرل تھی۔ بڑی حسین تھی۔ اب پچاس برس کی ہوگئی تھی۔ وہ ساہوکاروں اور سربایہ داروں سے ملکہ حسن کے کافی راتوں کے سودے کرتی تھی۔

پولیس جو آئی تھی اس کے ساتھ سب انسپکٹر رام دیال تھا۔ اس نے ٹائیگر کو حیرت سے دیکھا۔ ملکہ حسن ہندیانی لہجہ میں بولی۔

”انسپکٹر۔۔۔۔۔ یہی چور ہے۔۔۔۔۔ اس نے رتن کمار کے ساتھ مل کر پارٹی میں میرا ہار چرایا تھا۔ اندھرا کر کے۔۔۔۔۔ اس کی تلاشی لیں۔ اس کے پاس میرا ہار ہے۔“

”میں انہیں جانتا ہوں۔“ سب انسپکٹر رام دیال نے کہا۔ ”آپ مسٹر دیو کمار ہیں۔ پرائیویٹ سرائے رساں۔۔۔۔۔ آپ نے مجھے اس روز کے مہمانوں کی جو فہرست دی تھی اس میں ان کا نام نہیں تھا۔۔۔۔۔ ان کا رتن کمار سے دور کا تعلق بھی نہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔۔۔“ ملکہ حسن نے ٹکرائی۔ ”یہ میرا ہار مجھے تیس لاکھ میں بیچنے لایا ہے۔ آپ تلاشی لے کر دیکھ لیں۔۔۔۔۔ اس کی جیب میں ہار رکھا ہوا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رام دیال نے حیرت سے کہا۔ ”مسٹر دیو کمار کیا صحیح کہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔؟“

”جھوٹ۔۔۔۔۔ میرے پاس ہار کہاں سے آسکتا ہے۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔

”پھر تم یہاں آئے کس لئے۔۔۔۔۔ کیا میری عقل دیکھنے۔۔۔۔۔؟“ ملکہ حسن پھکاری۔

”میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ اگر میں نے ہار کا پچ چلا لیا اور ہر آد کر لیا تو کیا مجھے بھی دس فیصد کمیشن مل سکا ہے؟“ ٹائیگر بولا۔

”یہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا ہے۔ اس کا بارہ چڑھ گیا۔“ آپ اس کی تلاشی کیوں نہیں لے رہے ہیں؟“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ میں تلاشی دیئے دیتا ہوں۔“

ٹائیگر نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار کر صوفے پر ڈال دیئے۔ اب وہ صرف اندر ویر میں تھا۔ اس نے ملکہ حسن سے کہا۔

”شریستی جی۔۔۔۔۔! کہیں تو اندر ویر بھی اتار دوں۔۔۔۔۔“

ملکہ حسن کی سیکریٹری مانی براہم ہو کر بولی۔

پھر وہ رام دیال سے گرم جوشی سے معاوضہ کر کے بھرا آیا۔ پھر اس نے دربان کو کٹھری کے پاس بھیج کر کہا۔

”میرے اخبار کارول تو دے دو کپور بابا۔۔۔۔۔!“

دربان نے میز پر رکھا ہوا اخبار کارول اٹھا کر اسے دے دیا۔ وہ شکر یاد ادا کر کے چلا آیا۔

ٹائیگر رات سوئے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو اسے اپنی قسمت کی خوش نصیبی پر یقین نہیں آیا۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ الماس کا ہار اس کی دولت میں اضافہ کر دے گا۔ وہ تو بڑی نیک نیتی سے ہار اوڑھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا اس نے ملکہ حسن کو بہت بڑی چوٹ دے دی تھی۔۔۔۔۔ ٹکرائے نعمت تھی۔ وہ ٹھکرانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ ہار ملکہ حسن کے باپ کا نہیں تھا بلکہ اس کی کافی رات کا معاوضہ تھا۔ پھر اس نے اس ہار کو بیچنے میں دیر نہیں کی۔ سندھی

باریکٹ میں گولڈن جیولری شاپ کا مالک چوری کا مال خریدتا تھا۔ مول تول کے بعد اس نے اسی لاکھ کی رقم ادا کر دی۔ جب کہ ٹائیگر کے ایک اندازے کے مطابق اس کی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ تھی۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر بنگلور جا رہا تھا۔ اسے ہندوستان کے تمام شہروں میں بنگلور سب سے زیادہ پسند اس لئے تھا کہ اس جیسا خوب صورت شہر کوئی اور نہ تھا۔ آب و ہوا معتدل تھی۔ جون اور جولائی میں رات کو کبل اوڑھ کر سونا پڑتا تھا۔ اس نے وہاں ایک مکان خرید کر رکھا تھا۔ اس کی ڈپٹی کیٹ چابی پڑوس میں جو برکت اللہ صاحب رجتے تھے ان کے پاس ہوتی تھی تا کہ صاف صفائی کر سکیں۔

لئے وہ پلٹ فارم کی چمپل پہل سے محفوظ ہو رہا تھا۔ دقت گزاری کے لئے اس کے پاس کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔

کچھ دیر بعد ایک جوان جوڑا لوگی میں داخل ہوا اور ٹائیگر کی سامنے والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ انہوں نے قلی کی ٹٹھی گرم کر کے ٹکٹ حاصل کئے تھے۔ ٹائیگر کو اس بات کا

اندازہ ان کی بات چیت سے ہوا تھا۔ لڑکی سیاہ رنگ کے برقع میں تھی۔ اس نے ہاتھوں میں سیاہ دستان پہن رکھے تھے اور اس کے موزے اور سینڈل بھی سیاہ تھے۔ نقاب میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ چوں کہ وہ برقعے میں ملبوس تھی اور ہاتھوں میں دستان کے باعث ٹائیگر اس کی عمر کا اندازہ نہیں کر سکا تھا۔

ٹائیگر نے لمحہ بھر کے لئے سوچا کہ وہ کب تک برقعے میں اس طرح ملبوس رہے گی۔ اس جوڑے کو رخصت کرنے کوئی نہیں آیا تھا۔ ٹائیگر نے ان کے سامان کا جائزہ لیا۔ ان کے پاس صرف ایک اٹیچی، دستی بیک اور بریف کیس تھے۔ ایک پلاسٹک باسکٹ بھی جس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لے سفر پر جا رہے ہیں۔ یہ بوکی صرف مخصوص تھی لمبے سفر والوں کے لئے۔

جب گاڑی چل پڑی اور اس نے بیس منٹ کی مسافت طے کر لی تب اس لڑکی نے برقع اتارا اور بڑے سلیقے سے تہہ کر کے دستی بیک میں رکھ دیا۔ ٹائیگر کو حیرت ہوئی۔ وہ بیٹھنے کے بعد بھی برقع اتار سکتی تھی یا گاڑی کے روانہ ہوتے ہی۔۔۔۔۔ بیس منٹ بعد اتارنا یا سراسر اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تب اس نے اس جوان جوڑے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا اور اس کے سامنے والی سیٹ پر بٹھے۔ گو کہ یہ جوان جوڑا تو تھا۔ لیکن کچھ بے جوڑا تھا۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے معاشرے میں یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ آئے دن بے جوڑ شادیاں ہوتی رہتی تھیں اور ایسے بہت سارے جوڑے سرعام نظر آتے تھے۔ اسے نہ صرف حیرت بلکہ دکھ بھی ہوتا تھا۔ پھر وہ یہ سوچتا تھا کہ بنائے والے نے ان کا جوڑ کسی مصلحت کے تحت بنایا

ہے۔ جوڑے تو آسمان پر ہی بنے ہیں۔۔۔۔۔ ایسی نا اہلیوں میں ایک جانب گھروالوں کی پسماندگی ہوتی ہے تو دوسری طرف کچھ ایسی مجبوریاں ہوتی ہیں کہ آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ ایک ازدواجی زندگی کا طویل سفر طے کرنا پڑتا ہے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا ہے۔

اسے درحقیقت اس بے جوڑ جوڑے کی شادی کا پس منظر کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ اسے لڑکے پر نہ جانے کیوں بے حد حسرت آیا اور دکھ سا محسوس ہوا۔ ایسا لگا کہ وہ کسی مجبوری کے باعث قربانی کی بیضیت چڑھ گیا ہے اس کی اس لڑکی سے شادی میں اس کی مرضی اور پسند کا دخل کسی صورت اسے محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

لڑکے کی عمر تیس سال تھی اس کا تیس برس یا اس سے ایک دو برس زیادہ ہوگی۔ لیکن وہ زیادہ عمر کا کسی بھی لحاظ سے معلوم نہیں دیتا تھا۔ وہ نہ صرف خوب رو بلکہ ایسا وجہہ جوان تھا جو ہزاروں میں ایک دکھائی دیتے ہیں۔ درواز

قامت نے اس کی وجاہت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اس جوان لڑکے کی بیوی کی عمر ٹائیکر کے ایک اندازے کے مطابق پچیس چھبیس برس ہوگی۔ اس کے چہرے پر اور متناسب جسم اور درمیانہ قد کی وجہ سے اس کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ ویسے اس کے اندازے غلط ہی ثابت ہوتے تھے۔ لڑکی کی رنگت گہری سائولی تھی۔۔۔۔۔ اس کی بڑی بڑی بے حد سیاہ آنکھیں روشن اور چمکیں سی تھیں لیکن چہرے کے نقش و نگار میں ٹیکھا پن یا ایسی کوئی جاؤ بیت بھی نہیں تھی جو دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

ایک بات جو ٹائیکر کو بہت عجیب اور پراسرار سی لگی تھی۔ وہ یہ کہ اسٹیشن سے ڈبے میں اس وقت سوار ہوئے تھے جب گاڑی کی روانگی کی دوسری دہائی تھی۔ وہ دونوں وینٹک روم سے اس طرح باہر آئے تھے جیسے قید خانے سے نکلے ہوں۔ انہوں نے قلی کو صرف انٹچی کیس اور دہائی بیک تھما دیا تھا۔ لڑکے کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بالکل نیا اور بڑا سا بریف کیس تھا جسے اس نے بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا جیسے کوئی چھین نہ لے اور اس میں

خزانہ بھرا ہوا ہو۔ لڑکی نے ایک بڑا سا پلٹ اٹھا رکھا تھا۔ وہ یہ سامان بڑی آسانی سے خود بھی اٹھا کر لے سکتے تھے۔ چون کہ وہ گھڑکی کے پاس بیٹھا باہر جھانک رہا تھا۔ اس لئے ان کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص اتفاق تھا کہ ان کی نشستیں اس کی نشست کے مقابل اور گھڑکی کے ساتھ تھیں۔

اس کے دوسرے ہم سفروں کے پاس اس قدر ساز و سامان تھا کہ وہ رستے میں بے ترتیبی سے نہ صرف بٹکھرا ہوا پڑا تھا بلکہ آمدورفت میں رکاوٹ بن گیا تھا بلکہ بیٹھے ہوئے لوگوں کے لئے بھی تکلیف دہ اور پریشانی کا باعث ہو رہا تھا۔ اس کے لئے جبکہ بنانے اور ترتیب سے رکھنے کے لئے ایک انفراری اور بدلتی سی مچی ہوئی تھی۔ بڑی دیر میں بدقت تمام سامان ترتیب سے رکھا جا سکا۔

گاڑی تیز رفتاری سے سفر کر رہی تھی۔ وقت گزری کے لئے ضروری تھا کہ آجس میں گفتگو کی جائے۔ اور ایک دوسرے سے متعارف ہو یا جائے۔ اس لئے کہ یہ بس کا نہیں بلکہ ریل گاڑی کا سفر تھا۔ موضوعات کی کوئی کی نہیں تھی۔ اسے بنگور جانا تھا۔ کسی قریبی اسٹیشن پر اتارنا بھی نہیں تھا۔ اس نے ہی سہی کو توڑنے میں پہل کی۔

”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔۔۔؟“ لڑکے کو شاید اس بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ اس سے کچھ پوچھے گا۔ وہ ایک لغت اس طرح سے گھبرا گیا تھا جیسے وہ کوئی مجرم ہو اور کسی پولیس افسر نے سوال کر لیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گیا اور پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ اسے جواب دینے میں جھجکی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھلا کر قدرے تامل کے بعد جواب دیا۔

”جی۔۔۔۔۔ ہم بنگور جا رہے ہیں۔“ اس نے اپنے بشرے یا اپنے کسی رد عمل سے یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ لڑکے کی بات سن کر چونک گیا ہے۔ جب لڑکے کے عمل اور اس کی اضطرابی کیفیت نے ٹائیکر کو چونکا دیا تھا۔ اور پھر وہ شک و شبہ میں مبتلا ہو گیا۔

اس کے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی زندگی میں واسطہ جرم پیشہ لوگوں سے پڑتا چلا آ رہا تھا۔ ایک طویل عرصہ سے ہر بات کو نہ صرف شکی مزاج سے دیکھتا بلکہ چونکا اس کی فطرت ہی بن گئی تھی جس سے وہ باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ سرائے میں رہتا تھا۔ ایک طرح سے اس کے اندر جیسے کوئی خفیہ پولیس افسر تھا۔ اس لئے جب کسی کی حرکات و سکنات عجیب اور پراسرار سی لگتی تو اسے ایک عجیب سی بے چینی ہونے لگتی تھی۔ اس لئے وہ بے چینی کی اہر کی پلیٹ میں آ گیا تھا۔

اور پھر کچھ ایک اس کی چمکی حس بیدار ہو گئی تھی۔ ٹائیکر کا قیاس بتا رہا تھا کہ یہ جوڑا ہرگز شادی شدہ نہیں ہے بلکہ وہ دونوں اپنے اپنے گھروں سے بھاگ کر بنگور جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس بریف کیس میں وہ نقدی اور زیورات ہوں گے جو لڑکی اپنے گھر سے لے کر آئی ہے۔ عموماً اس طرح کی لڑکیاں بری بے رحمی سے اپنے گھروں میں جھانڈ پھرتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عشق کے جنون میں اندھی ہو جاتی ہیں۔ وہ نہ صرف سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو جاتی ہیں اور انہیں کچھ بھائی نہیں دیتا ہے۔ لڑکیوں میں عقل تو ہوتی ہے نہیں۔۔۔۔۔ عشق کی راہ میں قدم قدم پر فریب کھاتی رہتی ہیں۔

ٹائیکر کے ذہن میں ایک بات اور آئی تھی کہ لڑکے نے لڑکی کو بے وقوف بنانے کے لئے اس کے حسن کی خوب تعریف کی ہوگی۔۔۔۔۔ اس حسن کا دور دور کوئی پتا اور نام و نشان نہیں تھا جو ایک لڑکی محسوس کرتی ہے۔ وہ احساس کسری میں مبتلا ہوگی۔ اس کی اس کمزوری سے لڑکے نے فائدہ اٹھایا ہوگا۔۔۔۔۔ اس نے نہ صرف اس کی تعریف کے بل بلکہ باندھ دیئے ہوں گے۔ لڑکی نے بوئے خواب دیکھے ہوں گے۔ پھر وہ اپنے آپ کو واقعی خوب صورت سمجھی ہوگی اور اس لڑکے کی جھولی میں کسی کے پھل کی طرح گر پڑی ہوگی۔ لڑکے نے تجویز دی ہوگی۔ بنگور جا کر شادی کر لیں گے۔ شادی اور مستقبل کے خیال سے وہ گھر سے رقم اور زیورات لے کر فرار ہو رہی ہوگی۔ یقیناً لڑکی نے اونچا ہاتھ ہی مارا ہوگا۔ اس کے گھر والے

یقیناً خوش حال اور دولت مند بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ لاکھوں ہی لے جا رہی ہوگی۔

جب ٹائیکر نے خیالات کے گرداب سے نکل کر تھوڑی دیر بعد کسی بہانے سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے نظروں کی گرفت میں لے کر لڑکی کے چہرے پر نظرسر مرکز کیس تو اس کا قیاس درست ثابت ہوا اور وہ ریت کے تودے کی طرح ٹوٹے گیا۔ گوکہ لڑکی عام شکل و صورت کی تھی۔ لیکن اپنی صورت سے اس قماش کی دکھائی نہیں دیتی تھی کہ وہ عشق کے جنون میں اپنے آپ کو لڑکے کو سب کچھ سوپ دے اور اس کی جھولی میں کیے پھل کی طرح ٹپک پڑے۔۔۔۔۔ اور اپنا گھر بار ایک لڑکے کی خاطر چھوڑ دے اور اس کے ساتھ آنکھیں بند کر کے بھاگ نکلے۔ ایسی لڑکیاں اور ہوتی تھیں۔

وہ اپنے چہرے پر مہرے اور وضع قطع سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نفیس مزاج کی لڑکی اسے لگی تھی۔ اس کے لب و لہجے کی نفاست اور شائستگی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ لڑکی کا تعلق کسی ایسے اور اعلیٰ گھرانے سے ہے۔ وہ یوں ہی ہر طرح سے پر سکون نظر آ رہی تھی۔ اس کے بشرے سے کسی بے چینی اور ذہرہ برابر اضطراب ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ جو عموماً گھروں سے فرار ہونے والی اکثر لڑکیوں کی حرکات و سکنات اور چہروں پر دکھائی دے جاتا ہے۔۔۔۔۔ اگر وہ واقعی اپنے گھر اور ضمیر کی مجرم ہوتی تو ہندی کی طرح پر سکون نہیں ہوتی اور اس کا وجود ہر لمحہ مرتعش رہتا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی نہیں بلکہ انجانے خوف کی لرزیدگی ہوتی۔۔۔۔۔

اس لڑکی کی برعکس اس کے ساتھی لڑکے کی ظاہری حالت قدرے مختلف تھی۔ وہ اپنی اندرونی اضطرابی کیفیت کو بدقت تمام دبائے ہوئے تھا۔ وہ مضطرب سا ہو کر بار بار بریف کیس کو کسی نہ کسی بہانے دیکھتا جو اس کے پاس ہی رکھا تھا۔۔۔۔۔ جسے اس کا بس چلے تو اسے سینے سے لگا لے یا اپنی آغوش میں بھر لے۔ جب کسی کی نگاہیں غیر ارادی طور پر اس خوب صورت سے بریف کیس کی طرف اٹھ جاتیں تو وہ ایک دم سے چونکا ہوا جانا اور اس

تخص کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتا۔ چہرہ خفیر سا ہونے لگتا۔

ٹائیکر کا تجسس بربر اور ہتھارہا جو ایک قدرتی اور فطری امر تھا۔ اس کا شک اس یقین میں تبدیل ہو چکا تھا کہ اس بریف کیس میں ہزاروں کے نہیں بلکہ لاکھوں کے زیورات موجود ہیں۔ اس لئے وہ ہر نگاہ پر کسی سہمی ہوئی بری کی طرح چڑھتا ہوا جاتا ہے اور اس بریف کیس سے ایک لمحے کے لئے غافل نہیں ہو رہا ہے۔ ایک اسٹیشن پر جب گاڑی سٹپل نہ ہونے کی وجہ سے چند لمحوں کے لئے رکی اور ایک حشمتی سپاہی نہ جانے کی کی تلاش میں بوگی میں جھانکا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ لرزے کا مریض بن گیا۔ سوائے ٹائیکر کے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اگر کوئی ہم سفر نہ اس کا بے لہو چہرہ دیکھتا تو شک میں پڑ جاتا یا پھر اس سے پوچھتا کہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟

لیکن دوسری طرف لڑکی کی طمانیت شکوک کو رفع کرنے پر تکی ہوئی تھی۔ اس بریف کیس میں لڑکی کے اپنے زیورات ہوتے تو وہ زیادہ پریشان اور محتاط ہوتی۔۔۔۔۔ ٹائیکر کے خیال میں لڑکا ایسی حقاقت کرنے سے رہا کہ وہ اپنے ہی گھر پر ڈاکا مارے یا پھر اس بریف کیس میں کوئی ایسی چیز تھی جس نے لڑکے کو ہوشیار اور چوکنار رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسی عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا کہ جب کہ کبھی اس کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور پھر اس سے اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

جب شام کے گھرے سائے رات کی تاریکی میں ہم آغوش ہونے لگے جب پوری بوگی میں ایک پچھلی سی پیدا ہوئی۔ چوں کہ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا اس لئے مسافر اپنے ناشتے دان کھولے اور دسترخوان بچھا کر کھانا چننے لگے۔ ٹائیکر کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے اسٹیشن پر صرف ایک پیالی چائے پی لی تھی۔ ہم سفروں میں صرف وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے پاس کھانا نہیں تھا۔ اسے پچھتا سا ہوا کہ اس نے اسٹیشن پر کسی مسلم ریستورنٹ سے بریانی پارسل کیوں نہیں کروائی تھی۔ ٹرین

میں ڈائٹنگ کار تھی جس میں ویٹیرین کھانے دستیاب تھے لیکن میٹنی اسٹیشن کے مسلم ریستورنٹ کی بریانی بڑی لذیذ اور ذائقہ دار ہوتی تھی۔ اسے دو ایک مرہبہ کھانے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر خاصی دیر کھڑی رہی تھی۔ اس ہوٹل کے باوردی ویٹیرین گزرے تھے۔ جب اسے دھیان نہیں آیا تھا کہ رات کے کھانے کا وہ کیا کرے گا۔ اب اسے ویٹیرین کھانے پر اٹھنا پڑا تھا۔

اس نے سوچا کہ کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی یا ڈائٹنگ کار کا کوئی ویٹیرین اندر سے گزرا تو لے لے گا۔ ایک ویٹیرین آیا تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ صرف چائے یا کافی یا کلوڈ ڈرنکس مل سکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ اب جو اسٹیشن آنے والا ہے وہ پینتالیس منٹ بعد۔۔۔۔۔ شاید وہاں کھانا مل جائے۔ ٹائیکر کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تھے۔ لیکن اب صبر کے سوا چارہ نہیں تھا۔

لڑکی نے اور دوائی پر تھکے ہاتھ پر اس اٹھایا اور اسے برتھ پر رکھ کر کھولا۔ ٹائیکر نے نہ جانے دوسے بھی ادھر دیکھا۔ شاہی کباب، بفرانی قیہ اور روٹی پر انھوں کے ساتھ سلاد اور پودینے کی چٹنی بھی تھی۔ گتے کی رکابیاں بھی تھیں۔ لڑکی نے ایک رکابی میں دو پرائے رکھے۔ پھر دوسری رکابی میں اس نے بڑے سلیقے اور قریب سے دو ابلے ہوئے انڈے، دو شاہی کباب، قیہ چٹنی اور سلاد رکھا۔ پھر اس نے اپنے سر اور سینے پر دو پٹا درست کیا۔ پھر ان دونوں رکابیوں کو اپنے دونوں ہاتھ میں اٹھا کر ایک تخت ٹائیکر کی طرف گھومی۔ پھر اس نے ٹائیکر کو اپنا نیت بھرے لہجے میں مخاطب کر کے کہا۔

”یہ نیچے اٹکل۔۔۔۔۔ آپ بھی کھانا کھالیں۔“

ٹائیکر کو اس لڑکی سے اس قسم کے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک اجنبی لڑکی گھر کے فرد کی طرح پیش آئے گی۔ لڑکی نے اسے رسی طور پر دعوت دینے کے بجائے عملی طور پر ایک انجانے خلوص اور جذبے کا اظہار کیا تھا۔ اس لڑکی کی مہمان نوازی اور اپنائیت نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔ ٹائیکر نے چونک کر رسی طور پر شرم و دل سے انکار کیا اور کہا۔

”آپ لوگ ہم اللہ کریں۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر میں پیش آنے والا ہے۔ میں اسٹیشن سے لے لوں گا۔“

”اٹکل۔۔۔۔۔! پلیز۔۔۔۔۔! اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ اس میں بلجست بھی تھی۔ وہ ٹائیکر سے اس طرح پیش آ رہی تھی جیسے وہ واقعی اس کا اٹکل ہو۔ اسی نے ہم دونوں کے لئے کتنا سارا کھانا تیار کر کے دے دیا ہے۔۔۔۔۔ اتنا سارا کون کھائے گا۔۔۔۔۔ ہم سفر غریبہ ہب ہیں۔ کباب اور قیہ کا گوشت کہاں کھاتے ہیں۔ ورنہ میں نہیں بھی پیش کر دیتی۔۔۔۔۔ اور پھر ریلوے کے کھانے پر پیسے کیوں برباد کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے کھانے کھا کر آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔“

آخری جملہ ادا کرتے وقت اس لڑکی کا لہجہ قدرے شوق ہو گیا تھا۔ وہ بڑی خوش مزاج اور زندہ دل واقع ہوئی تھی۔ ٹائیکر نے مجبوراً اس پر خلوص لڑکی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

ای تو تو رہ، چکن کڑائی اور مرغ بریانی اور نہ جانے کیا کیا کچا کر دینا چاہ رہی تھیں جیسے ہم تین چار دن کے سفر پر جا رہے ہیں۔

لڑکی نے لڑکے کی طرف شوق نظروں سے دیکھا تو لڑکا معنی خیز انداز سے مسکرا کر رہ گیا۔ ”جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں شاید کھانا نہیں ملے گا۔۔۔۔۔“ وہ ہنس پڑی۔

اب ٹائیکر کے لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر شکوک کے جو گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے وہ ایک ایک کر کے چھٹ گئے تھے۔ اب اس کی نظروں کے سامنے صاف و شفاف اور نکھرا ہوا آسمان تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا ہوگا کہ بنگلور میں اس نے ایک مکان خرید کر رکھا ہوا ہے۔ اس کا چھوٹا موٹا پلاسٹک کا کاروبار ہے۔ وہ مکان میں کچھ دن رہنے جا رہا ہے۔ جو خالی پڑا ہوا۔

وہ سمجھ گیا کہ اس بریف کیس میں نہ صرف کچھ نقد ہے بلکہ شادی کے زیورات موجود ہیں۔ جوان کی اپنی ملکیت ہے۔ ظاہر ہے ایک جوہری نے اپنی بیوی کو جینز میں قیمتی زیورات دیئے ہوں گے۔ ان زیورات کے عوض لڑکا بک گیا تھا جب کہ اس لڑکے کو فروخت ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی خوب صورتی اور وجاہت سے فائدہ اٹھا کر کسی بھی بڑے گھر کا داماد بن سکتا تھا اور اسے بیوی بھی حسین و جمیل مل جاتی۔ یہ شاید غلٹ پسند تھا یا پھر اس نے

کسی خاص مقصد سے اس لڑکی سے شادی کرنی تھی۔ زندگی کے اس سفر میں لڑکا واقعی بڑا ہی خوش نصیب تھا کہ اسے عطیہ جیسی بیوی ملی تھی جو ہر لحاظ سے ایک مکمل عورت تھی۔ ایک روایتی عورت جو بنگلہ دیشی ڈگر پر بل کر گھر کو جنت کا نمونہ بناتی ہے اور شوہر پرست ہوتی ہے۔ ایک مرد اسی بیوی پر بجا طور پر ناز اور فخر کر سکتا تھا۔ ایسی مثالی لڑکیاں خال خال ہی منظر ہرے میں نظر آتی تھیں۔

پوٹا انیشن پر گاڑی رکی تو اس نے ٹائیگر اپنے اور سرفراز کے لئے بھی چائے منگوائی۔ اس نے ٹائیگر کو چائے کے پیسے دینے نہیں دیئے تھے۔ اس نے اپنا پرس جو انٹیچی سے نکالا تھا اس میں سے چائے کے پیسے نکال کر دیئے تھے۔ جب ٹائیگر نے خواجے والے کو بلا کر اپنی پسند کے گریٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے ٹائیگر کو دو پیکٹ کے بھی پیسے دیئے تھے۔ جب اس نے احتجاج کیا اور پیسے وینے لگے تو وہ بہن کی طرح روٹھنے لگی۔ ٹائیگر کو ایسا لگا کہ جیسے وہ اپنی بہن کو اس کی سسرال چھوڑے جا رہا ہو۔ اس میں اور عطیہ میں بہت ساری باتیں مشترک تھیں۔ عطیہ کے خلوص..... اپنائیت کے جذبے اور محبت آئینہ برتاؤ نے اس کے اندر یہ جذبہ بیدار کیا تھا وہ اس کی زندگی کے لئے دعا کرے۔

مارچ کا مہینہ تھا۔ باہر کا موسم بڑا خوشگوار اور دلکش سا ہو گیا۔ بہار کا موسم عجیب بہار دے رہا تھا۔ اور پھر عطیہ کی باتوں اور بے حد خلصانہ برتاؤ سے فرحت بخش ہو کر دل کی انتہا گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ عطیہ نے سفر کو بڑا سہانا بنا دیا تھا۔ اور اسے بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اکیلا سفر کر رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر عطیہ سے سفر میں ملاقات نہ ہوتی تو وہ نہ صرف تنہائی محسوس کرتا بلکہ بڑی بوریٹ بھی محسوس کرتا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ عطیہ کو اس کی سسرال چھوڑ کر لوٹ رہا ہے۔ اس سے اس کی طبیعت پر ایک گہری پامیت اور اداسی چھا گئی تھی۔ جس کا اس نے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ ٹائیگر لڑکیوں کے بارے میں بہت جذبہ بانی ہوتا تھا۔ اسے ایسا بھی لگ رہا تھا کہ

عطیہ سے جیسے کوئی انجانا رشتہ ہو۔

سرفراز ایک طرح سے اس سے الگ تھلگ ہی رہا۔ ٹائیگر نے اندازہ کیا کہ وہ شاید بریف کیس میں موجودہ دولت کے باعث اس سے اور دوسرے ہم سفروں سے میل جول بڑھانے میں احتیاط برت رہا ہے۔ جب اس نے ٹائیگر کو زیادہ لفٹ نہیں دی تو وہ بھلا اس کی کیا پرواہ کرتا۔ اور سمجھتا کہ تم جو اس قدر محتاط اور چوکنا ہو رہے ہو اس سے ہم صرف شک کر سکتے ہیں کہ بریف کیس میں یقیناً مال بھرا ہوا ہے۔ وہ عطیہ سے بہت کھل گیا۔ کیوں کہ آخر وہ ایک سونا جیسی لڑکی تھی۔ اس سے اس طرح پیش آ رہی تھی وہ جیسے اس کے خاندان کا کوئی فرد ہو۔

جب مسافروں نے کی تیاری کرنے لگے تو اوپر والی برتھوں پر سرفراز اور ٹائیگر آسنے سامنے لیٹ گئے تھے۔ درمیان والی برتھوں پر عطیہ اور ایک برقع پوش عورت اپنے نو ذائیدہ بچے کے ساتھ لیٹ گئی۔ برقع پوش عورت کے سخت گیر شوہر نے جو ایک کشمیری پشمان تھا سیٹوں کے درمیان چادر لگا کر پردہ تان دیا تھا تاکہ اس کی بیوی سکون و اطمینان اور آ زادی سے سو سکے۔ وہ سب سے نیچے برتھ پر دراز ہو گیا۔ ٹائیگر کو اس لئے دراز ہوتے ہی نیند آ گئی اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا کہ موسم اور خوش گوار اور حسین ہو گیا تھا۔ خنک ہوائے جیسے لوریاں دے کر سلا دیا ہو۔

کسی اور انیشن پر گاڑی رکی تو پلیٹ فام پر مسافروں اور قلیوں کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید کوئی جکشن تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی لیکن تھی کہ کسی ہرجائی مجبور کی طرح روٹی ہوئی تھی۔ اس نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ وہ سو نہیں جا رہا تھا۔ شاید اس کی آنکھ بھی شوروں سے کھل گئی تھی۔ اس نے بریف کیس کو سر ہانے رکھ کر تکیہ بنایا ہوا تھا۔ اگر کوئی بریف کیس کو اس کے سر کے نیچے سے بریف کیس کھینچتا تو اس کی آنکھ ضرور کھل جاتی۔

عطیہ درمیانی برتھ پر لیٹی ہوئی تھی وہ کھل کر فرش پر

کھڑی ہوئی۔ اس نے اس کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہا۔

”انگل..... کیا آپ بھی جاگ رہے ہیں؟“

آپ تو لیٹتی ہی سو گئے تھے؟“

”میل شور سے بیدار ہوا ہوں..... ورنہ گہری نیند سوتا ہوتا.....“

”آپ جاگ ہی گئے ہیں تو چائے پی لیں.....“

آپ کے لئے میں چائے منگوائی ہوں۔“ اس نے کہا۔

اس نے ٹی میں سر ہلادیا۔ ”بھئی..... مجھے چائے نہیں بلکہ نیند یاری ہے۔“ چائے تو نیند کی دشمن ہوتی ہے۔ اب میں نے دو گھونٹ چائے پی بھی لی تو ساری رات سو نہیں سکوں گا..... لہذا مجھے معاف ہی رکھو.....“

عطیہ اس کی باتیں سن کر مسکرائی۔ پھر اس نے کھڑکی میں سے باہر نکال کر چائے والے کو آواز دی۔

جب وہ کھڑکی کے پاس آیا تو اس نے چائے والے کو چائے کے لئے کہا۔ ٹائیگر نے سونے کی کوشش کی۔

آنکھیں موند لیں۔ لیکن وہ اس حالت میں کسی کی بھی حرکات و سکنات دیکھ سکتا تھا۔ عطیہ نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے بیس روپے کا نوٹ نکالا تو اس نے ایک چھوٹی سی پڑیا کو پرس سے نکل کر فرش پر گرتے ہوئے دیکھا۔

عطیہ نے فوراً ہی چکی کی سی سرعت سے جھک کر اس پڑیا کو اس طرح سے اٹھایا جیسے وہ کوئی قیمتی ہیرا ہو..... پھر اس نے اس پڑیا کو بائیں ہاتھ کی مٹھی میں اس طرح سے دبایا کہ جیسے اسے کسی کی نظروں میں لانا نہ چاہتی ہو۔

عطیہ کی اس حرکت نے اسے بری طرح چڑھایا۔

اسی لمحے وہ ٹائیگر کو بری پراسرار اور عجیب سی لگی۔ اس کے دل کے کسی کونے میں شک کی لہر اٹھی.....

نہیں..... کہیں بیدہر کی پڑیا نہ ہو۔ لیکن زہر کا اس کے پاس کیا کا.....؟“ بالفرض محال وہ زہر ہے تو اس نے کیوں اور کس لئے اپنے پرس میں رکھا ہوا ہے..... کیا وہ اپنے شوہر کو زہر دینا چاہتی ہے.....؟

جب چائے والا چائے لے کر آیا تو اس نے

دونوں پیالیاں لے کر مڑنے سے پہلے ٹائیگر کی طرف دیکھا..... وہ سوتا بن گیا اور لمبی سانس لے کر یہ تاثر دینے لگا کہ وہ گہری نیند سو گیا ہے۔

دوسرے لمحے عطیہ نے اسے دھکی آواز میں مخاطب کیا۔ ”انگل..... آپ چائے پییں گے؟“

جب ٹائیگر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو اس نے دونوں پیالیاں لے لیں۔ پھر اس نے سرفراز کی طرف دیکھا..... سرفراز آنکھیں بند کئے انجانے تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ جانے کن خالوں سے دک رہا تھا اور اس کے رخ پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ بھی کھیل رہی تھی جیسے سکندر کی طرح ساری دنیا کو فتح کر لیا ہو۔

عطیہ نے بڑی سرعت سے پلٹ کر چائے کی دونوں پیالیاں اپنی برتھ کے کترے کے قریب رکھ دیں۔

پھر اس نے گریبان سے پڑیا نکال لی۔ اس نے وہ پڑیا گریبان میں رکھ لی تھی وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جب اس نے بغیر کسی تاخیر کے وہ پڑیا کھولی تو اس کے ہاتھ میں کپکپاہٹ پیدا ہوئی تھی جس پر اس نے جلد ہی قابو پا لیا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے گرد و پیش کا جائزہ لے کر اپنا اچھی طرح سے اطمینان کر کے پڑیا کا سارا سفوف ایک پیالی میں ڈال دیا۔ وہ اس قدر محتاط ہو گئی تھی کہ خالی پڑیا کو کھڑکی کے راستے باہر پھینکنے میں ہل بھر کی بھی دیر نہیں کی تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ اس نے دوپٹے کے پہلو سے پیشانی کے پسینے کو جذب کیا اور ایک گہرا سانس لیا۔

پھر اس نے فوراً ہی ٹشتری میں سے چچ اٹھا کر اس سفوف کو چائے میں گھولنے لگی۔ وہ چند لمحے تیزی سے چچ چلاتی رہی۔ جب اسے اچھی طرح اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ سفوف چائے میں اچھی طرح سے حل ہو گیا ہے تو اس نے چچ نکال کر ٹشتری میں رکھا۔ اس دوران اس کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ اس نے اسے دوپٹے میں جذب کیا۔ اچھی طرح سے چہرہ پونچھا۔ پھر اس نے سر پر

دو ہزار کروڑ دست کیا۔ پھر چائے کی پیالی دائیں ہاتھ میں اٹھائی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے سرفراز کا بازو بلایا جو گہری نیند میں غرق تھا۔

چند ثانیوں کے بعد سرفراز نے بیدار ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟“
عطیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔ اس کے شوخ لہجے میں ہلکا سا طنز تھا جو صاف طور پر محسوس ہوتا تھا۔

”سرتاج چائے لیجئے۔۔۔! کنیز نے آپ کے لئے چائے منگوائی ہے۔“

سرفراز نے چونک کر پہلو تو ریف کیس کی جانب نگاہ کی۔ پھر اس نے اپنی دونوں آنکھیں ملیں۔ پھر اس نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ترنگ کے عالم میں پوچھا۔
”کون سی جانب؟“

”ریلوے اسٹیشن کی۔۔۔ عطیہ گنگنائی۔“
سرفراز اٹھا اور بریف کیس سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ عطیہ کے ہاتھ سے چھائے کی پیالی لیتے ہوئے مسکرایا۔

”آپ کی اس نوازش کا بہت بہت شکریہ۔۔۔“
آپ میری ہر بات کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔“

”آپ بہت ہی ہوشیار۔۔۔ بادشاہ سلامت۔۔۔“ عطیہ نے اسے ٹکھی نظروں سے دیکھا۔

”اس میں ہوشیاری کی کیا بات ہے۔۔۔؟“
سرفراز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”بادشاہ سلامت۔۔۔! اس میں ہوشیاری کی کیا بات ہے نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔۔۔؟ آپ میری ہر نوازش کو شکریے پر مال دیتے ہیں۔۔۔ کوئی انعام و اکرام سے نوازتے نہیں ہیں۔“ وہ شرارت کے انداز میں آہٹکی سے بولی۔

”وقت آنے پر ہم اپنی ملکہ عالیہ کو ایسی فیاضی سے نوازیں گے کہ۔۔۔ آپ زندگی بھر فراموش نہیں کر سکیں گی۔۔۔ آپ نے ہمارا دل کہاں دیکھا ہے۔۔۔؟“ سرفراز

نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔

”کنیز۔۔۔ اس روز کا بے تابی سے انتظار کرتی رہے گی۔۔۔“ عطیہ نے کورس بجاتے ہوئے کہا۔

”آپ فکر مند نہ ہوں۔۔۔ وہ دن بہت جلد آپ کی زندگی میں طلوع ہونے والا ہے۔۔۔“ سرفراز نے کہا۔
”ہم اس دن کا انتظار کریں گے بادشاہ سلامت۔۔۔!“ عطیہ نے کہا۔

”بس۔۔۔ وہ دن۔۔۔ وہ ایک دن میں ہی آجائے گا۔۔۔ آپ ہم پر بھروسہ رکھیں۔“

عطیہ جانے کس خیال میں لجا ہی گئی اور وہ اس لمحے ٹائیکر کو بہت اچھی لگی۔ اس لمحے اس کے چہرے پر حیا سے ایک نکھار آ گیا تھا۔ جس نے عجیب سی جاہلیت پیدا کر دی تھی۔ لیکن وہ سمجھ گیا کہ عطیہ اپنی اداکاری اور عیاری کا جو ہر دکھا رہی ہے۔ وہ بڑے بھولین اور سادگی سے سرفراز کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ اس بات کا ٹائیکر کو اندازہ نہ تھا کہ وہ اس قدر تیز لڑکی ہے۔ کسی دودھاری تلوار کی طرح۔

صاحب زادے عطیہ کو لپاتے دیکھ کر کھل اٹھے۔ انہوں نے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑ رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے عطیہ کی نکائی پکڑی تو دوسرے سرخ ہوئی۔
”کچھ تو خیال کیجئے۔۔۔ یہ ریل گاڑی ہے۔۔۔ میڈروم نہیں۔۔۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”تم اس قدر حسین دکھائی دے رہی ہو کہ دل قابو میں نہیں آ رہا ہے۔“ سرفراز نے شاعرانہ انداز میں کہا۔

عطیہ نے فوراً ہی اپنے آپ کو اس خول سے باہر نکالا اور غیر محسوس انداز سے اپنی نکائی پکڑ لی اور بولی۔

”عالی جاہ۔۔۔! چائے ویسے ہی ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے۔ اگر آپ کا فرماں شاہی جاری رہا تو برف مٹ جائے گی۔“

”ٹھنڈی ہو رہی ہے تو اسے پھینک دو اور دوسری گرم چائے منگوا لو۔۔۔“ سرفراز نے کہا۔

”اب اتنا وقت نہیں رہا کہ چائے کا انتظار کیا جائے۔۔۔ یوں بھی چائے کے اسٹال پر بہت رش

ہے۔۔۔ چائے پوری طرح ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔۔۔ نیم گرم تو ہے۔“ عطیہ نے فوراً ہی کہا۔

”اگر ایسی بات ہے تو زہر مار کر لیتے ہیں۔۔۔“
سرفراز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سرفراز نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کڑوا سا منہ بنایا۔ ”کیا داہیات چائے ہے۔ میں نے کبھی ایسی چائے نہیں پی۔“

”یہ چائے ریلوے پلیٹ فارم کی ہے۔ آپ کے شاہی باورچی خانے کی نہیں ہے۔“ عطیہ نے جھٹ سے جواب دیا۔ پھر وہ چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔ ”آخر میں بھی تو پی رہی ہوں۔۔۔ ایسی خراب بھی تو نہیں ہے۔“

”میں نہیں پیوں گا یہ کڑی سیلی چائے۔“ اس نے چائے کی پیالی عطیہ کی طرف بڑھائی۔

”چائے نہیں پیو گے تو اپنی نیند کیسے بھگاؤ گے۔۔۔؟“ عطیہ نے سرا سیمہ ہو کر اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں رات بھر نہیں سوؤں۔۔۔“ سرفراز نے الجھ کر کہا۔ ”جاگتا رہوں۔۔۔“

”اگر تمہیں نیند آگئی تو سمجھو کہ۔۔۔“ عطیہ نے اپنا جملہ ادھورا پھوڑ دیا۔

”اوہ۔۔۔ مجھے تو اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا۔“
سرفراز نے چونک کر بریف کیس کی طرف دیکھا۔

”عالی جاہ۔! گھوڑے بیچ کر نہیں بلکہ تخت و تاج بیچ کر سو رہے تھے۔ میں نہیں چکاٹی اور چائے نہیں منگوائی تو۔۔۔ عالی جاہ کی آنکھ شاید بنگور جا کر چھلکتی۔۔۔“

چائے پیتے نیند بھاگ جائے گی۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”نیند کیا۔۔۔ شیطان بھی بھاگ جائے گا۔“
سرفراز نے ایک ہی سانس میں چائے حلق سے اتار لی۔

پھر اس نے برا سامنہ بنایا۔ اس چائے سے تو کسی بھی سرکاری اسپتال اور ڈسپنسری کی کچھ لاکھ روپے بہتر ہوگا۔ کیا نہیں ہو سکتا کہ کسی اور سے چائے لے لو۔“

”وہ کس لئے۔۔۔؟“ عطیہ نے سوالیہ نظروں

سے دیکھا۔ ”اس چائے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔“
”من کا ذائقہ بہت خراب ہو گیا ہے۔۔۔ اچھی چائے کی بڑی طلب ہو رہی ہے۔“ سرفراز نے کہا۔

”گاڑی چلنے والی ہے۔“ عطیہ نے اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے لی۔ ”تم جاگتے رہو گے۔۔۔ کسی اور اسٹیشن سے تمہیں اچھی چائے پلا دوں گی۔ پہلے میں پی کر دیکھوں گی۔۔۔ اچھی لگی تو عالی جاہ کی خدمت میں پیش کر دوں گی۔“

ٹائیکر نے عطیہ کے چہرے پر ایک فاتح جرنیل کی سی مسکراہٹ دیکھی۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کنزکرائی جلیوں کی پلک دکھائی دے رہی تھی۔۔۔

سرفراز نے جو پوری چائے لی تو اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ جیسے اس کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ اور اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو گئے ہوں۔

جب چائے والا اپنی پیالیاں لینے آیا تو اس نے نہ صرف دس روپے بخشش اور چائے کے پیسے دیئے اور اس پر اپنی کامیابی پر سرشاری سی مچی۔

ٹائیکر تو کب سے اپنی جگہ پر لیٹا ہوا عطیہ کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی حیرت دو چند ہوئی جا رہی تھی۔ ایک ”سیدھی سادی لڑکی نے

ایک ایک اپنا چولا بدل کر اسے جیسے اوپر برتھ سے نیچے گرا دیا تھا۔ اس کے ذہن پر ہتھوڑے پڑنے لگے۔۔۔ اس کے ذہن میں خیالات گڈھ ہونے لگے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے

بغیر نہ رہ سکا کہ درحقیقت وہ دونوں میاں بیوی نہیں ہیں بلکہ میاں بیوی کا ڈرامہ رچا کر دنیا کی آنکھوں میں دھول

جھونک رہے ہیں۔ ورنہ وہ کچھ دیر پہلے ایک میاں بیوی کی مسافروں کی موجودگی میں وہ گہری نیند سو ہی کیوں نہ رہے

ہوں ایسے شوخ اور محبت بھرے انداز میں بات نہیں کر سکتے۔ میاں بیوی یوں بھی صاف پچکانے جاتے ہیں۔ یہ دونوں تو فکی رومانی جوڑا بنے ہوئے تھے۔

لیکن دوسری طرف اس کی بد صورت محبوبہ نے اس کی چھائی ہوئی ساری بساط الٹ دی تھی۔۔۔ شرمات

کے اس مات کھیل میں عطیہ کا پلہ بھاری تھا۔ اس کے دل

میں شاید لالچ آگیا تھا۔ وہ ایک خطرناک اور طرح ورتی ہوئی گہری اور پتھلی ہوئی عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سرفراز کی چائے میں نیند یا بے ہوشی کی دوامدادی تھی کہ جیسے ہی سرفراز پر بے ہوشی طاری ہو جائے تو وہ بریف کیس لے کر کسی اسٹیشن پر اتر جائے گی۔ ٹائیکر کا وہ یاد اس بات کا امکان ہے کہ عطیہ کا کوئی ساتھی اس گاڑی میں موجود ہو اور اس کی موجودگی کے باعث ہی اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہو۔

یہ بچوں کا کھیل نہیں تھا اور ایک عام قسم کی لڑکی اتنی ہمت سے یہ کام کر سکتی تھی۔ لیکن ٹائیکر نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ عطیہ کو اپنے ارادوں میں کسی قیمت پر کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

عطیہ اب اس کے لئے بہت ہی پر اسرار اور شاطر قسم کی لڑکی بن گئی تھی۔ اب اس کے دل کے کسی کونے میں عطیہ کے لئے ہمدردی کی رتی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی اور سراغ رسانی کے کاموں میں اسے بہت ساری ایسی فوجان اور شاؤدی شدہ لڑکیوں سے واسطہ پڑا اور پڑتا تھا کہ جو مجرم ہوتی تھیں۔ لیکن ان میں کوئی عطیہ کی طرح ہوشیار۔ ذہین اور خطرناک نہیں تھی جس سے اس کا واسطہ پڑا ہو۔ ایک بھولی بھالی لڑکی سے وہ اس طرح کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

جب عطیہ اپنی برتھ پر جا کر لیٹ گئی اور جلد ہی گہری نیند میں ڈوب گئی تو اسے نہ صرف اپنے خیالات جھٹک دینا بلکہ بدل دینا بھی پڑے تھے۔ عطیہ نے اسے بری طرح چکرا دیا تھا۔ بلکہ بھونچکا بھی کر دیا تھا۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا کہ۔۔۔۔۔ آخراں نے پڑیا چائے میں گھول کر کیوں پلائی تھی؟ آخراں پڑیا میں کون سی وہ تھی۔۔۔۔۔؟ وہ اس کے متعلق جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

اس کے دماغ میں ایک کھلی سی جچی ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس کے اندر جو سراغ رساں وہ پوری بیدار ہو کر اس پر اسرار معاملے کی تہ میں پہنچنے کے لئے میدان میں آگیا تھا۔ یہ عجیب کیس تھا جو اس کے لئے فرق نہیں پڑتا

تھا۔ وہ سونے کی کوشش کے باوجود سو نہیں سکا تھا اور اس معاملے کو جھٹک کے لئے موقوف کر دیا تھا۔ اور پھر وہ سو تا بھی کیسے۔۔۔۔۔؟ کیوں کہ زندگی میں پہلے اسے ایک ایسی لڑکی سے واسطہ پڑنا تھا جس نے اس کے برسوں کے تجربے کو چیلنج کر دیا تھا اور پھر اس کی تمام صلاحیتوں کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ اب اس کی قابلیت کا ایک کڑا امتحان تھا۔۔۔۔۔ آزمائش تھی۔ اس کے اندر جس کا ایک طوفان بھرا ہوا تھا۔ ایک نادیہ آواز جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں گرم گرم سیسہ اڑ رہی تھی۔ ٹائیکر تم ایک عام قسم کی لڑکی سے ہار گئے۔ تمہارے سارے اندازے غلط نکلے۔۔۔۔۔

وہ لیٹا لیٹا۔ آنکھوں پر بازو رکھے عطیہ پر نگاہیں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ عطیہ مکمل طور پر اس کی نظروں کی گرفت میں تھی۔ وہ بڑے سکون و اطمینان سے گہری نیند سوری تھی۔ اور وہ ایک احمق کی طرح اسے دیکھ رہا تھا اور جاگ رہا تھا۔۔۔۔۔ آخر کیوں اور کس لئے۔۔۔۔۔؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

کوئی تیس پچیس منٹ کے بعد وہ پیک لخت بیدار ہو گئی۔ اس کے خیال میں وہ سوئیں رہی تھی۔ اس لئے کہ اگر وہ سو رہی ہو تو اس طرح بیدار نہیں ہوتی۔ اس نے بیدار ہونے کے بعد ایک لمبی سی اگڑائی کی۔ وہ پناہینے اور شانے پر درست کرنے کے بعد اپنی لمبی چوٹی کو پشت پر ڈال دیا۔ پھر اس نے دتی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر وہ اپنا سراپا سیٹ کر اور غیر محسوس انداز سے برتھ سے اتر آئی۔

اس کی یہ حرکت بھی بڑی پر اسرار اور چونکا دینے والی تھی۔ اس نے فرش پر بیٹھ رکھے۔ آہٹ بالکل بیدار نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ جب وہ چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد اس کی طرف گھڑی تو اس نے فوراً ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

چند ثانیوں کے بعد اس نے عطیہ کی طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھا تو وہ سرفراز کا شانہ ہلار رہی تھی۔ سرفراز نہیں جاگا۔ کیوں کہ اس پر بے ہوشی طاری

تھی۔۔۔۔۔ کبداہری عطیہ نے اسے بری طرح جھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ تب بھی نہیں جاگا۔۔۔۔۔ عطیہ نے اس کی چائے میں جو بے ہوشی کی واگھول دی تھی اس نے اپنا اثر دکھایا تھا۔۔۔۔۔ جب عطیہ کو سرفراز کی بے ہوشی کا پورا یقین ہو گیا تو اس کے لبوں پر ایک زہر خند کراہٹ ابھرا آئی اور چہرے پر سفاکی چھا گئی۔۔۔۔۔ جب اس نے اپنے دونوں ہاتھ سرفراز کی طرف بڑھائے تو وہ سمجھا کہ سرفراز کو برتھ سے فرش پر گرادے گی اور اسے کھرکی سے باہر پھینک دے گی لیکن اس کا یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ اس نے فوراً ہی سرفراز کے سر کے نیچے سے بریف کیس کھینچ لیا۔

وہ چونکا ہوا گیا۔ اب اس بریف کیس اور واردات کا کلا ٹکس آگیا تھا۔ اس بات کا تو ای امکان تھا کہ گاڑی کے اسٹیشن پر رکتے ہی وہ بریف کیس لے کر اتر جائے گی۔ گاڑی تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ جو بھی اسٹیشن آنے والا تھا اس میں خاصی دیر تھی۔ وہ بریف کیس اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی۔ بڑے سکون اور اطمینان سے کہ سرفراز اب بیدار ہونے سے رہا۔ حیرت کی بات یہ بھی کہ اس میں نہ تو کوئی اضطراب تھا اور نہ ہی کوئی بے چینی۔۔۔۔۔ بشرے اور آنکھوں سے کوئی ڈر اور خوف کا اظہار تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ اپنی برتھ سے اتری۔ پھر اس نے بریف کیس برتھ پر رکھا۔ جب وہ تالے کا نمبر سیٹ کرنے لگی تو اس کی آنکھوں میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ وہ جو کس ہو کر اس کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگا۔ چند ثانیوں کی دیر بھی نہیں لگی۔ ایک بلکی سی کھٹاک ہوئی۔ بریف کیس کھل گیا۔ اسی لمحے اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور اس طرح خیرہ ہو گئیں کہ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ بریف کیس میں ہیرے جو ہرات کے ایسے خاصے زیورات بھرے ہوئے تھے۔ ان کی مالیت کسی بھی طرح ساٹھ ستر لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ اس کا قیاس درست ثابت ہوا تھا کہ بریف کیس میں زیورات ہوں گے۔ لیکن وہ یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ بریف کیس میں اس قدر زیورات بھی ہو سکتے ہیں۔

اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سرفراز نے یہ سارے زیورات ڈیکٹی کی واردات حاصل کر کے کئے ہیں۔ اس نے بہت ہی اونچا ہاتھ مارا تھا۔۔۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سرفراز نے عطیہ کے والد کی دکان پر ڈاک مار کر جھاڑو پھیر دی ہو اور عطیہ نے محبت کے اندھے جنون میں اس سے تعاون کیا ہو۔۔۔۔۔ سرفراز ایک ایسا خوب صورت، وچہرہ اور وراز قد مرد تھا کہ اس کے حصول کے لئے ایک عورت بہت دور تک جاسکتی تھی۔ عطیہ نے منزل پانے کے لئے اپنے باپ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ وہ بڑی خود غرض بن گئی تھی جو حیرت سے زیادہ دکھ کی بات تھی۔۔۔۔۔ اب کس پر بھروسہ کیا جائے۔۔۔۔۔ ایک بیٹی نے اپنے ماں باپ پر رحم نہیں کھایا تھا ان کی پشت میں شتی اقلی سے چھرا گھونپا تھا۔

عطیہ نے ان زیورات پر ایک اچھی سی نگاہ ڈالی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر بریف کیس کے اس حصے کی تلاشی لی جہاں کاغذات رکھے جاتے ہیں۔ جب اس کا ہاتھ اس حصے سے باہر آیا تو اس میں ایک بڑا لفافہ دبا ہوا تھا۔ عطیہ نے لفافہ باہر نکال کر بریف کیس کو بند کر دیا۔ پھر اس نے غلٹ اور اضطرابی کیفیت میں لفافے کے اندر سے کاغذات نکال کر بریف کیس پر پھیلادئے۔۔۔۔۔ ان میں پاسپورٹ کے علاوہ غیر ملکی کرنسی بھی تھی۔ پھر ان تمام کاغذات، پاسپورٹ اور کرنسی کو لفافے میں واپس ڈال دئے۔ پھر اس نے اپنی اٹیچی اوپر والی برتھ سے اٹھائی جو سرفراز کی پاسی رکھی ہوئی تھی۔ اس اٹیچی کو کجول کر اپنے کپڑوں کی تہ میں اس لفافے کو چھپا دیا۔ پھر اس نے اٹیچی کو اچھی طرح سے مقفل کر کے دوبارہ اسی جگہ رکھ دیا اور اس کی جانی پرس میں رکھ کر ایک گہری سانس لی۔

نہ صرف اس کا چہرہ دمک رہا تھا بلکہ اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ہزاروں طاقت ور برقی قمتے جل اٹھے ہوں۔ پھر اس نے بڑی غلٹ سے بریف کیس کو مقفل کیا۔ پھر اس کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنے ہم سفروں کا جائزہ لیا اور انہیں گہری نیند میں ڈوبا کر اس طرح کھل اٹھی کہ جیسے اس

نے بہت کچھ پالیا ہو۔۔۔۔۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر تازہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے ایک پشورہ قاتل کی سی سفاکی جھانکنے لگی۔۔۔۔۔ اگر سرفراز یا کوئی بھی اس لمحے اس کا چہرہ دیکھ لیتا تو وہ یقیناً زور جاتا عطیہ کے چہرے کے تاثرات اس قدر بھیانک تھے کہ وہ دنگ رہ گیا تھا۔

عطیہ نے بریف کیس اٹھایا تو اس کا خیال تھا کہ اسے واپس اپنی جگہ رکھ دے گی۔۔۔۔۔ کیوں کہ اسے لگانے کی ضرورت تھی جو اس نے ایک چور کی طرح بریس کیس سے چرا کر اپنی ہی رکھ لیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے بریف کیس کو سرفراز کے سر ہانے رکھنے کے بجائے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔۔۔۔۔ گہرے سناٹے میں ریل کے پھولوں کی جو گڑ گڑا ہٹ گونج رہی تھی اس کے شور میں بریف کیس کے کسی چیز سے ٹکرانے کی آواز آئی اور پھر ڈوب گئی۔

عطیہ کی اس غیر متوقع حرکت سے وہ سناٹے میں آ گیا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وہ اس لمحے ایسا مبہوت ہوا جیسے اس کی نظروں کے سامنے موت کا فرشتہ آ گیا ہو۔ اس کی نظروں کو بالکل یقین نہیں آیا کہ ایک لڑکی ہی ہے جو اہرات کے زیورات سے بھرا ہوا بریف کیس اس سنگ و لی سے باہر پھینک سکتی ہے۔۔۔۔۔ اس بریف کیس میں جیسے ہی ہیرے جو اہرات نہیں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا ہے۔

اس لمحے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ عطیہ نے یہ حرکت کیوں کی۔۔۔۔۔؟ کس لئے کی۔۔۔۔۔؟ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔۔۔۔۔؟ وہ سرفراز سے کسی بات کا انتظام لینے پر تلی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اپنی ذات اور سرفراز کو قانون کے لمبے ہاتھوں سے بچانے کے لئے اس نے زہریلے سانپوں سے بھرا ہوا بریف کیس باہر پھینک دیا تاکہ دونوں ڈس لئے نہ جائیں۔۔۔۔۔ ان کی زندگی اجڑ کر ویران نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ جو ان زیورات سے کہیں قیمتی اور عزیز تھی۔۔۔۔۔ ایک عورت جو دنیا و رقبانی کا بیکہر ہوتی ہے۔

شاید عطیہ نے اس بریف کیس سے وہ لگانہ نکال لیا تھا جس میں ایسے کاغذات تھے جن کی مدد سے پولیس

انہیں گرفتار کر سکتی تھی۔ اس نے ایسا کوئی ثبوت اور نام و نشان رہنے نہیں دیا جو پولیس کے ہاتھ لگ سکے۔

اس کے دل میں فوری طور پر خیال آیا کہ کیوں نہ وہ زنجیر کھینچ کر گاڑی رکوالے تاکہ معاملے کی تفتیش ہو سکے۔ جہاں بریف کیس پھینکا گیا وہاں سے گاڑی نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ بریف کیس کو با آسانی تھوڑی ہی دیر میں تلاش کیا جاسکتا تھا۔ ورنہ دن کے اجالے میں اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو ایسی صورت میں زیورات کی بازیابی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔ جسے یہ زیورات ملین گے وہ اتنا احمق نہیں ہوگا کہ پولیس کے حوالے کر دے اور پھر اس دنیا میں اب ایمان داری اور فرض شناسی کہاں رہی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر ان زیورات کو پانے اپنا مستقبل تاننا کہ بے شک تھا۔ ان زیورات کو پولیس کے حوالے کرنے کا مطلب اپنے پیروں پر کھلاڑی مارنے کے مترادف تھا۔

اس نے اٹھنا چاہا تو اپنی جگہ سے بل بھی نہیں سکا۔۔۔۔۔ اس پر نیند اور کمزوری کا سا غلبہ کچھ ایسا تھا کہ وہ بے بس سا ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے اپنی پوری قوت جمع کی لیکن بے سود۔۔۔۔۔ سرخن کھانوں کا نشہ ایسا تھا کہ وہ اسے توڑ نہ سکا۔۔۔۔۔ اس کے بس کا روگ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی کارروائی کر سکے۔۔۔۔۔ اس لئے اس نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا لیکن ایک خیال آیا کہ عطیہ نے مجھے پونا اسٹیشن پر چائے پلائی تھی۔ اس میں کوئی نیند کی گولی تو نہیں تھی۔۔۔۔۔؟ ایسا لگا کہ اس کے باعث اس کی یہ حالت ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نے بھی ایسی کیفیت محسوس نہیں کی تھی۔۔۔۔۔ یہ شرارت عطیہ کی ہی تھی۔

وہ غصوں کی عالم میں عطیہ اور سرفراز کو باری باری دیکھ لیتا تھا۔ عطیہ تو واقعی گھوڑے سے بچ کر سو گئی تھی۔ جب کہ سرفراز پر بے ہوشی طاری تھی۔ اب اسے صبح سے پہلے ہوش نہیں آسکتا تھا۔ بے ہوشی کی دوائے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک سنسنی خیز ڈرامے کا آغاز ہوا وہ بھی اس کا ایک کردار رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کے ذمے جو فرض تھا اس کے پیش نظر اسے اپنا دامن آلودگی

سے بچا کر ان دونوں کو جو واقعی کسی ڈکیتی کے مرتکب ہوئے تھے۔ انہیں کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنی ذمے داری سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے وہ اپنی نیند سے نبرد آزما تھا اور اس کے خلاف متواتر جدوجہد کئے جا رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن غیندے لڑنا آسان نہیں تھا۔ وہ تختہ دار پر بھی آجاتی تھی۔

وہ دوسرے ایکٹ کا بے چینی سے منتظر تھا کہ جب سرفراز بیدار ہوگا اور اپنا بریف کیس نہیں پائے گا تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟ اس دوسرے ایکٹ کے آغاز کے لئے مجھے دو گھنٹے شدید کرب اور اذیت سے گزارنا تھے۔ جان لیوا انتظار کرنا تھا۔۔۔۔۔

سرفراز کی آنکھ رات کے پچھلے پہر کھلی۔

وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ اس وقت اس کی حالت قدرے بے ہوش تھی۔ وہ اس قدر نارمل ہو چکا تھا کہ آسانی سے کروٹیں لے سکتا تھا اور اٹھ بیٹھ سکتا تھا۔ توانائی بھی جیسے لوٹ آئی تھی۔ اب کمزوری نہیں رہی تھی۔ عطیہ نے اس کی چائے میں کچھ نہیں ملایا تھا۔ اسے عطیہ پر اس لئے شک ہوا تھا کہ اس نے سرفراز کی چائے میں بے ہوشی کا سفوف ملایا تھا۔ وہ کمزوری اور تنگی کے باعث نیند کے شدید غلبے میں آ گیا تھا۔ اس لئے بھی کہ دونوں سے جاگا ہوا تھا اور ایک کیس کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

سرفراز بیدار ہونے کے بعد بڑی دیر تک خلا میں گھومتا رہا اور نجانے کیا سوچتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مرتبہ سببی خیر مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس کا چہرہ تھوڑی دیر تک پات اور ہر قسم کے جذبات سے عاری رہا تھا جیسے اس کا ذہن بالکل ہی خالی ہو گیا ہو۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں ایک عجیب سی چمک لئے ہوئے تھیں۔

ایک نکتہ وہ اس طرح سے چونکا جیسے اس نے کوئی بیوت دیکھ لیا ہو۔۔۔۔۔ اس نے اپنا دایاں بازو کسی سانپ کی طرح سر ہانے لہرایا۔ پھر اس کے ہاتھ نے ادھر ادھر بریف کیس کو ڈھونڈا۔۔۔۔۔ اس کا وجود ہوتا تو اس کے ہاتھ سے نکراتا۔۔۔۔۔ جب اس کے ہاتھ نے بریف کیس کو

نہیں پایا تو وہ بدحواس ہو کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔۔۔۔۔ ٹائیگر نے اپنی آنکھیں ایک خیال کے زیر اثر بند کر لیں اور سوتا بن گیا۔۔۔۔۔ وہ سرفراز پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ رات پیش آنے والا ڈرامہ دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ جو نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔

اس نے چند لمحوں کے بعد کھسک پھر کی آوازیں سن کر آنکھیں کھول دیں۔۔۔۔۔ سرفراز۔۔۔۔۔ عطیہ کو چنکا کر بریف کیس کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بلدی کی مانند زور ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اس عالم میں سرفراز کا چہرہ بڑا ہی خوف ناک دکھائی دے رہا تھا۔ اگر اس نے برتھ کا سہارا نہ لیا ہوتا تو تیور اٹھا کر فرش پر گر پڑتا۔

ٹائیگر دل ہی دل میں عطیہ کے بے مثال اداکاری پر اس اشکراٹھا۔ وہ پچھلی پچھلی وحشت زدہ آنکھوں سے سرفراز کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ اس کا چہرہ متوحش تھا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے موتی بن کر دمک رہے تھے۔۔۔۔۔ اس نے سرفراز کا بازو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے وہ سرفراز کا سارا نہ ہوتی تو پیروں پر کھڑا ہوتا دشوار ہو جاتا اور گر پڑتی۔

یہ دوسرا ایکٹ بڑا بھرپور تھا اور کامیابی سے جاری تھا۔ عطیہ نے جیسے اداکاری میں ساری دنیا کی اداکاروں کو مات دے دی تھی۔

عورت واقعی بہت بڑی اداکارہ ہوتی ہے۔ اس سے کوئی جیت نہیں سکتا۔۔۔۔۔ ساتھ ہی دو دھاری تلوار بھی۔۔۔۔۔ جب اس نے کھنکھار کر اپنی بیداری کا احساس دلایا تو ان دونوں نے ایک ساتھ گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟ خیریت تو ہے۔۔۔۔۔!“

ٹائیگر نے باری باری ان کے چہرے دیکھ کر پوچھا۔ سرفراز اس کی برتھ کی طرف آیا۔ وہ ٹائیگر سے کچھ کہنا چاہتا ہوا حیران چہرہ اوپر اٹھایا۔۔۔۔۔ وہ ٹائیگر سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اس کے کپکپاتے ہونٹوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو اس نے اپنا سر برتھ کے کنارے ٹیک دیا اور سسک پڑا۔

ٹائیگر نے عطیہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ سرفراز کے پاس سے ہٹ کر آئی اور پھر اس نے کہا۔
 ”وسیم! انکل۔۔۔ خیریت نہیں ہے۔۔۔ ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔۔۔ ہم تباہ ہو گئے ہیں۔“
 ”آخر بات کیا ہے؟“ ٹائیگر نے اس کے چہرے پر نظر س مرکوز کر کے پوچھا۔
 ”انکل! انکل! ہمارا بریف کیس چوری ہو گیا ہے۔“ عطیہ نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔
 ”بریف کیس چوری ہو گیا ہے؟“
 وہ انجان بن گیا۔ اس نے حیرت اور دکھ کا اظہار کیا۔ اس نے دانستہ اپنی نگاہیں عطیہ کے چہرے پر مرکوز رکھیں۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”دیکھیے۔۔۔؟“
 ”سوئے میں خوشی چرا کر لے گیا۔“ عطیہ نے جواب دیا۔ ”سرفراز اور میں گہری نیند سو گئے تھے۔ چور نے ہماری گہری نیند اور غفلت سے فائدہ اٹھایا۔“ اس کی آواز بھرا سی گئی۔
 ”لیکن سرفراز نے اسے سر کے نیچے کھ کر تکیہ بنایا ہوا تھا۔؟“ ٹائیگر نے متعجب ہونے کی اداکاری کی۔
 ”چور نے اتنا بڑا بریف کیس سر کے نیچے سے نکال لیا اور یہ بیدار بھی نہیں ہوئے۔“
 ”معلوم نہیں رات بچھے کیسے اس قدر گہری نیند آگئی تھی کہ۔۔۔ چور کے میرے سر کے نیچے سے بریف کیس نکالتے وقت میری آنکھیں کھل سکی۔“
 سرفراز بے وقت تمام لرزیدگی سے بولی پایا۔ ”اس وقت بھی مجھ پر نیند کا ساغلبہ ہے جیسے میں نے خواب آور گولیاں کھائی ہوں۔ ایک نشہ مسخوں ہو رہا ہے۔“ اس نے سر کو جھٹک دیا۔
 ”کیوں ایسا تو نہیں کہ تم نے سونے سے قبل نیند کی گولی کھائی ہو۔۔۔؟“ اس نے دانستہ عجیب سا سوال کیا تھا۔
 ”نہیں۔“ سرفراز نے سر ہلایا۔ ”مجھے اس کی کیا ضرورت ہے کہ جو میں نیند کی گولیاں کھاؤں۔“
 ”شاید کسی ذہنی دباؤ کے باعث۔“ اس نے

کہا۔ ”آج ہر شخص کسی نہ کسی ٹینشن کا شکار ہے۔ چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا۔۔۔ امیر ہو یا غریب۔۔۔ اس لئے آج کل نفسیاتی مریضوں اور نفسیاتی اسپتالوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔“
 ”نہیں۔۔۔ مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے اور نہ ہی میں نے آج تک نیند کی گولی کھائی ہے اور نہ ہی اس کی شکل دیکھی ہے۔۔۔ اور اس کا نام بھی معلوم نہیں ہے۔“ سرفراز نے جواب دیا۔ ”مجھے ریل گاڑی میں نیند نہیں آئی۔ آج نہ جانے کیسے آگئی تھی۔“
 ”آج اس بریف کیس میں تھا کیا جو تم دونوں اس قدر پریشان نظر آ رہے ہو۔۔۔“ اس نے چیتیتی ہوئی نظروں سے سرفراز کی آنکھوں میں جھانکا۔ عطیہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔“
 سرفراز ٹائیگر کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے نظر س پیچی کر لیں اور اس کا چہرہ متحیر ہو گیا اور وہ اس کی بات کا جواب دینے میں چپکایا۔ سرفراز اسے اعتماد میں نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ تفصیل بتانے سے کس لئے گریز کر رہا ہے۔ وہ اس کی وجہ سمجھتا تھا۔
 چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے سرفراز کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے پرواہی سے اندھیرے میں تیر چلایا۔
 ”اگر اس بریف کیس میں کوئی خاص اور قیمتی چیزیں نہیں ہیں تو یہ سمجھو کہ جان و مال کا صدقہ گیا۔ بہت بڑی افتادیں گئی ہیں۔ لہذا وہ نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو تم لوگوں کی ہر مصیبت حل جائے گی۔“
 ”کیسا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی ریلوے اسٹیشن پر چوری کی واردات کی رپورٹ درج کرادیں؟“ عطیہ نے کہا۔
 ”رپورٹ درج کرانا ہے تو کرادیں۔۔۔ لیکن میری ایک بات نوٹ کر لیں کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔“ ٹائیگر نے مشورہ دیا۔
 ”دہ کس لئے انکل۔۔۔؟“ عطیہ نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا پولیس اس بریف کو تلاش یا بازیاب نہیں

کر سکے گی؟ اس لئے کہ رپورٹ درج کراتے ہی وہ فوراً اس کی تلاش شروع کر دے گی۔ صبح ہونے تک وہ مل جائے گا؟“
 ”اس لئے کہ پولیس کی کارکردگی بڑی سفر ہوتی ہے۔۔۔ کسی نو جوان لڑکی یا کوئی فائدہ مند چیز ہو جس سے ان کی جیبیں بھر جائیں تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں اور پھر وہ بڑی رقم کی طلب گار ہوتی ہیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔
 ”اور پھر تمہارا بریف کیس عام بریف کیس کے مقابلے میں بڑا اور بے حد قیمتی دکھائی دیتا تھا۔۔۔ اگر محض اس بریف کیس کی بازیابی کا مقصد ہے تو ریلوے پولیس میں اس کی رپورٹ کرنا فضول ثابت ہوگا۔ کیوں کہ جب تک بریف کیس تمہارے ہاتھ لگے گا تم اس کی صورت بھی پہچان نہ سکو گے۔ اس کا حشر نشر ہو چکا ہوگا۔“
 ”اس بریف کیس کے اندر جو کچھ بھی تھا کیا وہ پورا نہیں مل سکے گا۔؟“ عطیہ نے بڑی سادگی سے پوچھا۔
 ”اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر تائید کی۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ عموماً چوری ہونے والی چیزیں پوری طرح ہاتھ نہیں لگتی ہیں۔ کالی میسرز اس پڑا کمار کی ہیں۔ ان سے مال برآمد کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔“
 ”اب ہم صبر کر کے بیٹھ جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔۔۔؟“ عطیہ کی آواز اس کے گلے میں بندھ گئی۔
 ”میرے خیال میں اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔“ اس نے عطیہ کو دلا سادیا۔
 ”انکل آپ بجا فرماتے ہیں۔“ عطیہ نے گہری سانس لی اور اس کے چہرے پر کرب سا جھانک گیا۔ ”جب کوئی چیز ہمارے مقصد میں نہیں ہے تو ہم کب بھی کیا سکتے ہیں۔۔۔ جو چیز جانتا تھا وہ چلا گئی۔“
 ”تم سنی گئی ہو۔“ سرفراز نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ”اس بریف کیس میں نہ صرف ہمارے زیورات ہیں بلکہ بے حد اہم کاغذات بھی تھے۔ وہ کاغذات نہ ملے تو میں لٹ جاؤں گا۔ برآمد ہو جاؤں گا۔ میں زندگی بھر کہیں ملازمت نہیں کر سکوں گا۔“
 ”کیا تم یہ بات نہیں جانتے ہو کہ چوری ہونے

والی چیزیں آسانی سے دوبارہ ہاتھ نہیں لگتی ہیں۔۔۔ یہ ہندوستانی پولیس ہے۔ امریکہ یا یورپ کی نہیں۔“ عطیہ کہنے لگی۔ ”ذہنی کی بڑی بڑی وارداتیں آتے دن ہوتی رہتی ہیں۔ بینک اور بڑے بڑے ادارے لٹ جاتے ہیں۔ کیا کبھی چور یا ڈاکو چلا گیا۔ جو یہ کچرا جائے گا؟“
 ”تو کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر خاموش بیٹھ جائیں۔“ سرفراز نے تیز لہجے میں کہا۔
 ”تمہیں شاید اس پر بہت غم ہو رہا ہے کہ میرے زیورات چوری ہو گئے۔۔۔ میرے زیورات گئے تو یہ سمجھو کہ سر سے کوئی بڑی بلا مل گئی۔۔۔ زیورات کا کیا ہے۔ جب تم کمانے لگو گے تو اور بن جائیں گے۔“
 ”تم کیسی عورت ہو جو تمہیں اپنے زیورات کے چوری ہونے کا کوئی حصد نہیں ہو رہا ہے؟“ سرفراز تیز لہجے میں بول اٹھا۔ ”میں اتنی آسانی سے زیورات اور کاغذات کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔ میں ہارے ملک کی پولیس کو بلا کر دکھ دوں گا۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ مجھے پولیس سے نمٹنا آتا ہے۔“
 عطیہ نے اس کی نظرس بھرا کر سرفراز کی پہلی میں ایک ہلکا سا شہوک دیا تھا۔ وہ شاید یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اس بریف کیس کو چوری کا کیس مت بناؤ۔ ٹائیگر نے اس کا ٹھوکا دیکھ لیا تھا۔ ویسے اس نے جو بھی کہا اس کی باتیں سمجھ داری کی تھیں۔
 سرفراز اپنے آپ میں کہاں تھا۔ وہ بریف کیس کی وجہ سے غم و غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اگر اس کے علم میں یہ بات آجاتی کہ عطیہ نے بریف کیس کو ہا پر پھینکا تھا وہ شاید اس کا گلا دبا کر اسے چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیتا۔ اس نے عطیہ کے ٹھوکے کی کوئی پروا نہیں کی۔ اسے نظر انداز کر کے ہڈیانی لہجے میں کہا۔
 ”گاڑی روکو۔۔۔ زنجیر کھینچو۔۔۔“
 ”سرفراز اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ خود کا کاپو میں رکھو۔۔۔ معلوم نہیں بریف کیس کس اسٹیشن پر چوری ہوا۔“ عطیہ نے اسے سمجھایا۔

”تمہیں مشورہ دینے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں..... تم ایک بے وقوف عورت ہو۔“ اس کی آواز اونچی ہوئی۔

”تم ہوش سے کام لو غصے سے نہیں.....“ عطیہ نے ننگرا کی۔ ”غصہ ہمیشہ پشیمانی پر ختم ہوتا ہے۔“ سرفراز سے غم دھنے کی کیفیت اور بوکھلاہٹ میں ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں کہ ڈبے میں سوئے ہوئے سارے مسافر نیند سے بیدار ہو گئے۔ ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ وہ دونوں ایک تماشائیں گئے۔ لیکن عطیہ خود کو قابو میں کئے رہی تھی۔

گفتگو جتنکشن آنے والا تھا۔ مسافروں نے سرفراز اور عطیہ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی سوالات کی بوچھاڑ بھی کر دی تھی کہ اس بریف کیس میں کیا تھا۔ عطیہ ان کے سوالات کا جواب دیتی رہی تھی کہ اس میں سونے کا ایک لاکٹ اور سیٹ..... رقم اور ضروری کاغذات بھی تھے۔ مسافر عورتوں نے عطیہ کی بڑی دل جوئی کی۔ ایک عورت نے ان دونوں کے لئے تھرماس میں سے چائے نکال کر پیش کی۔ عطیہ نے چائے پی لی تھی۔ سرفراز نے نہیں پی۔ لیکن اس کی چائے ٹائیگر کو پینا پڑی۔ اس لئے کہ سرفراز کے انکار پر چائے اسے دے دی گئی۔

سرفراز کی حالت بڑی غیر تھی۔ ٹائیگر کے سمجھانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مسافر اپنی اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ جب گتنگل جتنکشن پر گاڑی کی روکیلوے پولیس اسٹیشن کے سپاہیوں کو بلا کر رپورٹ درج کرائی گئی۔ جب رپورٹ درج کرائی جا رہی تھی تو عطیہ کا چہرہ قہر ہوا تھا۔ اس پر سراپنگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کے بشرے سے اس کے دل کا خوف عیاں تھا۔ وہ اس کے پس منظر سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے اس نے آخری وقت تک مخالفت کی تھی اور سرفراز کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ رپورٹ کرانے کی اجازت نہ کرے۔ لیکن وہ باز نہیں آیا تھا اور اپنی ضد پر اڑ رہا تھا۔ لیکن عطیہ جانتی تھی کہ اگر بریف کیس

پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ سرفراز کی اپنی کھوپڑی تھی۔ اس لئے اس کی سمجھ میں عطیہ کی بات نہیں آئی تھی اور ہٹ دھرمی دکھاتا رہا۔ اس نے ان کے معاملے میں زیادہ دل نہیں دیا۔ عطیہ کے کہنے پر اس نے صرف ایک مرتبہ سرفراز کو سمجھایا تھا۔ وہ ایک خاموش تماشائی کی حقیقت سے ڈرامہ دیکھ رہا تھا جو بے حد دلچسپ، تجربہ انگیز اور سنسنیز اور قدم قدم پر چونکا دینے والا تھا اور اس کے اشتیاق اور تجسس میں لمحہ بے لمحہ بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا۔

جب پولیس نے رپورٹ درج کرتے وقت زیورٹ کی تفصیل پوچھی تو تب کہیں جا کر سرفراز کو ہوش آیا۔ عقل ٹھکانے لگی۔ وہ چکرایا اور گر بڑا سا گیا۔ پھر اس نے نے سنبھل کر عطیہ سے کہا۔ ”تمہی بتا دو۔“

”اس بریف کیس میں میرا ایک سات تو لے کا سونے کا سیٹ اور تین سونے کی جڑاؤ لٹکھٹیاں تھیں۔“ عطیہ نے بتایا۔

”آپ کو اس کی مالیت کا کچھ اندازہ ہے.....؟“ پولیس افسر نے دریافت کیا۔

”جی نہیں.....“ عطیہ نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”میرے والد نے جینر میں دیا تھا۔ والدین مالیت نہیں بتاتے ہیں۔“

”اس بریف کیس میں میرا ایک سات تو لے کا سونے کا سیٹ اور تین سونے کی جڑاؤ لٹکھٹیاں تھیں۔“ عطیہ نے بتایا۔

”آپ کو اس کی مالیت کا کچھ اندازہ ہے.....؟“ پولیس افسر نے دریافت کیا۔

”جی نہیں.....“ عطیہ نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”میرے والد نے جینر میں دیا تھا۔ والدین مالیت نہیں بتاتے ہیں۔“

”اس بریف کیس میں اور کیا کیا چیزیں تھیں..... رقم کتنی تھی.....؟“

”ان کے میرے نقلی اسناد..... رقم پانچ ہزار تھی۔“ عطیہ بولی۔

عطیہ نے بڑی غلط بیانی سے کام لیا تھا تاکہ پولیس کو غلط راہ پر ڈالا جاسکے۔ پولیس کے اس بریف کیس کو پانے کی صورت پر ان پر آج نہیں آسکتی تھی..... جب کہ بریف کیس میں موجود زیورٹ کی مالیت لاکھوں کی تھی۔ جب اس میں ہندوستانی کرنسی نہیں بلکہ امریکن ڈالر تھے۔ اس نے کاغذات، ڈالر اپنے لپٹی میں رکھ لئے تھے۔ اس نے پولیس کو بڑی خوب صورتی سے بے وقوف بنایا تھا۔ اس نے چپ سا دھ لی۔ کیوں کہ ابھی اس

ڈالر سے کا ڈراپ سین کا وقت نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی موقع تھا۔ اس نے واقعات پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی اور جلت پسنی کا مظاہرہ کر کے حالات کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ماحول بڑا پر اسرار ہو گیا تھا۔ جس نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔

جیسے گاڑی روانہ ہوئی عطیہ کی جان میں جان آئی..... اس نے فوراً ہی اپنی گھبراہٹ اور سراپنگی پر قابو پایا تھا اور وہ پہلے کی طرح نابل ہوئی تھی..... کسی خیال کے تحت اس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم ابھرنے لگا تو اسے دہانے اور اس کی نظروں سے چھپانے کے لئے وہ کھڑکی سے گردن نکال کر باہر جھانکنے لگی اور دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی۔

عطیہ کی اس حرکت نے ایک بار پھر سے اسے

چونکا دیا۔ جب وہ اس کے معنی خیز تبسم کے بارے میں سوچنے لگا تو اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندائن کر لپکا۔

اب اسے پوری طرح یہ اندازہ ہو گیا کہ عطیہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے..... وہ کسی بھی جرم پیشے سے دو ہاتھ آگے ہے۔ وہ اس عیار لڑکی کی سازش اور گہری چال کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکا تھا۔ اب اس کی نظروں کے سامنے اندھیر اور پردہ نہیں رہا تھا۔ سارے پردے ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے تھے۔ اب اس کا اصل چہرہ سامنے آ گیا تھا۔

عطیہ نے جو بریف کیس چلتی رہی گاڑی سے باہر پھینکا تھا وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی تھا۔ اس نے جس جگہ بریف کیس پھینکا تھا وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پہلے ہی سے اس کا کوئی سامی موجود ہوگا۔ ورنہ اس قدر قیمتی ہیرے جو اہرات کے زیورات کو اتنی بے دردی سے باہر کون پھینک سکتا ہے۔

سرفراز کے یہ سارے زیورات تھے۔ ظاہر ہے کہ اس نے کسی جیولر شاپ میں ڈاکہ مار کر حاصل کئے ہوں گے۔ ایک گھر سے اتنے سارے زیورات مل نہیں

سکتے..... چاہے وہ کروڑ پتی ہی کیوں نہ ہوں..... یہ بھی ممکن تھا کہ سرفراز نے دتین جگہ ڈکیتی کی واردات کی ہو۔ لیکن اس بریف کیس میں صرف زیورات تھیں۔ رقم نہیں تھی..... جو کہ وہ ڈاکہ کی صورت میں جسے عطیہ نے اپنے لپٹی میں رکھ لی تھی۔ اگر مزید رقم ہوتی تو وہ یقیناً اسے اپنی لپٹی میں رکھ لیتی۔

دوسری جانب عطیہ نے سرفراز کے اہم ضروری کاغذات، پاسپورٹ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ اپنے قبضے میں کر لئے تھے شاید اس لئے کہ سرفراز اسے بیچ منہ ہار میں چھوڑ کر ملک سے فرار نہ ہو جائے۔ اب وہ آسانی سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔

سرفراز کی ذہنی حالت بڑی ابتر تھی۔ ٹائیگر نے اس سے کہا۔

”تم اپنا دل خراب نہ کرو..... جو کچھ بھی ہوا تمہاری غفلت سے ہوا۔“

”انگل.....! میں یہ کبھی ہوں کہ دی کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔“ عطیہ نے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا..... فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں..... اس میں اس کی یقیناً کوئی مصلحت ہوگی..... وہ اس سے دگنا بھی دے سکتا ہے..... بشرط یہ ہے کہ اس کی ذات پر توکل اور صبر کیا جائے۔“

ایک عمر رسیدہ مسافروں میں جو دوسری طرف بیٹھے تھے۔ وہ سرفراز کی دل جوئی کی غرض سے آگئے تھے۔ ان میں سے ایک نے عطیہ کی بات سن کر کہا۔ ”جزاک اللہ بیٹے..... آفرین ہے تمہاری بیوی پر یہ کس قدر حوصلہ مند اور صابر ہے۔“

ان بزرگ کی اہلیہ نے سرفراز کے سر پر مشفقانہ انداز سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بیوی ٹھیک کتنی ہے..... اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے..... زیادہ غم زدہ اسے ہونا چاہئے تھا..... اس نے اتنا اثر اور صدمہ نہیں لیا جتنا تم لے رہے ہو.....“

(جاری ہے)

قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

بہت بے کیف لمحے ہیں عجب بوجھل ساجیوں ہے
نغم سے دل بہلتا ہے، نہ خوشیاں اس آتی ہیں
(بلقیس خان.....پشاور)

میں کھلونا ہوں مجھے ہاتھ مت لگاؤ تم
کسی شوکیں میں رکھ کر مجھے سہالو تم
میری آنکھوں میں کبھی دیکھو بھی
میرے چہرے پر کبھی پیاری سی نظر ڈالو تم
(عثمان غنی.....پشاور)

نہ ستاؤ ہمیں ہم ستائے ہوئے ہیں
جدائی کا تیری ہم غم اٹھائے ہوئے ہیں
کھلونا سمجھ کر ہم سے یوں نہ کھیلو دوست
ہم بھی تو اسی خدا کے بنائے ہوئے ہیں
(نوش خان.....کوٹ مظفر علی)

بے ربط خیالات کی دنیا سے نکل جا
تو ساتھ زمانے کے کسی روز بدل جا
بے نام انگنوں کا سہارا نہ لیا کر
کر دفن تمناؤں کو اس طور سنبھل جا
(محمد ارشد آصف.....وال بھراں)

ہم ہر شب تمہارے ہجر میں تڑپا کرتے ہیں
ہر بل تمہارے ملنے کی فریاد کرتے ہیں
چلے آنا جب کبھی کسی شب خیال آئے ہمارا
ہم ہر روز، ہر سانس سے پہلے تمہارا انتظار کرتے ہیں
(راولہ باسط مظہر.....گوجر خان حامد تھنگی)

زندگی کے حسین سفر میں انسان بدل جاتے ہیں
ساتھی زامن چھڑا کے کہیں دور نکل جاتے ہیں
پہلے دل جیتے ہیں تو باتوں باتوں میں
بے دردی سے چھوڑتے ہیں جب دل بہل جاتے ہیں
نفرت کی آندھیاں آتی ہیں قدم قدم پہ حسنِ علم

پھر بار بار محبت کے کنارے دہل جاتے ہیں
(محسن عزیز اینڈ حلیم.....کوٹھاکاں)
کچھ ایسے حادثے زندگی میں ہوتے ہیں فراز
کہ انسان سچ تو جاتا ہے مگر زندہ نہیں رہتا
(افشاں رمضان.....سرگودھا)

جس طرف نظر کروں اسی کا پر تو ہے
وہ میرے دھیان کے سب راستوں میں رہتا ہے
پھنجر کر اس سے پریشان بہت ہوں میں بھی
نا ہے وہ بھی بڑی الجھنوں میں رہتا ہے
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہیار)

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا ہی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی
(نسیم انجم.....نگل پور)

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
(مس فوزیہ کنول.....نگل پور)

انگھار ہم کریں کہ ادھر سے ہو ابتدا
برسوں گزر گئے ہیں یہی سوچتے ہوئے
(محمد اسحاق انجم.....نگل پور)

رب تجھے عروج ایسا نصیب کرے
کہ ہر شخص تیرے نصیب پر فخر کرے
ہر موڑ پر ہوں فرشتے ساتھ تیرے
ہر غم میں حفاظت تیری خدا کرے
(نورین اعظم.....راولپنڈی)

یہ چاہئیں یہ پذیرائیاں بھی جھوٹی ہیں
یہ عمر بھر کی شیشائیاں بھی جھوٹی ہیں
تمام الفاظ و معانی بھی جھوٹی ہیں
ہمارے عہد کی سچائیاں بھی جھوٹی ہیں
(انتخاب آسٹر)

دل پر شوق کو پہلو میں دبائے رکھا
تجھ سے بھی ہم نے تیرا چھپائے رکھا
جانے کس حال میں ہیں کون سے شہروں میں ہیں وہ
زندگی اپنی جہنمیں ہم نے بنائے رکھا
(انتخاب: محمد نوید انجم.....سوحا، و، چکوال)



کرتے ہیں بات گرمی بازار دیکھ کر
ہم بیچے بھی ہیں خریدار دیکھ کر
اپنے کئے پہ آج پشیمائیں ہوں مگر
دل دے دیا تھا اس کو طلبگار دیکھ کر
اس دیں کا تو ہی نگہاں اے خدا!

دل ڈر رہا ہے وقت کے آثار دیکھ کر
بھٹکے ہوئے ہیں آج بھی منزل سے اپنا وہ
جو رک گئے تھے سایہ دیوار دیکھ کر
لب کھولنے سے پہلے ہی خاموش ہو گئے
آنکھوں میں اس کی صورت انکار دیکھ کر
دنیا سمجھ رہی تھی جسے بے وفا حکیم
وہ رو پڑا تھا مجھ کو سردار دیکھ کر
(حکیم خان حکیم.....کال پور موسیٰ)

ساتھ دے نہ سکے میرے غمگسار کبھی
تجھ سے کیا کرتے تھے ہم پیار کبھی
ٹوٹتی ہے تیرے وعدوں کی زنجیر اب
سکون کی لہر آتی نہیں پس دیوار کبھی
پلٹ کے لی نہ خبر تو پھر میری کبھی
پائے نہ ہم نے خوشی کے آثار کبھی
خوش ہیں ہم بھی گزرے دنوں کی طرح
دفا کرتے نہیں ہیں آج کل کے یار کبھی
جان کے ساتھ رہتی ہے غم کی مجبوری جاوید
اثر دیکھا نہیں ہم نے پھولوں کے پار کبھی
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

چلو یونہی سہی، چلو تو سہی کچھ بل ساتھ ہمارے
پھر بھول جاتا ہے شک کہ کبھی ہم تھے تمہارے
زندگی میں اکثر راہبر بن جاتے ہیں راہزن

ہم ایسے سادہ کے پھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں سہارے
اپنے اعمال ہی ملتے ہیں سدا مصیبت کی صورت
اور ہم کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم مصیبت کے مارے
ہم کو تارہ نظر، کم بہت، ہم بے شعور
چھوڑ دیا خود کو ہم نے ہر موج کے دھارے
حوصلہ کہاں ہم میں طوفانوں سے ٹکرائیں
بس چلتے رہتے ہیں ہم تو کنارے کنارے
(احمدی رہاب.....فیصل آباد)

تیری یاد جو سینے سے لگا رکھی ہے
ہم نے دنیا میں الگ دنیا بنا رکھی ہے
ہم کو معلوم نہیں چاہت کے تقاضے لیکن
ہم نے تیری باتوں کے سوا ہر بات بھلا رکھی ہے
سفر مشکل ہے معلوم ہے لیکن
تو ہمارا ہے تو ہر فکر مٹا رکھی ہے
تو بھلا دے تو بھلا دے لیکن ہم نے
تیری خوشبو بھی تعویذ بنا رکھی ہے
تو الگ ہو تو ہر بار یوں لگتا ہے
زندگی موت کے پہلو میں بٹھا رکھی ہے
تیری باتیں تیرا لہجہ تیرا چہرہ ہم دم
تجھ میں خالق نے ہر چیز جدا رکھی ہے
(میر نوید شاہ شامی.....ٹنڈو جام)

آج بھی تجنی وحب کا صحر!.....
تیرے نرم لبوں کی شبنم.....
سائے سے محروم رہا.....
آج بھی پتھر، جبر کا کلو صدیوں سے بے خواب رتوں کی
آنکھوں کا منہ بوم رہا.....

آج بھی اپنے وصل کا تارا.....
راکھ اڑاتی شوقِ شفق کی منزل سے معدوم رہا.....
آج بھی شہر میں پاگل دل کو.....
تیری دید کی آس رہی.....
مدت سے گم گم تہائی، آج بھی میرے پاس رہی

آج بھی شام اداس رہی۔۔۔۔۔

آج بھی شام اداس رہی۔۔۔۔۔

(انتخاب نرہ پاسبان مظہر..... گوچر خان دھام جھنگی)

وقت رخصت میں تیرا مجھ سے لپٹ جانا
لیکن پھر وہ ارادہ سا بدل جانا
میرا کہنا کہ کیسے گزریں گے پل
تیرا کہنا کہ مجھے بھول جانا
وہ میرا پھر سے ملنے کی تمنا کرنا
روتے روتے تیرا اچانک سنبھل جانا
کیسے بھولوں گا میں وہ گزرے ہوئے پل
کبھی لڑنا جھگڑنا محبت سے اور وہ تیرا مجھے منانا
تیری آنکھوں میں سر رکھ کر سو جانا
اور تیری آنکھوں کے سمندر میں کھو جانا
میں نہ کہتا تھا کہ محبت دکھ دے گی نوری
تیرا کہنا کہ محبت ہی تو ہے جنت جاناں
(غلام نبی نوری..... کھڈیاں خاص)

کیوں آنکھ بھری بھری ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے؟
نہ لبوں پہ ہنسی ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے
کہیں دل پریشاں تو نہیں؟
کہیں لبوں پہ کوئی صدا تو نہیں؟
کہیں بجا کوئی دیا تو نہیں؟
شائیں لٹی لٹی ہیں ہوا تو کچھ خیر ہے؟
کہیں ہوا کوئی خفا تو نہیں؟
کہیں ادھوری کوئی دعا تو نہیں؟
کہیں پھول کوئی لٹا تو نہیں؟
نہ موسم میں تازگی ہے ہوا تو کچھ خیر ہے؟
کیوں آنکھ بھری بھری ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے؟
(مس فوزیہ کنول..... منڈی کلن پور)

وہ حسن مجسم کمال اس کی آنکھیں
سرایا محبت جمال اس کی آنکھیں
جھکائے تو گنت ہیں زیور حیا کا

اٹھیں تو کریں پھر سوال اس کی آنکھیں
ملیں تو میں دو جہاں دے کے لے لوں
وہ چہرہ وہ آنکھیں وہ زلفیں
اگر کوئی پوچھے کہ دنیا میں کیا ہے
دنیا دیوانہ کہے گا مثال اس کی آنکھیں
(افشاں رمضان..... سرگودھا)

یہ کیسی ہجرتیں ہیں موسموں میں
پندے بھی نہیں ہیں گھونٹوں میں
بھڑک اٹھیں گے شعلے جنگلوں میں
اگر جنگلوں بھی چکے جھاڑیوں میں
بہت تنہا ہے وہ اونچی حویلی
میرے گاؤں کے کچے گھروں میں
(عروج مایین ط..... سرگودھا)

یہی سوچا ہے اب میں نے اس سے پہلے کہ میں مرجاؤں
سا جاؤں نگاہوں میں ترے دل میں اتر جاؤں
میں کوئی کوئی سی رشتی تھی آئینے سے خفا ہو کر
تیرے آنے کی آہٹ ہے کہ شاید اب سنو جاؤں
میں درد لا دوا پاکر مسیا بن گئی سب کی
دشمن بھی نہ بھولے گا کچھ ایسے کام کر جاؤں
عجب یہ معاملہ ہے جو دھڑکن بن گیا میری
لودہنی نگاہوں میں جو دیکھوں رنگ اپنا تو ڈر جاؤں
تو سر بلند ہو کر دغاؤں کا ہنر پاکر اوج گام تک پہنچے
میں بن کر اب دعا تیری فلک تک بے بال و پر جاؤں
کہ ذاتوں کی مسافت نے تھا کا ڈالا شقیں مجھ کو
سب تاریک ہے لیکن پلٹ کر کس کے گھر جاؤں
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہار)

ہم خون تمنا کرتے رہے معصوم اشارہ ہو نہ سکا
چلن تو اٹھی ہم لیکن افسوں نگارہ ہو نہ سکا
تخیل تمنا کی خاطر ہم ذوق پرست بھول گئے
یہ وحشت دل یہ جوش جنوں افسوں گوارا ہو نہ سکا

یہ حسن مکمل کیا کم تھا، پھر دل کے بھی مالک بن بیٹھے
دل ہی نہ رہا تھا کہنے میں یوں اس سے کنارہ ہونے سکا
یوں جام پلائے ساتی نے ہر رعد نے پی خوش ہو کر
کل بزم میں میری جانب ہی ساتی کا اشارہ ہونے سکا
اف بھر کی تہارا توں میں یہ ساتھ بھی اپنا دے نہ سکا
غم مجھ کو پیارا ہو تو گیا میں غم کو پیارا ہو نہ سکا
ساحل پہ کھڑے کچھ کہتے رہے یہاں کشی منہ ہار میں تھی
موجوں نے لیٹا ہنس ہنس کر لفظوں کا سہارا ہو نہ سکا
آ آ کے ترپتی ہے بجلی امتیاز بہار گلشن پر
ہم چھوڑ کے ایسی حالت میں جائیں گے گوارا ہو نہ سکا
(ایس امتیاز احمد..... کراچی)

یہ شب فراں، یہ بے بسی ہے قدم قدم اور یہ اداسیاں
میرا ساتھ کوئی نہ دے سکا میری حسرتیں ہیں دھواں دھواں
میں جو تپ تپ کے جاتا تو میرے خواب مجھ سے بچھڑ گئے
میں اداس ٹھہر کر صدا سنی مجھے نہ دے کوئی بھی تسلیاں
یہ فضا جو گرد و غبار لئے میری بے کسی کا حزار ہے
میں وہ پھول ہوں نہ جو کل سکا میری زندگی میں دغا بیاں
چلی ایسی درد کی آندھیاں میرے دل کی بستی اجڑ گئی
یہ راکھ ہے بھی بھیجی اس میں ہیں میری نشانیاں
(محمد وارث آصف..... وال بھگوان میاٹوالی)

سوچوں گا اک عجب سا نثر دے گیا مجھے
جاتے ہوئے وہ کیسی سزا دے گیا مجھے
لے کر وہ مجھ سے چاہتوں کے ان گنت چراغ
پلکوں پہ اک چمکتا دیا دے گیا مجھے
کس بات پہ خفا ہوا درویش آج صبح
چھینے کی جاتے جاتے دعا دے گیا مجھے
سپنوں کی راکھ دل کا دھواں آرزو کی لاش
تخفے وہ کیسے کیسے جیش بہا دے گیا مجھے
راہوں میں جس کی پھول بچھاتا رہا ہوں میں
آیا جو وقت وہ بھی دعا دے گیا مجھے
اجاز بندگی تو فقط اک خدا کی تھی

لیکن زمانہ کتنے خدا دے گیا مجھے
(بیشرا عجاز..... جگنہ معلوم)

مجھے تلاش ہے اس کی جو صرف میرا ہو
میرا نصیب بنے میرے دل کے پاس رہے
میرے قریب ہو اتنا کہ سانس رک جائے
مجھ کو چاہے ہنسائے ستائے..... پیار کرے
وہ میری مانگ سچائے مجھ ہی کو وہ بھلائے
میں سوچتی ہوں کہ میری دغا کا شہزادہ
کہیں تو ہوگا زمانے کی بھیڑ میں کھویا
کبھی تو میرے لئے اس کا دل تڑپے گا
کبھی تو پیار کا شعلہ لبو میں بھڑکے گا
(نوشین خان..... کوٹ مظفر علی)

سمندروں کے موتی ہو تم ساطلوں پر رشتی ہو باجی
دل میں بستی ہو تم، دعاؤں میں رشتی ہو باجی
خوشبو کی طرح ہواؤں میں رشتی ہو تم
دھوپ ہو تم مگر چھاؤں میں رشتی ہو تم
جسم میں رشتی ہو، رحوں میں رشتی ہوں تم
بھگوان بن کر دیوتاؤں میں رشتی ہوں تم
قسمت کی دہنی ہو اس قدر تم
ہماری ہی نہیں ہاشم بھائی کے دل کی بھی رانی ہو
(عاصمہ رمضان..... پنڈا دھان)

کس سمت ہے مگرا میرا
ختم ہوتا نہیں سفر میرا
ہر طرف دشتوں کے سائے ہیں
جانے کون سا ہے گھر میرا
اک بے نام سی اذیت میں
زندگی کھو گئی مسافت میں
کیا کردار ہے کہانی میں
زندگی جل رہی ہے پانی میں
(سہیل مایین ط..... سرگودھا)

☆☆



بدعا

راجندر سنگھ بیدی

نوجوان پر اچانک ایک اذیت ناک بیماری کا غلبہ ہوا اور وہ بیماری نوجوان کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ اس بیماری سے اس کا پیلا پڑ سکتا ہے اور کوئی اور بھی یقین کر سکتا تھا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔۔۔۔۔

معاشرتی حقیقت کو اجاگر کرنے والے معروف رائٹر کے قلم سے ایک دلگداز اور حساس تحریر

ابھی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اوپر تلے تین آوازیں سنائی دیں:
"آج پھر پینشن گیر یا الوہیں کے!"
"ارے چولہا ہی سلگایا ہوتا۔"
"اور نہیں تو بھئی ہی نکال لی ہوتی۔"
اور تینوں آوازیں ایک ہی آوی کے منہ سے نکلیں۔
ہوئی معلوم ہوتی تھیں جن کا جواب خاموشی کے سوا اور یہ آوازیں مانی کوٹھی سے آرہی تھیں۔ زمین

کچھ کہتے کہتے رہ جاتا
اور رکتے رکتے کہہ جاتا
یہ پیار تو ایسا ہوتا ہے
جو دل میں درد سوتا ہے
اب بھگی بھگی شاموں میں
اک چہرہ ہر پل آنکھوں میں
ہنستا بھی ہے، روتا بھی ہے
دل میں درد ڈھبنا بھی ہے
پھر نظروں سے کھوجاتا ہے
اور خوابوں کو مہکاتا ہے
کہ اک احساس مٹانے کو
کہ دل میں درد پسانے کو
ہر دھڑکن میں، ہر آنکھ میں
کہ جھپٹے ہاتھ کے ٹکٹن میں
یہ رنگ نظر بس آتا ہے
ایسا اکثر ہو جاتا ہے
دل کا داغ اٹوٹکا ہے
خانم یہ سب تو دھوکا ہے
(فریدہ خانم..... لاہور)

گفتگو کر نہ پاگوں والی
(قدیر رانا..... راولپنڈی)

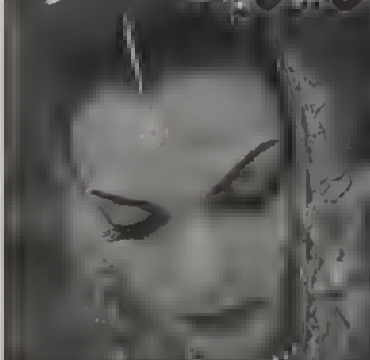
گینو چمک رہے ہیں
گینو چمک رہے ہیں
پلوں کے یہ ستارے
سو چمک رہے ہیں
ٹھٹھکیں ہے رقص
ٹھٹھکیں چمک رہے ہیں
سب زخم بن کے میرے
خوشبو، چمک رہے ہیں
آنکھوں میں کب یہ عطر
آنسو جھلک رہے ہیں
(رانا حنیف عطر.....)

کوئی ہار گیا کوئی جیت گیا
سال بھی آخر بیت گیا
تجسسی سینے سبائے آنکھوں میں
سبھی بیت گئے بل باتوں میں
کچھ تلخ لمحات بھی تھے
کچھ حادثے اور صدمات بھی تھے
پر اب کے برس اے دوست میرے
میں نے رب سے دعا یہ مانگی ہے
کوئی بل نہ تیرا اداس گزرے
کوئی روگ نہ تجھے داس گزرے
تو پھولوں کی طرح کھلا کرے
کوئی شخص نہ تجھ سے گلا کرے
میں نے رب سے دعا یہ مانگی ہے
کوئی بل نہ تیرا اداس گزرے
کوئی روگ نہ تجھے داس گزرے
تو پھولوں کی طرح کھلا کرے
کوئی شخص نہ تجھ سے گلا کرے

ان کی تشبیہ ہو گئی قمر
میں نے شعروں سے پائی رسوائی
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..... ملتان)

جب ملاقات ہے ارادہ تھی
اس میں آسودگی زیادہ تھی
نہ توقع، نہ انتظار نہ رنج
صبح بھرا نہ شام وعدہ تھی
نہ تکلف نہ احتیاط، نہ غم
دوستی کی زبان سادہ تھی
لعل سے لب چراغ سی آنکھیں
ناک ستواں، جبیں کشادہ تھی
حدت جاں سے رنگ تانا سا
ساغر افروز، موج بادہ تھی
زلف کو ہنسی کا دعویٰ تھا اس کے لہجے میں ایک مستی ہے
پھر بھی خوش، قاتمی زیادہ تھی اس کی باتیں سنوڑوں والی
اپرا تھی نہ خود تھی نہ پری آپ اپنا خیال کر رانا

بی بی



Price : 300/-

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں گھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں برخواہن کا اپنا ہنر، لبقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک پیشکش ہونے کے ناٹے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پرنکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تک و درد محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ محنت مند رہنے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دار لکھتے

قدانی بارکیشٹ اردو بازار لاہور

اپنے چھپوان کی نے کو چار پائی کے نیچے پھنسا دیا۔ نور نے روٹی کا لقمہ سائن ہی میں رہنے دیا اور ہاتھ ہاتھ پر لے جاتے ہوئے بولا: ”بابو جی! سادہ سلام (صاحب سلامت)۔“

”سلام!“ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا، ”ارے یار تم لوگ بالکل چوروں کی طرح یہاں آ چکے۔“

”اور کیا وف تھوڑے ہی بجاتے۔“ جہاں نے خلاف توقع مسکراتے ہوئے کہا۔ دراصل ہونٹوں بلکہ مونچھوں کا یہ خوشگوار پھیلاؤ اور ماتھے کے ناگوار شکن بل جل کر ظاہر کرتے تھے کہ اس مسکراہٹ میں مسکراہٹ کم ہے اور رشوت زیادہ۔۔۔ تاکہ اس کے اجلے سے جواب کا برائے مذاق۔

”شاید میں تمہاری کچھ مدد کرتا۔“ میں نے کہا اور میانی کٹھڑی کے چاروں اردو سوالیہ نشان بن کر مجھے گھورنے لگے۔ میری نے ان شرمندہ نقل سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا: ”مثلاً میں چوہدری کو کہہ کر یہاں سپیدی ہی کروا دیتا، اور نہیں تو کرائے میں ہی رعایت ہو جاتی۔“

اب یہ بات واقعی قابل غور تھی۔ جہاں اور نور سوچنے لگے۔ سادہ لوح نور اپنے پیڑے سے واقعی کمون سانظر آ رہا تھا لیکن جہاں ابھی تک دل میں کہہ رہا تھا: ”میر لوگ کتنے چالاک ہوتے ہیں۔“ یہ مجھے ہی بتا دیا ہوتا۔ اندازاً ہی وقت اختیار کرتے ہیں جب کسی کی نکل اپنے آپ منڈھے چڑھ جاتی ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ انہیں تو ان لوگوں کا یہاں آنا کبھی بھی برواشت نہ کرتا۔ وہ فلسفے کا طالب علم تھا۔ راسخ کاظمی تھا۔ بالوں میں تیل کم لگاتا جس کی وجہ سے بال، ہمیشہ سیاہ گوش کے کانٹوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہتے اور دوسرے کو اتفاقاً چھو جانے سے اس کی سزا دیتے۔ کچھ ان کے جھٹھے اور ٹھٹھکے لالے پن سے پتا چلتا کہ ملکہ سہا کی نسل سے ہیں۔ وہ فلسفے کے طالب علم ہونے کی وجہ سے دوسروں کے لئے مجسم شر

سٹرہیاں پھیلا گئے والا خوبرو اور ڈرپوک جو چند ایک لقمے زہر مار کر رہا تھا۔

جہاں ایک جبر تسمہ پاتھا جو ہر وقت نورے کی گردن پر سوار رہتا۔ مثلاً: چوہا سلگائے تو نور آٹے میں سے بھوسی نکالے تو نور، برتن مانجھے تو وہی اور جو کھنگالے تو وہی۔ میاں جہاں بھی بچھائی پر آ لیٹے اور کچی پکائی کھائے تو وہ بھی گویا نورے پر احسان کرے۔ میں اور میرا ساتھی اسٹین ان کی قبر تک سے واقف تھے۔ اس سے پہلے یہ برادر تعلیم الفرقان والوں کے پیچھے رہتے تھے جہاں ایک سفلی بنگالن ہمیشہ اوپر کی چھت سے گوبھی کے ٹٹھل، پیاز کے جھلکے، پھلیاں یا بچا کھچا بھات ان کی منڈھیا پر پھینک دیتی تھی اور یہ ہمیشہ موٹی موٹی گالیاں دیا کرتے تھے۔ وہاں بھی نور دیکھے ہی جہاں کا تیل تھا۔

آخر ایسا کیوں تھا؟ یہ بھی اسٹین اور میرے دوسرے ساتھی کھی بار سوچتے لیکن ہمیں آخر دم تک پتانہ چل سکا۔ البتہ نورے کی حرکات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اکثر خطا اٹھایا کرتے۔ نور سخت جذباتی آدمی تھا۔ اس کے جذبات کا خزینہ کانوں اور آنکھوں کے اس قدر قریب تھا کہ ادھر کانوں سے بات سنی اور ادھر سادوں بھادوں کی جھڑی ہے کہ لگ رہی ہے، چھما چھم، چھما چھم، اور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی، تاوقتیکہ زمین میں کوڑیاں نہ وہائی جائیں یا کوٹھے کے منڈ پر پڑے تھوڑوں کا ایک بڈھانہ کھڑا کیا جائے۔ بس اس کے جذبات کے خزانے کو ذرا چھیڑنے کی ضرورت تھی۔ یا پھر اس کے ماضی کی راکھ میں چند اور کوٹھے تھے جنہیں وہ اکثر موقع بے موقع اٹھاتا تھا۔ ہوتا اور جنہیں سر و کرنے کے لئے وہ آنسوؤں کا سیلاب بہا دیتا۔ ہمیں اس لم دھڑکنے، چھ فٹ لے، منڈھیا میں ہمیشہ کمر کمان کر کے چلنے والے انسان کو رلا کر مزا آتا تھا۔

میں تین چار سٹرہیاں اتر کر عین نیم کے چھتے کے مقابل کھڑا ہو گیا اور کہا: ”اے نورے!“

میاں جہاں اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا، تعظیم! اور

دور پہلی چھت کے درمیان ایندھن اور قروعات رکھنے کے لئے جو جگہ تھی وہاں میں نے کٹڑی کے پشتوں اور چند ٹوٹے ہوئے کواڑوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ واللہ! علم وہ پتھر اور کواڑ ہی بولنے لگے تھے۔ ان دونوں میں کسی خاص مقصد کے پیش نظر پریوں کی کہانیاں پڑھ رہا تھا اور پھر آپ جانتے ہیں کہ دیو پری کے قصے پڑھنے کے بعد کیا کیا دنیائے ممکنات ہے جو آپ کے سامنے کھلتی ہی چلی جاتی ہے۔

پہلی شخصیت پر ہم کالج کے چند چھوکرے اکٹھے رہتے تھے۔ بانی کے کم بخت یا تو گرینڈ کیرے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور یا پھر بین الصوبائی میچ وینچ وکھنے گئے ہوں گے۔ اس وقت ان میں سے وہاں ایک بھی نہیں تھا۔ میں نے ہمت جمع کی اور قدم آگے بڑھایا۔ روشنی واقعی میانی کٹھڑی سے آ رہی تھی۔ ایک عارضی سا دیا جرم سلور کی ایک کنوری میں مسروس کا تیل اور بتی ڈال کر اور اسے آنکروں رکھ کر جلا دیا تھا، جس میں سے ایک کالی لاث اٹھ کر اوپر کی دیواری تختی کو سیاہ کر رہی تھی۔ کالے کالے پھول تختی کے ساتھ چپٹ رہے تھے اور کچھ دیر کے بعد کنوری کے اندر باقی پر گرتے۔ بتی مدھم مدھم گھٹنمانے لگتی، لیکن پھول پھرتی کا حصہ ہو کر جلنے لگتے۔ قریب ایک شخص چار پائی پر لیٹا ہوا ایک میلے کیلے جیتھروں لیٹے چھپوان کے خش پر کش لگا رہا تھا۔ بڑا پسند تھا اسے اپنا چھپوان:

”ہم کو اپنی گڑ گڑی اور چھپوان پر ناز ہے۔“

”خدا کی قسم! یہ تو اپنا نور اای ہے۔“ میں نے اک لمبی سی ”اوو“ کے بعد کہا۔ اور اس کے ساتھ جہاں نورے کا سایہ، اس کے وجود کا نتیجہ صریح، جس کی مونچھیں متواتر تیل لگانے اور کھینچنے سے اور بڑی ہو گئی تھیں۔ اس کے غنیمت اور چاہ زخندیاں والے سیاہ چہرے پر ایک عجیب لعنت سی برس رہی تھی، جسے خوبانی اور آلو بخارے کے بیجوں سے نکالے ہوئے ستے، بدبو دار اور بے حد چکنے تیل نے اور بھی چمکا دیا تھا، اور اس کے سامنے نور ابھی تھا۔ کھلے کھلے ہاتھ پاؤں، چار چار

ایک بجلی کا ہنڈا تک لگوا کر ہمیں دیتا تھا۔ خدا جانے سیرے کہنے پر چوہدری جہاں اور نورے کی میانی کوٹھڑی میں سپیدی اور کرائے میں تخفیف کیسے کر دیتا۔

اُس کے بعد ہم رات کے سنانے میں بیٹھتے،
 بیٹوں سے شور مچاتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ کرے کے کا
 واؤ، ریش اور داؤد نے کھولا تھا۔ اندر گھستے ہوئے
 اسٹین کے دماغ میں پھر نور ہے اور اس کے پاؤں
 دبانے کی تصویر گھوم گئی۔ اس نے اپنی گزری کی موٹی
 نمٹیں کا مٹن کھولتے اور اسی گزری کی ٹائی کی گرہ کو ڈھیلا
 کرتے ہوئے کہا: ”میرے بس کی بات ہو تو جہاں کو
 سی مکان کی لکٹی پیر کھڑا کر کے پیچھ دکھا دے دوں اور
 صبح سب سے پہلے اس کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے
 زندگی کی صحیح تصویر پیش کر دوں۔۔۔۔۔ ہے نا؟ اور دیکھو کم
 بخت نور کے کو مالیت کس طرح یاد ہے اور یہ بھی جانتا
 ہے کہ کہاں سے آئے ہیں۔“ میں نے کہا: ”کون
 جانے اسے یہ بھی پتا ہو کہ کہاں پیسے رکھے جاتے ہیں۔“
 اسٹین نے اپنے سیاہ گوشے بالوں میں ہاتھ
 پھیرتے ہوئے کہا: ”ارے یار سچ سچ۔۔۔۔۔ کہیں ہم پر ہی
 ہاتھ صاف نہ کر جائیں۔“

اس کے بعد میں داؤد کے بستر میں گھس گیا۔
میری چار پائی کی پائنتی ٹوٹ گئی تھی اور چار پائی اچھا
خاصا کنواں بن گئی تھی۔ صبح اٹھتے ہی بے تحاشا گالیوں
اور مار دھاؤں کی آواز سنائی دی، اور پھر وہی: ”ارے تو
نے اتنی کنگنی ضائع کر دی ہے۔ کھجور کے لئے تو اتنے
سے ہی جاول کافی تھے۔ اے اوکے کے بچے!“

اسٹین بولا: ”بھئی اب مجھ سے نہیں رہا جاتا۔“ داؤد کا نظریہ بدستور رجعت پسندانہ تھا: ”جو مار کھانے کے لائق ہوتے ہیں انہیں مار ہی پڑتی یا ہے۔“ لیکن آج وہ بھی میرے اور اسٹین کے ساتھ شوق ہو رہا تھا کہ بے چارے نورے کے ساتھ صریحاً زیادتی ہو رہی ہے۔ داؤد نے ایک افسانے کو میز پر رکھا اور دوسرا افسانہ چھڑویا۔

”نورے یار بلاؤ تو اس نورے کو۔“ اس نے مجھے حکمانہ انداز سے کہا۔

داؤد نے بات شروع کی: ”ابے نورے!
تمہارے کتنے ہاتھ ہیں؟“

”جہاں کے کتنے کان ہیں؟“
”وہ!“

”تمہاری کتنی آنکھیں ہیں؟“

”تم کیا کہتے ہو؟“
 ”کیا نہیں اساتذہ نہیں، کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے

”میں نے نہیں۔“

”سولہ سترہ روپے۔“

تو بھلا جاؤ یہاں سے اسی نہیں ہے۔
تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ مار کھاتے رہو، راستے

میں پڑے ہوئے روٹے کی طرح راہ لیروں کی
ٹھوکریں کھاؤ..... جاؤ“

نورے نے چادر کو اپنے کرو لیٹا اور کچھ نہ بچتے ہوئے چلا گیا۔ اسنیں اور میں نے داد کی طرف دیکھتے

ہوئے ایک بلند اور ناشائستہ سا قہقہہ لگایا۔ اسٹین بولا: ”ارے داؤد! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ باتیں کرتے

میں بھی تمہارا اپنے افسانے کا ہی انداز ہے۔ ایک نفسیاتی اختتام پر آنکر بس کر دیا۔ ارے نورے کے سے

آدی کو ہمرنگ چاہئے۔ ہمرنگ..... سچے؟ عوام

ہم رنگ چاہتے ہیں۔ بات ان پر واضح اور ہر ادھر اکر ٹھوسنی چاہیے۔ ان کی نفسیات یہی ہے کہ زیادہ نفسیات سے کام نہ لیا جائے۔ صاف کہو: یہی اس طرح کے ہاتھ، کان اور کمانی ہوتے ہوئے بھی جہاں سے کیوں دب رہے ہو؟

اس پر ایک اور فراموشی قہقہہ پڑا۔ رفیق ہنستے ہوئے اس مرنے کی مانند اچھلا جس کی گردن ایک ہی ضرب میں بدن سے علیحدہ کر دی گئی ہو۔ ہم نے پھر نورے کو بلایا اور جہاں کے خلاف اس کی مدد کرنے کا وہ کیا۔ نورے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو گئی۔ اس کے جسم کے پٹے پھر کسے گئے۔ چادر میں سے اس نے اپنے لیے بے باز دنگال لئے اور جہاں کے ساتھ لڑائی کا تصور ذہن میں لاتے ہوئے بولا: ”جج جج اس نے مجھے نامرد سمجھ رکھا ہے۔ ایک دفعہ وہ چکری دوں کہ۔۔۔“ اور نورے پر حقیقت کا انکشاف ہونے لگا اور آج وہ جان سگا کہ اسے مار پڑ رہی ہے۔ اس کے منہ کے ایک طرف کف کی ایک نفرت انگیز مگر حیرت، تحریر سی مگر تعمیری سی تحریر دکھائی دینے لگی۔ اسٹین نے بالکل لیٹن کا سا کام کیا۔ ایک عام آدمی کے ذہن د لا شعور میں یہ احساس بھر دیا کہ اسے دبا جا رہا ہے۔

نورے کے جانے کے بعد رفیق، علیحدگی کی طرح پوچھنے لگا: ”تمہارا کیا خیال ہے، پھنسی تو نمودار نہیں ہوئی؟ ڈاکٹر بالی نے کہا تھا کہ تین ہفتے سے چھ ہفتے تک میعاد ہوتی ہے، اور اب چوتھا ہفتہ جا رہا ہے اور کوئی نشان نہیں۔ اور میں کل کی نسبت آج کمزور نہیں دکھائی دیتا کیا؟“ میں نے رفیق کو یقین دلاتے ہوئے کہا: ”بھئی پھنسی نہیں ہوگی۔“ لیکن وہ کہنے لگا: ”تم میرا جی رکھنے کے لئے کہہ رہے ہو۔ خدا کی قسم کھاؤ“ میں نے تنگ آ کر ہمدردی سے عاری، اتنی ادنیٰ آواز میں قسم کھائی کہ رفیق نے مغموں و مایوس ہو کر اس کا ذکر بند کر دیا۔ لیکن صرف اسی وقت کے لئے!

بڑے مزے کی بات ہوئی۔ نورہمارے یہاں تو سچ پاہو لیکن جہاں کے پاس گیا تو بولا: ”دیکھو بھیا یہ باو

لوگ مجھے تمہارے خلاف اکساتے ہیں۔ کہتے ہیں تم اس کے دیکل ہو۔ اب بھلا میں کہاں ہوں تمہارا دیکل؟“ نورید ستوراٹھا چوہا بھانج کی مٹاپوں، کے لئے سلگنے لگا۔ دادو کہنے لگا کہ اس میں سارا تصور لیٹن یا اسٹین کا ہے۔ اگر میرا افسانوی طریقہ برتا ہوتا تو بات پھر لوٹ کر اس کے ذہن میں آتی، چوٹیں لگتی اور پس جاتی، اور جہاں کا نام لینے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ یہ فرق تھا لیٹن اور گوری میں، اسٹین اور دادو میں۔

رفیق نے یاس آلودہ گاہیں ادھر اٹھائیں اور موضوع کو ٹانگ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچے ہوئے بولا: ”تہذیب حاضر جسم اور روح کی بیماریاں پیدا کرتا جانتی ہے۔ اس کے پاس پھر نکار ہے لیکن علاج اور شفا نہیں۔ مریض کے دوسرے سوال کا جواب دینے کا مہم جوصلہ بھی نہیں۔ اور یہ آخر کہاں تک مددگار ہے۔ دیکھ اس میں مجھے اپنا رنگ زرد دکھائی دیتا ہے۔ میں اسے توڑ دوں گا۔“ اور نیور تھینک رفیق نے آئینے کو باہر پھینک کر اس کے نکلنے کر دیئے۔

اب ہم جہاں سے چھیننے لگے لیکن جہاں ”بیٹا باہر تو نکل“ کی اعزاز کے باتیں کرنے لگا۔ ہم نے بھی ڈنڈ پیلے، ہاتھ کی، موگر اٹھا کر پنوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہا: ”لے نکلے ہیں، کر لے جو کرنا ہے۔“ اور جہاں مرعوب ہو گیا۔ نورے کے متعلق ہم نے سوچا ”نورا جائے جہنم میں۔ ہمیں اس سے کیا غرض؟ دادو کا نقطہ نگاہ درست ہے، بلکہ اسے جتنی بھی پڑیں تو خور ہیں!“

ہمیں نورے کی اس بیماری کے متعلق ابھی تک حیرت تھی لیکن ہم نے اسے کسٹری کے احساس کا سارا سوائے عام نام دے کر کمال بے مہری اور بے حس و سنگی سے اپنے ذہن کو فارغ کر دیا۔ ایسا کی ایک دن جہاں نورے کو اپنی دوستی اور رفاقت کے قابل نہ سمجھ کر علیحدہ ہو گیا۔ اس وقت نورے نے جہاں کی باتیں کیں، آنسو بہائے لیکن جہاں تھا کہ برابر کہے جا رہا تھا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی رہے۔

دادو چیخا، اسٹین نے نفسیات کی ایک کتاب

بلائی اور ہم دونوں نے مل کر ایک بے ربط اور بے سری آواز میں ہند کا قوی ترانہ: ”سلامت رہے ہمیشہ فرمانروا ہمارا“ گایا۔ گانے کے بعد رفیق نے کہا کہ دیکھو یہی سستی ہی جان چھوٹی ہے اور نورہارے کہ مانتا ہی نہیں۔ ”ابے نورے!“ پھر آہستہ آواز اور دانت نہیں کر ”ابے نورے!“ اور نورہارے کہ صدیوں سے غلام چلے آئے والوں کی طرح اپنی غلامی میں ہی نجات سمجھنے لگے اپنے پاؤں کی بیزی کو ہی اپنا زور سمجھتا ہے۔

لیکن جہاں چلا گیا اور ایک شخص فرد کا فاروق نے جہاں کی جگہ لے لی۔ دانے قسمت! اب نورہارے کے کاغذام تھا۔ لیکن قحب کی بات تھی کہ ایک دن نورے نے احتجاج کیا۔ بات یوں ہوئی کہ فرد کے کسی بات سے دھکی ہو کر نورے سے کہنا: ”جائیرا خانہ خراب ہو۔“

نورے کو کچھ یاد آ گیا۔ آنسو تھے کہ بے تحاشا لہڑ رہے تھے۔ ایک بات کا اضافہ ہوا۔ روتے روتے کھٹکھی بندھ گئی۔ نورہا بار بار یہی کہتا تھا کہ تو نے مجھے مار لیا ہوتا، پیٹ لیا ہوتا لیکن یہ الفاظ مجھے نہ کہے ہوتے۔ فرد کے نے نورے کو دلانا دیا لیکن نورہا تھا کہ برابر روئے جا رہا تھا: ”ہائے! تو نے مجھے یہ نہ کہا ہوتا۔“

اسے منانے کے لئے فرد کا گھر بیٹھ رہا اور گیرج شاپ، جہاں کہ وہ کام کیا کرتا تھا، نہ گیا۔ ہم نے بھی کالج سے چھٹی کی اور نورے کو کریدنے لگے۔ جب نورہا بولنے کے قابل ہوا تو کہنے لگا: ”چھوٹے ہوتے میرے ماں باپ مر گئے۔ بھائی نے کالا پوسا اور نو جوان کیا۔“

اور نورہا پھر رونے لگا۔ اس کی آنکھیں میانی کمرے کے ایک پٹے پر جمی ہوئی تھیں، لیکن گردش ایام پیچھے کی طرف دوڑ گئی تھی اور نورہا تصور میں اپنے بھائی کے پاس کھڑا تھا۔ کچھ دیر کے بعد خود ہی نورے نے بات مکمل کرنے کی اک ہٹ محسوس کی اور بولا: ”مجھے مرغ پالنے کا بڑا شوق تھا تو بڑے بھائی نے مرغ مہیا کئے۔ میں انڈا پوسکی کی پجارت دار نہیں پسند کرتا تھا تو اس نے بہت سی ٹھیکیں سلا دیں۔ گھر میں بھادج کو زیادہ باجرے کی روٹی پکانے کا حکم تھا کیونکہ وہی روٹی مجھے پسند تھی۔ لیکن

میں اس کے پاس نہ رہا اور بھاگ گیا۔ ایک آنے کی بجلی پر چھ ماہ کاٹ کر گھر لوٹ آیا۔ پھر بھاگا، بھڑلوٹ آیا، اور آخر میں نے بھائی کو اس حالت میں چھوڑا جب کہ اس پر فاج گرا تھا۔ اس نے تنگ آ کر مجھے ایک بد دعا دی جو کہ مجھے آج یاد آ رہی ہے۔ اس نے کہا: ”نوری! وہ مجھے ہمیشہ لاؤ سے نوری ہی کہا کرتا تھا۔“ یہاں کچھ دیر رکنے کے بعد نورہا بولا: ”اس نے کہا: ”نوری! تو زندگی میں کسی کا سگائیں بنا جا تیرا سگ بھی کوئی نہیں بنے گا۔“

اس کے بعد کچھ دیر خوشی رہی جس کے بعد نورے نے کہا: ”وہ دن اور آج کا دن، میرا تو کوئی سگائیں بننا۔ اور آج فرد کا کہہ رہا ہے جائیرا خانہ خراب ہوا میں اپنے دوست کے لئے کیا نہیں کرتا۔ کینے سے کمینہ کام بھی کرتا ہوں اور جب کوئی میرا دوست مجھے چھوڑتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ یہ سب بھیا بلاتی کی بد دعا کا اثر ہے!“

رفیق، دادو، اسٹین اور میں۔۔۔۔۔ چاروں نے یہ بات سنی اور دم بخود رہ گئے۔ ”اسے نورہا کہتے ہیں۔“ دادو بولا۔ اسٹین نے گہری سوچ سے سر اٹھایا اور بولا: ”اپنی دق سے مرئی ہوئی ماں کی میں نے خدمت کی اور مرنے سے پہلے اس نے کہا: چاہو تو زندگی میں بڑا سکھ پائے گا۔“ اور اسٹین نورے کے ہی اعزاز میں بولا: ”وہ دن اور آج کا دن! جب کوئی پرستار میری زندگی میں آتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ماں کی دعائے خیر کا اثر ہے!“

رفیق بولا: ”لوگوں کو منہ سے بات نکالنے ہوئے کچھ سوچ لینا چاہئے۔ تم نہیں جانتے مجھے سے نیورس جینک کے لئے ایک معمول ساقرہ کیا معنی رکھتا ہے“ اس وقت دادو اور میں خاموش تھے۔ شاید ہم بھی اپنی ماضی کی راکھ میں چند سلگتے ہوئے کوئلوں کو اٹھل پھل کر رہے تھے۔



بے چین روح

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

پورے کمرے میں ہولناک تاریکی کا راج تھا، نوجوان محوے خواب تھا کہ کسی نے اسے اچانک جھنجھوڑ کر اٹھادیا، اس نے اپنی آنکھیں مسلیں اور سامنے دیکھا تو اس پر جیسے کپکپی طاری ہوگئی۔ سامنے ایک مجسم روح کھڑی.....

سنسان اور پرہول اندھیرے میں خراشاں خراشاں دل و دماغ پر خوف کا سکہ بیٹھائی کہانی

میں موجود تھی۔ بچے کی گردن کسی تیز و ہار ہتھیار سے کاٹی گئی تھی۔ بچے کی لاش اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دوبارہ دریا کے پانی میں جا گری۔

”یا اللہ خیر۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ چند بچوں کی مزید گردن کی لاشیں بہتی ہوئی کنارے پر آ پہنچی تھیں وہ لرزتی کانپتی ٹانگوں سے اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگا جو اس دریا سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔

☆.....☆.....☆

گر جتنے بادلوں کی دل دہلا دینے والی آواز میں پوچھا اپنے نومولود بچے کو اٹھائے بھاگ رہی تھی اس کا ہتی راکش دس سالہ بیٹا ویک دو سرائیٹا پانچ سالہ پردیپ اور سات سالہ بیٹی مانی بھی اس کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ تیز بھاگنے سے ان کا سانس پھول رہا تھا وہ دوڑتے ہوئے بری طرح ہانپ رہے تھے گر جتنے بادلوں کے ساتھ ساتھ برسی بارش میں وہ بھیگ چکے تھے سردی انہیں اپنی ہڈیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

رات آدمی سے زائد بیت چکی تھی، اس پر موسلا دھار برسی بارش میں بھاگنا ان کی مجبوری تھی۔ خہارا راج پر کاش کے سچا ہی موت کی طرح ان کے تعاقب میں تھے۔ ہندوستان میں واقع اس ریاست

صالح محمد دریا کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ رات آدمی سے زائد بیت چکی تھی۔ صالح محمد پانچ وقت کا نماز کی اور تہجد گزار تھا اس وقت بھی وہ تہجد کی نماز کے لئے وضو کر رہا تھا اچانک موسم تبدیل ہو گیا۔ بادل گر بنے لگے بلکی بلکی ہونا باندی شروع ہو گئی اس نے ہاتھوں کے چلو میں پانی لے کر پیسے ہی چہرے کے قریب لایا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس چھا گیا۔ کیونکہ اس کے خوف زدہ ہونے کی وجہ اس کے ہاتھوں کے چلو میں موجود پانی تھا۔ جو خون کی طرح سرخ ہو رہا تھا اس نے لرزتے کانپتے ہاتھوں کے چلو میں موجود پانی کو سونگھا تو اس کے شبے کی تصدیق ہو گئی پانی سے انسانی خون کی بو آ رہی تھی۔ اس نے چلو میں موجود پانی کو گرا دیا اور لرزتی کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی نظرس دریا پر جمی ہوئی تھیں۔ انسانی خون پیچھے کہیں سے دریا کے پانی میں بہتا ہوا آرہا تھا۔ اسی وقت اس کی نظرس پانی میں بہتی ہوئی کسی چیز پر پڑیں جو کنارے کی طرف آ رہی تھی۔ وہ کنارے پر کھڑا انور اس چیز کو دیکھتا رہا۔ قریب آنے پر ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا خوف اور ڈر سے اس کے دو ٹکٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ وہ کسی نومولود بچے کی لاش تھی جو اس کے ہاتھوں

کا مالک مہاراج پرکاش انتہائی غالم اور سنگدل انسان تھا۔ چندہ ماہ قبل اس کے دست راست علم نجوم کے ماہر نارائن نے انکشاف کیا کہ اس املاؤں کی رات اس ریاست میں ایک بچہ ایسا پیدا ہوگا جو مہاراج کی موت کا سبب بنے گا۔

چنانچہ مہاراج پرکاش نے حکم دے دیا کہ املاؤں کی آنے والی رات میں ریاست کی کوئی عورت لڑکا نہ بنے اور جس کے گھر میں اس املاؤں کی رات لڑکا پیدا ہوگا اس بچے کو اور بچے کے والدین کو مہاراج کے سپاہی قتل کر دیں گے۔

اس املاؤں کی رات کو ریاست میں درجنوں بچوں نے جنم لیا جنہیں مہاراج اور نارائن نے نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا اور باقی بچے کو قتل کر دیا۔

راکش اور پوجا اپنے نومولود بچے کی زندگی بچانے کے لئے اپنے پر پیار کے ساتھ رات کو گھر سے بھاگ گئے، مہاراج کو ان کے فرار کی خبر مل گئی چنانچہ مہاراج کے سپاہی گھوڑوں پر سوار ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔

اچانک انہیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں لگیں۔ موت ان کے سر پر چھینچنے والی تھی۔ اب ان میں مزید دوڑنے کی ہمت نہ تھی۔

اچانک دس سالہ دیک بھاگتے بھاگتے ایک چھوٹے کھائی نما گڑھے میں چنٹا ہوا ہوا گر گیا۔

اسی وقت گھوڑوں پر سوار نصف درجن مسلح سپاہیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان میں مہاراج کا دست راست نارائن بھی تھا۔ ”خبردار اب بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ہم کو قتل چلا دیں گے۔“ نارائن غصے سے چلا یا۔ وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ پر رک گئے، نارائن کے اشارے پر ایک رائفل بردار نے زبردستی نومولود بچے کو پوجا سے چھین لیا۔

”سردار یہ بچہ تو سردی اور بارش کی شدت سے مر چکا ہے۔“ پوجا سے بچہ چھیننے والا رائفل بردار جیسے چنٹا۔ پوجا نے چیخے ہوئے اپنے نومولود بچے کی لاش

اس سے جھپٹ لی بچے پر نظر پڑتے ہی وہ روئے لگی۔ بچہ واقعی دنیا سے گزر چکا تھا وہ مصحوم گھٹنوں بارش میں بیٹھنے کی وجہ سے سردی سے مر چکا تھا شاید اسے مرے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی پوجا کو بھاگنے کے دوران اپنے نومولود بچے کی موت کی خبر بھی نہ ہو سکی تھی۔

”انہیں جویلی لے چلو، ان کا فیصلہ مہاراج کریں گے۔“ نارائن نے حکم دیا۔

انہیں بے دست دیا کر کے جویلی کی طرف لے جایا جانے لگا۔ بچے کی لاش پوجا سے چھین کر جنگل میں پھینک دی گئی تھی۔

”تم لوگوں نے مجھ سے غداری کی ہے جس کی سزا بہت بھیا تک ہے۔“ مہاراج کے حکم سے راکش اور پوجا کو گھوڑوں کے پورے دارکر کے قتل کر دیا گیا۔ پانچ سالہ پردیپ اور مانی کو اگرچہ زندہ رکھا گیا پر انہیں غلاموں میں شامل کر دیا گیا۔

رات نصف سے زائد بیت چکی تھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے نیند نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کی وجہ وہ خواب تھے جو مسلسل کئی روز سے اسے خوف زدہ کر رہا تھا وہ اکثر خواب میں دیکھتا۔

ایک عورت کفن پہننے اس کے سامنے کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے ”دیکھ میں کب سے بے چین ہوں۔ تمہاری راہ تک رہی ہوں جلدی آؤ۔“ وہ اکثر یہی بات دہراتی۔

بھی وہ خواب دیکھتا، ایک جنگل سے جس میں ایک عورت اور دو تین بچوں کے ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ عورت نے ایک نومولود بچہ اٹھا رکھا ہے اسے نہ جانے کیوں ایسا لگتا تھا جیسے اس نے اس جنگل کو دیکھا ہے آج بھی وہ یہ خواب دیکھ کر آدمی رات کو بیدار ہو چکا تھا شدید سردی کے موسم میں بھی اسے خوف سے پسینے آ رہے تھے پوری رات اس نے کروٹیں بدل بدل کر جاگ کر گزار دی۔ پانچ بجے کے قریب وہ گہری نیند سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے اس

وقت وہ ناشتہ کر رہا تھا اس کے قریب ہی اس کی والدہ بیٹس موجود تھیں اس کے والد زہیر احمد ایڈووکیٹ کورٹ جا چکے تھے۔ ”کیا بات ہے بیٹا آج تم اتنی دیر سے اٹھے ہو اس کے باوجود مجھے تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں لگتا ہے تم رات بھر سوئے نہیں۔“

ای! آج پھر میں نے وہی خواب دیکھا ہے خواب میں وہی عورت ہمیشہ کی طرح مجھے دیکھ کہہ کر کھاتی ہے دوسرے خواب میں ہمیشہ کی طرح ایک جنگل دیکھتا ہوں جو مجھے دیکھا بھالا لگتا ہے اس جنگل میں ایک عورت اور مرد بچوں کے ہمراہ بھاگ رہے ہیں نہ جانے کیوں مجھے وہ بچہ بھی جانے پہچانے لگتے ہیں۔ وہ بچہ جین روٹ نہ جانے مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ ان برسرِ رخساروں نے میرا جین سکون چھین لیا ہے۔

”تم کسی ماہر نفسیات کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔“

”امی میں کوئی نفسیاتی مریض نہیں۔ جو ماہر نفسیات سے رجوع کروں۔“ عثمان ٹپ اٹھا۔ ”خیر چلو ناشتہ کر کے گھوم پھر آؤ دل بہل جائے گا۔“ والدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا عثمان سر جھکانے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔

عثمان ایڈووکیٹ زہیر احمد کا اکھوتا بیٹا تھا والدین اس سے بہت پیار کرتے تھے عثمان کو ایک بات پر بہت حیرت ہوتی تھی کیونکہ ان کے گھر میں عثمان کی بچپن کی کوئی تصویر نہیں تھی اس بارے میں اس نے کئی بار والد اور والدہ سے پوچھا مگر انہوں نے اسے نال دیا۔

آج اس نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ گھر میں اپنے بچپن کی کوئی تصویر ڈھونڈے گا۔ ناشتہ کرنے اٹھا تو پتہ چلا والدہ پڑوس میں تھی ہوئی ہیں۔ اس نے موقع غنیمت جان کر گھر میں موجود الماریوں کی تلاشی لینا شروع کر دی ایک الماری سے کچھ اہلیم لے جس میں اس کی والدہ بیٹس اور والد زہیر احمد اور شہزادوں کی تصویریں تھیں مگر اس کی کوئی بچپن کی تصویر نہ تھی آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک الماری سے پرانا سا اہلیم ملا کھول

کر دیکھتے ہی اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا وہ بیٹس اور زہیر احمد کی جوانی کی تصویر تھی ان کے ساتھ ایک دس سالہ بچہ تھا بچہ وہ ہوا اس بچے کی طرح تھا جیسے اس نے کئی بار خواب میں ایک مرد اور عورت کے ساتھ جنگل میں بھاگتے دیکھا تھا وہ سوچنے لگا۔ ”اس بچے کا میرے والدین سے کیا تعلق ہے؟ اس تصویر کو انہوں نے کیوں چھپا کر رکھا ہے؟ کہیں یہ بچہ میں ہی تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ مجھ سے اس بات کو چھپا کیوں رہے ہیں؟ وہ عورت مردوں ہیں جن کے ساتھ وہ بچہ بھاگ رہا ہے؟“ سوچوں کی یلغار تھی جس نے اس کے ذہن کو چکر کر رکھا تھا والدہ کے گھر آنے کے بعد اس کی ہمت نہ ہو سکی کہ اس سے کچھ پوچھتا وہ خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا کہ دوستوں سے گھل مل کر اپنے ذہن سے ان سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کرے گا۔

شام چھ بجے کا وقت تھا نئے ماڈل کی جیب سڑک پر درمیانی رفتار سے چل رہی تھی اس جیب میں عثمان، جاوید، ندیم اور ارسلان موجود تھے یہ جیب ندیم کی تھی ندیم ایک بہت بڑے صنعت کار کا غانا سرداری کا بیٹا تھا وہ چاروں گہرے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ کلاس فیلو بھی تھے ندیم نے ملک بھر کی سیر کا پروگرام بنایا تو چاروں نے کالج سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی انہیں گھومتے ہوئے آج تیسرا روز تھا ندیم گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ بھائی تین دوست پچھلی نشست پر براجمان تھے۔

ندیم نے گاڑی اچانک سڑک کے درمیان روک دی۔ ”اس سنسان سڑک پر اس طرح گاڑی کیوں روکی۔“ عثمان نے پوچھا۔

”سامنے سڑک پر دیکھو۔“ ندیم نے سڑک کی طرف اشارہ کیا انہوں نے دیکھا۔ گاڑی سے کچھ فاصلے پر سڑک کے درمیان ایک سفید رنگ کی بلی کھڑی تھی عثمان گاڑی سے اتر کر بلی کے پاس چلا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بلی کو اٹھالیا حیرت کی بات یہ تھی کہ بلی آرام اور سکون سے اس کے ہاتھوں میں موجود تھی۔ اس نے اپنے آپ کو عثمان سے چھڑانے کے لئے کسی قسم کی جدوجہد نہیں

کی عثمان بنی سیت گاڑی کی پھلی نشست پر بیٹھ گیا۔
 ”لگتا ہے اس سے تمہاری رشتے داری ہے کتنے
 آرام اور سکون سے تمہاری گود میں بیٹھی ہے۔“ ارسلان
 ہنسنا ندیم نے گاڑی چلا دی۔

کچھ دیر بعد ندیم اچانک خوف زدہ نظر آنے لگا
 اس کے خوف زدہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ گاڑی اس کے
 کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی۔ بائیں سمت ایک سڑک
 جاری تھی ندیم نے اسٹرنگ موڑ کر گاڑی کو بائیں سمت
 والی سڑک پر لے جانا چاہا۔ مگر ناکام رہا۔ اسٹرنگ فل
 گھمانے کے باوجود گاڑی سڑک پر سیدھی دوڑتی چلی
 جاری تھی۔ ندیم نے بریک پر پاؤں کا دباؤ بڑھا کر اسے
 روکنے کی کوشش کی جیپ روکنے کے بجائے تیزی سے
 آگے بڑھنے لگی گاڑی کی رفتار اس وقت سو سے زائد تھی
 ندیم کے چہرے کا رنگ خوف سے سفید پڑنے لگا۔

”خیریت تو ہے؟ تمہارے چہرے پر ہوا میں
 کیوں اڑ رہی ہیں؟“ ارسلان نے پوچھا۔

”یاد عجیب بات ہے۔ گاڑی میرے کنٹرول
 سے باہر ہو چکی ہے۔ اسٹرنگ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے
 بائیں سمت والی سڑک پر لے جانے کے لئے اسٹرنگ
 فل گھمایا اس کے باوجود یہ اپنی مرضی سے ایک ہی سمت
 جاری ہے۔ یہ دیکھو!“ ندیم نے اسٹرنگ کو پوری قوت
 سے بائیں طرف گھمایا۔

”انہوں نے دیکھا تو گاڑی واقعی سڑک پر سیدھی
 چلی جا رہی تھی اور اس کے علاوہ گاڑی کے بریک بھی کام
 نہیں کر رہے ہیں رفتار کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی
 ہے۔ لگتا ہے کوئی مرنی طاقت گاڑی کو کنٹرول کر رہی
 ہے۔“

ندیم کے الفاظ نے سب کو ہراساں کر دیا وہ
 خوف زدہ ہو گئے۔ ”یار کیوں نہ گاڑی سے
 کود جائیں۔“ عثمان نے مشورہ دیا۔

”حق گاڑی کی رفتار اس وقت سو سے زائد ہے
 اتنی رفتار سے چلتی گاڑی سے کودنا خودکشی ہوگی۔“
 جاوید جھٹلا کر بولا۔

”یار جب سے یہ پراسرار ملی گاڑی میں سوار
 ہوئی ہے اس وقت سے گاڑی ہمارے کنٹرول سے باہر
 ہے کہیں یہ کوئی جن بادیوں تو نہیں؟“ ندیم عثمان کی گود
 میں بیٹھی ملی کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

ندیم کے تبصرے نے ان سب کو مزید دہشت
 میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب وہ خاموش بیٹھے خوف زدہ نظروں
 سے ملی کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک اسی وقت ملی نے گاڑی
 کی آواز نکالی اور تیز رفتاری سے چلتی گاڑی کی کھڑکی سے
 کود گئی ملی کی اس غیر متوقع حرکت سے وہ بھونچکے رہ گئے۔
 ”لگتا ہے تمہاری بات کا برہان مل گیا۔“ جاوید ندیم
 کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ یہ بات اس نے مزاح کے
 انداز میں کہی تھی کہ اس کے دوستوں کے دل سے خوف
 نکل جائے۔ ”اب بچنے کی ایک ہی صورت ہے کسی نہ کسی
 طرح گاڑی کا ایندھن ختم ہو جائے۔ گاڑی خود بخود روک
 جائے گی۔“ ندیم اس کی بات پر دھیان دے بغیر بولا۔

”منشی فل ہے ایندھن ختم ہونے تک گاڑی یہ نہ نہیں کہاں
 تک پہنچ جائے گی۔“ ارسلان نے ہونٹوں پر زبان
 پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ حیرت اور خوف سے گاڑی کو انجان راستوں
 پر تیز رفتاری سے چلتے دیکھتے رہے۔ سڑک رات کے اس
 پہر سنسان تھی کبھی گھبراہٹ آگے گاڑی دکھائی دیتی۔ تو وہ
 شور مچا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر کوئی بھی
 ان پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ گاڑی میں موجود افراد
 حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا کر
 آگے نکل جاتے۔ وہ چاروں حیرت اور خوف کے لئے
 جلے جذبات سے گاڑی کو اپنی مرضی سے چلتے ہوئے
 دیکھتے رہے۔ ارسلان تو قرآنی آیات پڑھنے لگا۔ اس
 کے دیکھا دیکھی باقی دوستوں نے بھی زیر لب قرآنی
 آیات پڑھنی شروع کر دی تھیں ان کا یہ پراسرار اور خوفناک
 سفر کائی دیر تک جاری رہا۔ صبح تقریباً چھ بجے کے قریب
 ان کی جیپ ایک سرسبز گاؤں میں جا کر رکی۔ چاروں
 جلدی سے نیچے اتر آئے۔ ”یہ کونسی جگہ ہے؟“ عثمان بولا۔

”ایسا کرتے ہیں پیدل آگے چلتے ہیں۔“ جیسے

یہ کوئی نظریہ یا تو معلوم ہو جائے گا یہ کوئی جگہ ہے؟“ ندیم
 بولا۔ اور پیدل ناک کی سیدھ میں چل دیئے۔

”کچھ دور چلتے کے بعد سامنے سے ایک صحت
 مند بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔“ باباجی یہ کونسا علاقہ
 ہے؟“ ندیم نے اس سے پوچھا۔ ”بیٹا یہ انڈین سرحد
 کے قریب واقع گاؤں پریم نگر ہے تم لوگ یہاں کیسے
 آئے؟ شکل سے تو تم لوگ شہری دکھائی دیتے ہو۔“ اور
 بوڑھا انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”باباجی راستہ بھٹک کر ادھر آ گئے ہیں آپ شہر کی
 طرف جانے والی سڑک کا ایڈریس بتا دیں شاید ہمیں کسی
 سے لفٹ مل جائے۔“ عثمان بوڑھے کی طرف امید بھری
 نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ بوڑھا انہیں راستہ
 سمجھانے لگا۔ وہ اس کا شکر یہ ادا کر کے اس کے بتائے
 ہوئے راستے پر پیدل پڑے۔ ابھی تک کسی آبادی کے
 آثار دکھائی نہ دیئے تھے۔ ایک جگہ بابی کا چشمہ دیکھ کر وہ
 بے تابی سے آگے بڑھے ہاتھوں کے چلو سے خوب
 ہر ہو کر پانی پیا اور آگے بڑھ گئے۔ کافی دیر چلتے رہنے
 کے باوجود نہ ہی کوئی آبادی دکھائی دی اور نہ ہی کوئی
 سڑک نظر آئی وہ چلتے چلتے تھک چکے تھے۔ بھوک بھی
 کٹنے لگی تھی کھانے پینے کا سامان گاڑی میں چھوڑ کر آئے
 تھے اس لئے بھوکے پیٹ پیدل چلتے رہے کافی دیر بعد
 انہیں ایک عمارت دکھائی دی۔ قریب جانے پر معلوم ہوا
 کہ کوئی مندر تھا۔ ”مندر کی حالت سے لگتا ہے یہ کافی ندیم
 مندر ہے۔“ ارسلان نے تبصرہ کیا۔

”چلو اندر چلتے ہیں ضرور کوئی نہ کوئی موجود ہوگا
 اور ہم اس سے سڑک کی طرف جانے والا راستہ معلوم
 کر لیں گے۔“ ندیم بولا۔

”وہ چاروں مندر میں داخل ہو گئے ہال نما
 کمرے میں چاروں طرف دیو دیوتاؤں کی مورتیاں
 لی گئیں ایک طرف کالی کا بڑا سا بت موجود تھا۔ چھت
 پر پتلی کی گھنٹیاں لٹک رہی تھیں ہر طرف سناٹا
 پایا ہوا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ مندر میں کوئی ذی نفس
 موجود نہ تھا۔“ یار جلدی سے باہر چلو۔ مجھے تو وحشت

ہو رہی ہے۔“ عثمان بولا۔

اچانک تیز ہوا میں چلتے گئیں، پتلی کی گھنٹیاں
 ہوا کے چلنے سے بچنے لگیں جن کی آواز اس ہال نما کمرے
 میں گونج رہی تھی اچانک مندر میں ملی کی میاؤں کی آواز
 سنائی دی۔ چاروں نے آواز کی سمت دیکھا تو خوف سے
 ان کی ریزھ کی بڑی میں سردار دوڑ گئی کہ نہ وہ وہ ملی تھی
 جو انہیں سڑک پر لے گئی تھی اور پھر چلتی گاڑی سے راستے میں
 گود لی تھی۔

”جلدی باہر چلو۔“ عثمان چیختے ہوئے بولا۔

اسی وقت پورے مندر میں گھپ اندھیرا چھا گیا
 اور ہال نما کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔
 اس گھپ اندھیرے میں ملی کی آنکھیں پھٹکی ہوئی دکھائی
 دے رہی تھیں۔ ڈر اور خوف سے ان کے جسم سے پسینہ
 بہنے لگا ان چاروں کو کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ ا
 انداز سے دروازے کی سمت بھاگے دوڑتے ہوئے
 عثمان کو ٹھوک لگی اور وہ چیخا ہوا گر پڑا اسے یوں لگا جیسے وہ
 کسی کھائی میں گر رہا ہو وہ تیزی سے پیچھے کی طرف
 گر رہا تھا۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اسی
 وقت اس کے جسم کو کچھ لگا تو اس نے کراہتے ہوئے
 آنکھیں کھول دیں وہ ایک طویل سرنگ میں مٹی کے ڈھیر
 پر پڑا تھا۔ ایک طرف پتلی کی روشنی دکھائی دے رہی تھی وہ
 اٹھا اور روشنی کی طرف بڑھنے لگا کہ شاید یہاں سے باہر
 نکلے گا کوئی راستہ دکھائی دے وہ چلا رہا مگر روشنی کے
 قریب نہ پہنچ سکا وہ سرنگ شیطان کی آنت کی طرح لمبی
 تھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی چلتے چلتے اس
 کے پاؤں تھک گئے وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ
 اگر وہ یہاں سے نہ نکل سکا تو بھوک اور پیاس سے
 مر جائے گا یہ سوچتے ہی وہ دوبارہ کھڑا ہوا اور تیزی سے
 چلتے لگا۔ وہ رے کے بغیر گھنٹوں چلا رہا۔ مگر سرنگ کا اختتام
 نہیں ہوا تھکن سے اس کا جسم دھکے لگا تھا پیاس کی شدت
 سے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اسے اپنے حلق میں
 کانٹے سے چبھتے محسوس ہو رہے تھے یوں لگتا تھا کسی بھی
 لمحے پیاس کی شدت سے اس کی جان نکل جائے گی چلتے

چلتے وہ بے دم ہو کر گڑا اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ ”کیا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔“ یہ سوچتے سوچتے اس نے آنکھیں موند لیں۔

”آنکھیں کھول! میرے لعل، میں آگئی ہوں۔“ اس کے کانوں سے ایک نسوانی آواز گرائی۔ اس نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں حیرت و خوف سے اس کی آنکھیں مکھی کی مکھی رہ گئیں۔ اس کی نظروں کے سامنے وہی عورت کھڑی تھی جو مسلسل اس کے خوابوں میں آتی رہی تھی۔ بالکل وہی شکل و صورت کفن جیسے لباس میں لمبوس ”کک..... کون..... ہو..... تم؟“ عثمان نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”میرے بچے برسوں سے تیری راہ تک رہی ہو۔ تیرے بھائی اور بہن ظلم کی جنگ میں بس رہے ہیں مہاراج نے ان معصوموں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ اب سے آگیا ہے اس کے ظلم کے خاتمے کا تمہیں اپنے باپ، معصوم بھائی اور میرے خون کا بدلہ لینا ہے۔“

پراسرار عورت کے الفاظ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہارا بیٹا نہیں، میرے والدین زندہ ہیں۔ میرا تعلق کسی مہاراج سے نہیں۔ میں پاکستانی ہو چکے کراس سرگ میں پھنس گیا ہو یہاں سے نکلنے میں میری مدد کرو۔“ عثمان کسی حد تک اپنے خوف پر قابو پا چکا تھا بولا۔

”نہیں ویک تم کچھ نہیں جانتے۔ تم ہی میرے بیٹے ویک ہو تم اس وقت بہت جھوٹے تھے جب ہم مہاراج کے سپاہیوں سے جان بچانے کے لئے جنگل میں بھاگ رہے تھے۔ اور مہاراج کے کارندے موت کی طرح ہمارے پیچھے تھے۔ پھر تم کھائی میں گر کر بے ہوش ہو گئے مہاراج کے سپاہی نہیں پکڑ کر لے گئے تمہارا معصوم بھائی جس کی پیدائش کو ایک روز گزر رہا تھا بھاگ دوڑ میں سر دی کی شدت سے سر گیا مہاراج نے تمہارے پتا کو اور مجھے قتل کروا دیا تمہاری بہن اور بھائی کو غلام بنالیا، اب بھی اگر تمہیں یقین نہیں تو تمہارے سینے پر کے کی طرح ایک کالا نشان ہے۔ اسے غور سے دیکھو تمہارے

خاندان کے ہر فرد کے سینے پر ایسا ہی نشان موجود ہوتا ہے تمہارے دادا کے سینے پر بھی تھا تمہارے باپ کے سینے پر بھی یہ نشان موجود تھا تمہارے بھائی پر دیپ کے سینے پر بھی یہ نشان ہے۔“ روح بولی اور عثمان حیران رہ گیا۔

حقیقت میں اس کے سینے پر بھی وہ نشان موجود تھا۔

”چلو میرے ساتھ اس سرگ کا دوسرا دہانہ ہندوستان میں جا کھتا ہے۔“ روح بولی۔

”میں اب مزید نہیں چل سکتا۔ نہ ہی تمہاری باتوں پر یقین کروں گا۔ مجھے ایسا کچھ یاد نہیں۔“ عثمان نے اسے جھٹلایا۔

”تم آتما کی شکتی کنویں جانتے، تمہیں یہاں تک لانے میں میرا ہاتھ ہے۔ تم میرے زیر اثر یہاں تک پہنچے ہو تمہاری گاڑی میں جو بی سوار ہوئی تھی اور جس کی کومند میں تم نے دیکھا تھا وہ میں بھی تمہاری گاڑی کومند کے قریب میں نے ہی پہنچایا تھا۔“

”جب تم اتنی طاقتور ہو تو اپنا بدلہ خود کیوں نہیں لے لیتی؟“

”آتماؤں کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں مجھے یہ اختیار نہیں کہ کسی کی جان لے سکوں۔ اور میری آنکھوں میں دیکھو تمہیں سب یاد آ جائے گا۔“ روح بولی اور عثمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر وہ ان چند پر اسرار آنکھوں کے سحر میں ڈوبنے لگا اس نے نظریں پھیرنا چاہیں مگر ناکام رہا۔ روح کی آنکھوں کے سحر نے اسے جکڑ لیا تھا اسے ایسا محسوس ہوا روح کی آنکھوں سے روشنی کی نگلی اور اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دماغ میں داخل ہو گئی اس کے ذہن کے پورے پر جیسے فلم چلنے لگی اسے یاد آنے لگا دس سالہ دیک اپنے باپ کا ہاتھ تھا۔ بھاگ رہا تھا اس نے نومولود بھائی کو اٹھا رکھا تھا۔

ان کے ساتھ ساتھ پردیپ اور ان کی بہن بالا بھی دوڑ رہی تھی رات کے اس پہر بارش برس رہی تھی اور پھر وہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر ایک کھائی میں گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہوش آیا تو وہ کھائی میں بڑا تھا سر دی کی

چہرے سے اسے تیز بخار ہو رہا تھا کھائی اگرچہ زیادہ گہری نہ تھی لیکن دس سالہ بچہ کے لئے باہر نکلتا ناممکن تھا وہ دو کے لئے چیخنے چلانے لگا۔ کچھ روز بعد کسی نے کھائی میں جھانک کر پوچھا۔ ”کون ہے اندر؟“

”میں ہوں! مجھے بچاؤ۔“ وہ چیخا اور پرے ایک صحت مند شخص اتر اتر اور اسے اٹھا کر کھائی سے باہر لے آیا بخار کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گیا۔

وہ ایک بے اولاد جوڑا تھا جو اس ریاست میں رہنے والے چند مسلمان گھرانوں میں سے ایک تھا۔ جو مہاراج کے مظالم سے تنگ تھے۔ قیام پاکستان کی تحریک زور پکڑ چکی تھی مہاراج جیسے انتہا پسند مسلمان گھرانوں نے وہاں سے ہجرت کرنے کی سوچی جنگل سے گزرتے ہوئے زبیر احمد نے بچے کی چیخ پکار سن کر اسے کھائی سے نکالا یہ جاننے کے باوجود کہ بچے کا تعلق ہندو گھرانے سے ہے۔ انہوں نے بچے کی جان بچائی وہ چھپتے چھپاتے وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ان کے قافلے پر حملے بھی ہوئے۔ ان حملوں میں زبیر احمد کے والد اور بھائی مارے گئے غرض بڑی مشکل سے وہ پاکستان پہنچے۔ جہاں اولاد کی طرح ویک کی پرورش کی۔

مسلمان گھرانے میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ ویک سے عثمان بن گیا۔ ایڈووکیٹ زبیر احمد کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے پیار و محبت نے عثمان کے ذہن سے بیٹے کی تلخ پرچھائیاں کے آثار تک مٹا دیے اب گزرے ماضی کی پرچھائیاں سامنے آتی ہی وہ تڑپ اٹھا۔

”ماں مجھے سب یاد آ گیا ہے۔“ وہ بے تاب سے ماں کی روح کی طرف بڑھا۔ ”ماں مجھے بہت یاد آگئی ہے۔“

”اب نہ ہی تم تھکوکے اور نہ ہی پیاس لگے گی میرے ساتھ چلو۔“ روح نے کہا۔ اور وہ اس کے شانہ بہ شانہ سرزدہ سا چلنے لگا، واقعی بھوک پیاس اور تھکن کا احساس اس سے غائب ہو چکا تھا۔ نہ جانے کب تک وہ

چلتا رہا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ ان کے پیدل چلنے کا سفر کب اختتام پذیر ہوا۔ صرف اتنا دیکھ پایا کہ سرگ کے دہانے سے نکل کر وہ ایک مندر میں داخل ہو چکے ہیں یہاں بھی جابجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں موجود تھیں لیکن اس جگہ ذی نفس موجود نہ تھا۔ دیوار کے گھڑیاں نے بارہ بجے کا اعلان کیا گویا آدھی رات کا وقت تھا۔ وہ روح کے ہمراہ چلتا ہوا ہال نما کمرے سے باہر نکلے گا۔ ”یہ ہم کہاں آ گئے؟“ اس نے ماں کی روح سے پوچھنا چاہا۔ جواب نہ ملنے پر دیکھا۔ روح غائب ہو چکی تھی اس نے پلٹ کر سرگ کے دہانے کی طرف دیکھا۔ سرگ کا دہانہ اس طرح غائب تھا گویا کبھی یہ سرگ تھی ہی نہیں۔

وہ گھبرا گیا ابھی جگہ ٹانوس ماحول آدھی رات سے اوپر کا وقت نہ جانے یہاں کے لوگ اس سے کیا سلوک کرتے۔ اسے بھوک اور پیاس بھی لگنے لگی تھی۔ ایک جگہ بڑے سے بت کے قریب ایک کٹورے میں دودھ اور پھل رکھے تھے وہ بے تابی سے آگے بڑھا دودھ پینے کے بعد پھلوں سے پیٹ پوچا کی۔ پیٹ بھرنے کے بعد خطرے کا احساس دوبارہ جاگ اٹھا وہ بے پاؤں چلتے ہوئے ہال نما کمرے سے نکل گیا راہداری میں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے بند دروازے کے قریب جیسے ہی پہنچا۔ اسے کمرے سے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

”نہیں بھاری جی یہ باپ ہے۔“ کمرے سے ایک کپکپاتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔

”مورکھ یہ باپ نہیں میری سوا کرو گی تو سورگ میں جاؤ گی۔“ ایک سرزدہ قسم کی لہری کے ساتھ مروانہ آواز سنائی دی۔

اس نے دروازے کے کی ہول سے اپنی آنکھ لگا دی اندر ایک سرزدہ صورت گنجا بھاری دھوئی باندھے کھڑا تھا اس کے سامنے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کھڑی تھی جس کا لباس کھینچاٹائی کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا وہ کچھ دیر تک ان کے درمیان ہونے والی گفتگو مستار رہا۔ اس دوران بھاری کی دست داریاں بھی

جاری تھیں پجاری اپنی لہجے دار باتوں سے بھولی بھالی لڑکی کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ کمرے سے لڑکی کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی یقیناً وہ اس سے دست دراز کی کر رہا تھا اور لڑکی چپ رہنے پر مجبور تھی۔

عثمان کو پجاری پر غصہ آ رہا تھا مگر وہ بس بے تھا۔ اجنبی جگہ پر پجاری سے الجھتا اسے ہنگامہ پڑ سکتا تھا۔ اور ایسے بھی وہ لڑائی جھگڑے سے دور رہتا تھا وہ تنہی سے مندر سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک سربزگازن تھا چاروں طرف لہلہاتے کھیت تھے رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی گلیاں کو بچے سنسان تھے۔ رات کے اس پہر اس سرد مزمزم میں کوئی آفتن ہی گھر سے باہر ہو سکتا تھا گاؤں و میاٹوں میں تو دیسے ہی لوگ سرشام گھروں میں ٹھس جاتے ہیں عثمان کی قسمت اچھی تھی کہ اب تک کسی کتے سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ گاؤں کی ایک گلی میں اسے پیٹ پاپ نظر آیا وہ تنہی سے لپکا بیاس بھائی اور آگے بڑھ گیا چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ ”وہ کہاں آ پہنچا ہے؟“ اس کی ماں کی روح بھی غائب ہو چکی تھی جو اس کی رہنمائی کرتی۔ اسے اپنی بہن اور بھائی کو ظالم مہاراج کے چنگل سے آزاد کروانا تھا۔ جس کا کوئی اتاپہ اسے معلوم نہ تھا۔ نہ ہی وہ مہاراج کو پہچانتا تھا نہ ہی اس نے اپنی بہن اور بھائی کو دیکھا تھا۔

کافی دیر تک چلتے کے بعد اسے ایک مکان دکھائی دیا وہ اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے سچ ہی کہتے ہیں اسے نیند آ گئی اس کی آنکھ کسی کے چھینٹھوڑنے سے کھلی ایک درسانی قد و قامت کا تیس سالہ شخص اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا اور ساتھ ہی کہہ رہا تھا۔ ”صبح سویرے میرے گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر سو رہے ہو۔ کون ہو بھائی؟“ شکل صورت اور چلنے سے تو تم ادھر کے نہیں لگتے۔“ عثمان نے اٹھتے ہوئے اسے بغور دیکھا وہ شکل سے سیدھا سادھا اور پیٹنڈ لگتا تھا۔ ”بھائی پہلے یہ بتاؤ یہ کونسی جگہ ہے؟“ عثمان نے پوچھا۔

”یہ جے پور ہے۔“ وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ عثمان سنائے میں آ گیا۔ ”اس کا مطلب ہے میں اس وقت انڈین علاقے میں ہوں۔“ اس نے سوچا۔ ”تم ہو کون اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے یہاں کے تقریباً سبھی لوگوں کو جانتا ہوں۔“ وہ شخص بولا۔ ”میرا نام عثمان ہے، میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ پراسرار طریقے سے یہاں پہنچا ہوں۔“ عثمان نے اپنی ساری روداد اسے سنائی، وہ حیران پریشان سانسٹا رہا۔ ”میرا نام کیش ہے تم ایسا کرو گھر کے اندر چلو، وہیں چل کر آرام سے بات کریں گے، گاؤں کے کسی فرد نے دیکھ لیا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“ وہ چلتے ہوئے کیش کے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک کچا مکان تھا جس کا محن چھوٹا تھا محن کے آخر میں برآمدہ تھا اور دوسروں کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ محن میں ایک طرف چٹاپوں کا چیمبر سامنا ہوا تھا جس میں تین بکریاں بندھی ہوئی اپنے سامنے رکھے گھاس کے کھڑے پر منہ مار رہی تھیں۔ وہ اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا کمرے میں دو چار پائیاں چھبی ہوئی تھیں جن پر بستر بڑے تھے وہ ایک چارپائی پر آئے سامنے بیٹھ گئے۔ ”دیکھو بھائی! مہاراج بہت خطرناک انسان ہے۔ آزادی سے پہلے وہ یہاں کا راجہ تھا آزادی کے بعد ریاست کا الحاق ہندوستان سے ہو گیا اب بھی اس کا بہت اثر رسوخ ہے تقریباً وہ پوری ریاست کا مالک ہے اس کے سپاہیوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ اسی علاقے میں تلخ نما بڑی سی حویلی ہے میں زیادہ دن نہیں اپنے یہاں نہیں ٹھہرا سکتا۔ کوئی ایسا بندہ دوست کرنا ہوں کہ کم دو بارہ اپنے وطن جاسکو۔ دیسے بھی میں بہت غریب آدمی ہوں، میری پتی اور ایک چھوٹی سی پٹی ہے وہ لوگ کل سے میرے سالے کے گھر گئے ہوئے ہیں ماضی میں جو ہوالے بھول کر واپس چلے جاؤ۔ میرا شور و ناٹو اپنے ماضی سے نظرس پھیر کر لوٹ جاؤ، مہاراج کے ہتھے چڑھ گئے تو مارے جاؤ گے وہ بہت ظالم انسان ہے غریبوں کی بہن بٹیوں کو دن دہارے اٹھا لیتا ہے اس کے ہاتھ بہت

سے انسانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں یہاں چھوٹی بھی اس بے چھپ کر نہیں رہ سکتی۔

اس کا دست راست نارائن علم نجوم اور کالے جاوہ کا ماہر ہے۔ اسے نہ جانے کیسے ہر بات کی خبر ہو جاتی ہے میں نے کبھی یہاں ٹھہرا کر بہت بڑا رسک لیا ہے یہ رسک میں نے تمہاری بھولی بھالی صورت سے متاثر ہو کر لیا ہے۔ مہاراج کی اجازت کے بغیر اس علاقے میں کسی اجنبی کو ٹھہرانے کی اجازت نہیں۔“ کیش بولا چلا گیا۔

”کیش بھائی میں خود یہاں نہیں آیا مجھے تقدیر نے برسوں بعد یہاں پہنچایا ہے اس میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہے، تم فکر مت کرو، اللہ بہتر کرے گا۔“

رات کو وہ دیر تک جاگتے رہے باتیں کرتے رہے عثمان صبح نو بجے سوکر اٹھا چوبیس گاؤں کے کچے درو دیوار اور کھیتوں پر چمک رہی تھی کیش کھیتوں پر کام کرنے جا چکا تھا عثمان کا ناشہ چھوٹے سے باورچی خانے میں تیار پڑا تھا عثمان نے پراٹھے کے ساتھ ساگ کھایا ایک طرف بڑی چائے گرم کر کے پی دن کے بارہ بجے کیش واپس آ گیا ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی دستک اتنے زوردار طریقے سے ہو رہی تھی کہ ان دونوں نے سوچا دروازہ کسی بھی لٹے ٹوٹ کر گر جائے گا کیش نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

نصف درجن افراد ہاتھوں میں راتھلیں تھامے اندر داخل ہو گئے۔ ”کیا بات ہے؟“ کیش نے پوچھا۔ وہ کیش کو دیکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں اندر داخل ہو گئے عثمان کمرے کے دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ وہ اس کے سر پر پھینچ گئے۔ ”اوئے یہ تو بومہداس کی طرح ہے!“ ان میں سے ایک حیرت سے بولا۔

دوسرے نے گرجدار آواز میں کہا۔ ”ہاتھ ابراہا کر آگے چلو۔“ تیسرے نے راتھل کا دست لگا کر اس کے شانے پر مارا دو افراد نے سنبھلنے سے پہلے اسے عقب سے جکڑ لیا۔ اس کے بدن پر راتھلوں کے پٹ پڑنے لگے وہ درد کی شدت سے چیختے چلانے لگا۔

کیش ایک کونے میں کھڑا حیرت اور خوف سے اسے بٹپے دیکھ رہا تھا انہوں نے عثمان کو اٹھا کر نیچے چٹا ضروری حرمت کے بعد اس کی تلاشی کی مگنی پھر اسے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ اونچی دیواروں والی حویلی کے اندر تھا حویلی کی دیواریں کالی مونی اور اونچی تھیں۔ حویلی کی انتہی ایک قسم کا قلعہ تھا۔ اسے وسیع عریض محن میں پہنچا دیا گیا وہاں بیٹھنے کے لئے چند خوبصورت کرسیاں رکھی تھیں دوسریں پر دو افراد براجمان تھے ان کے سامنے میز پر شراب کی بوتل پڑی تھی ہاتھوں میں گلاس تھے جن سے وہ دھتے دھتے سے چسکیاں لے کر شراب پی رہے تھے۔

او جیز عمر کا صحت مند سا شخص جس کے بال یقیناً کلف زدہ تھے مہاراج پر کاش تھا۔ اس کے برابر دانی کرسی پر اس کا دست راست نارائن بیٹھا تھا ان کی پشت پر دو خطرناک صورت افراد راتھل ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔

ان سے کچھ فاصلے پر کیش زمین پر پڑا تھا جس کے جسم پر کوڑے برسائے جا رہے تھے اس کے سلق سے لگا تار چپیں نکل رہی تھیں عثمان کو کسی ملزم کی طرح مہاراج کے سامنے پیش کیا گیا تھا مہاراج نے شراب کا کھونٹ بھرا اور بولا۔ ”یہ تو بالکل فلی سین ہے اس کی شکل بالکل اسی کی طرح ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ضرور ان میں کوئی رشتہ ہوگا۔ اوئے پاپی تو کہاں سے آیا ہے؟ یہاں کا تو لگتا نہیں شکل سے تو تو معصوم لگتا ہے پر اس نارائن کا کہنا ہے کہ تو میرے لئے خطرہ ہے۔“

”نارائن لگتا ہے تیرے حساب میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے یہ بکری کا بچہ بھلا میرے لئے کیا خطرہ بنے گا۔“ مہاراج جراث سے ہنسا۔

”مہاراج اتنا گھمنڈ مند کرو تو مجھے نہیں جانتے یاد کرو، ماضی میں کئی سال پہلے تم نے اسی نارائن کے کہنے پر درجنوں معصوم بچے قتل کروادے تھے میرے معصوم بھائی کو بچانے کے لئے میرے والدین بھگتے تمہارے

کوتوں نے انہیں تمہارے حکم پر قتل کر دیا۔ میرا معصوم بھائی مر گیا بھائی پر دیپ اور بہن کو تم نے غلام بنالیا تمہیں اپنے ہر ظلم کا حساب دینا پڑے گا تمہارا یوم حساب آنے والا ہے شدت جذبات سے عثمان کی آواز کانپنے لگی تھی۔

”ہا ہا ہا..... مہاراج ہنسا۔“ پر دیپ اور مائنی کو لے آؤ نوجوان تم نے میری سب سے بڑی الجھن دور کر دی میں سوچ رہا تھا کہ تمہاری شکل صورت پر دیپ کی طرح کیوں ہے اب معلوم ہوا کہ تمہارا بھائی ہے۔“

”مہاراج کے حکم پر عثمان کو ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی اور بیس، اکیس سال کے درمیان نوجوان کو لایا گیا عثمان حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا وہ نہ عثمان کی طرح تھا دونوں کی شکل و صورت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ”چل بھئی تیرے بہن بھائی آ گئے اب ان سے آخری دفعہ ملو۔“ پر دیپ اور مائنی بھی حیرت اور خوشی کے لے جلے جذبات سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ایک طرف سے ایک ورزشی جسم کا مالک اور از قد نوجوان آیا اس نے آتے ہی عثمان کے پیٹ میں گھسنے کی زوردار ضرب لگائی عثمان اس ضرب کے لئے تیار نہ تھا تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکلی گئی اس نے اس پر گھونٹوں اور لالٹوں کی بارش کر دی۔ مائنی چلائی ”بھگوان کے لئے میرے بھیا کو مت مارو۔“

”رک جاؤ رنجیت بیٹا! یہ نہ ہو کہ یہ سے سے پہلے مر جائے۔ ابھی اسے بہت کچھ دیکھنا ہے۔“ مہاراج نے اسے روکا۔

رنجیت مائنی کی طرف بڑھا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر بولا۔ ”یہ بڑے مزے کی چیز ہے آج تک اسے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ آج تیری نظروں کے سامنے اس کے ساتھ بہت کچھ ہوگا۔“

”بکواس بند کر کے ہمت ہے تو مجھے کھول کر دیکھ۔“ عثمان چلایا۔

”تیرا ایمان بھی پورا کر دیتے ہیں بالک، کھول دو اس بکری کے بچے کو۔“ مہاراج نے اپنے کارندوں

کو حکم دیا اور بولا۔ ”ہم دھن دیجے ہیں اگر تم نے ہمارے بیٹے رنجیت کو شکست دے دی تو ہم نہ صرف تمہیں آزاد کر دیں گے بلکہ تمہارے بھائی اور بہن کو بھی چھوڑ دیں گے اگر تمہارے تو تم لوگوں کا برا حشر ہوگا۔“

عثمان کو کھول دیا گیا حویلی کے وسیع عریض صحن میں ایک طرف اکھاڑہ بنایا ہوا تھا اس اکھاڑے میں مہاراج کے سپاہیوں کو تربیت دی جاتی تھی اس کے علاوہ ان کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لئے ان کے درمیان مقابلے بھی کروائے جاتے تھے۔ عثمان اور رنجیت اکھاڑے میں آئے سامنے کھڑے تھے۔ سامنے کی نشستوں پر مہاراج، نارائن اور سپاہیوں کا سپہ سالار گوند بیٹھے تھے اکھاڑے کے اطراف درختوں کی تعداد میں یہ دلچسپ مقابلہ دیکھنے کے لئے سپاہی بھی موجود تھے۔ اس پوری ریاست میں رنجیت سے بڑا کوئی فاتح نہیں تھا، گنجی بیجے ہی رنجیت اسٹائنس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ ”آ جا میرے لال شیر سے بازوؤں کا زور دیکھیں، اس کے بعد تیری بہن کی باری ہے۔“ رنجیت نے اسے تازہ دلایا۔

عثمان غصے سے کھول ہوا جا حانہ انداز میں آگے بڑھا رنجیت بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا، اس کی فرنٹ لک زوردار انداز سے عثمان کے سینے پر لگی۔ عثمان اڑتا ہوا اکھاڑے کے فرش پر گر گیا۔ اس نے اٹھ کر دوبارہ رنجیت پر حملہ کرنا چاہا رنجیت نے فضا میں تلا بازی کھا کر فلائنگ کلک اس کے سینے پر ماری عثمان لڑنے کے فن سے نا آشنا تھا۔ چنانچہ مارشل آرٹ کے ماہر رنجیت نے بری طرح پٹ رہا تھا کچھ دیر بعد نیچے پڑا ہانپ رہا تھا اس کی بدن کا جواز جوڑ دھڑک رہا تھا رنجیت نے اسے بری طرح چٹا تھا۔ رنجیت نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر اس سے کچھ فاصلے پر پھینکا اور بولا تجھے ایک چانس دیتا ہوں خنجر اٹھا سکتا ہے تو اٹھا لے۔

عثمان ڈگڑگا ہوا بمشکل اٹھا اسی وقت رنجیت کی اسٹین کلک اس کی کینٹھی سے نکل کر اس کے ہواں ساتھ چھوڑ گئے۔

اسے ہوش آیا تو حویلی کے صحن میں ایک ستون

سے بندھا ہوا تھا قریب ہی دوسرے ستون سے اس کا ہوشکل بھائی پر دیپ رسیوں سے جکڑا ہوا تھا درو کی شدت سے اس کا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اس کے سامنے کرسیوں پر مہاراج، نارائن اور گوند بیٹھے تھے ایک طرف رنجیت اس کی بہن مائنی کا ہاتھ جکڑے کھڑا تھا مائنی اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔

لیکن رنجیت کی گرفت آہنی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر کمیشن نیچے پڑا کر رہا تھا۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی اس کے سر سمیت پورے بدن پر دی وافر مقدار میں گرایا گیا تھا قریب میں دو گھنٹہ ٹی ٹی ہاتھوں میں خونخوار دوکتوں کے زنجیریں تھامے کھڑے تھے کتے بار بار کیش کی طرف لپک رہے تھے وہی کی خوشبو انہیں پاگل کئے ہوئے تھی وہ بار بار کیش کی طرف جھپٹنے کی کوشش کر رہے تھے آج بغیر کسی نکت کے تم وقتا نشے دیکھو گے یہ سب کچھ دیکھ کر تمہیں احساس ہوگا کہ تمہارے ماما اور پتا کوہم نے کتنی آسانی سے شیشان گھاٹ پہنچایا تھا یہ کیش غدار ہے اسے معلوم بھی تھا کہ ہماری اجازت کے بغیر اس ریاست میں کسی اجنبی کو گھبراتا جرم ہے اس کے باوجود اس نے تمہیں بنا دی یہ جانتے ہوئے کہ تم ہمارے دشمن ہو اب یہ ان کوں کی خوراک بنے گا۔

مہاراج کے اشارے پر کوں کی زنجیریں کھول دی گئیں کتے بھونکتے ہوئے کمیشن پر جھپٹ پڑے فضا کیش کی چیخوں سے گونج اٹھی کتے وہی کی خوشبو سے پاگل ہو چکے تھے اور کیش۔ کوہنجوڑ کر کھا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد کیش کی خونچکان لاش پڑی تھی کوں کو قابو کر کے وہاں سے لے جایا چکا تھا مائنی درندگی سے بھرپور یہ ہولناک منظر دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی وہ بے تحاشہ چیخ رہی تھی اور درو کی بھی رنجیت روٹی بلکتی مائنی پر جھپٹ پڑا۔

”چھوڑ دے یہ غیرت اسے میں تم سب کو زندہ دفن کر دوں گا عثمان غصے سے دھاڑا۔ پر دیپ بھی چیخ چلا رہا تھا دونوں بھائی رنجیت اور مہاراج کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے بندھے ہوئے کی وجہ سے

بے بس تھے ان کی چیخ دیکار کی پرداہ کے بغیر شیطانی کھیل شروع کر دیا گیا دونوں بھائیوں نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں کچھ دیر بعد مائنی پھٹے ہوئے کپڑوں میں ایک طرف پڑی سبک رہی تھی۔

”لے جاؤ اس لڑکی کو، اور اس بکری کے بچے کو پھرے میں بند کر دو کل اس کی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔“ مہاراج نے حکم دیا۔

روٹی کسکی مائنی کو نیم عریاں حالت میں گھسیٹے ہوئے وہاں سے لے جایا گیا عثمان کو حویلی کے ایک خالی کمرے میں وکیل دیا گیا وہ کمرے کے فرش پر بیٹھا کالی دیر تک روتا رہا اس کی بہن کو اس کی نظروں کے سامنے بے آبرو کر دیا گیا تھا اور وہ اسے بچانے کے لئے کچھ بھی نہ کر پایا تھا کالی دیر تک رونے کے بعد وہ اٹھا بے تاب سے کمرے میں بیٹھنے لگا یہ ایک خالی کمرہ تھا اس کمرے میں نہ ہی کوئی روشن دان تھا اور نہ ہی کوئی کھڑکی کمرے سے نکلنے کا واحد راستہ ایک دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا کمرے میں لالچلگ کرے کو روکنے کے ہوئے تھا۔ عثمان کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے باہر سے کبھی کبھار قدموں کی چاپیں سننے پونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رات رفتہ رفتہ گزرتی جا رہی تھی ہر بیتے والا مل اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ اس کی زندگی کے گھٹنے گم ہو رہے ہیں صبح ہوتے ہی وہ درندے نہ جانے اس سے کیا سلوک کرتے۔ اس کے ارد گرد نقل و حرکت کی آوازیں اب معدوم ہوتی جا رہی تھیں حویلی کے کلین سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ارد گرد کی غیر ضروری لائٹس آف کر دی گئیں کچھ دیر بعد حویلی پر مکمل سکوت چھا چکا تھا۔ اس سکوت کو کبھی کبھار رکھوالی کے کوں کی آوازیں توڑتی تھیں۔

اچانک دروازے پر مدھم سی آہٹ سنائی دی۔ اس نے سوچا اس کا زندگی سے ناٹھوٹنے کا وقت آچکا ہے مہاراج کا کوئی ہر کارہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے آیا ہے۔ کسی نے آہٹسکی سے تالا کھولا دروازے کا ایک پٹ کھلا اور عثمان اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر بھونچکا رہ

گیا بیس بائیس سالہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کا جسم گویا سانپے میں ڈھلا ہوا تھا۔ گلابی رنگ کا ریشمی سوٹ اس کی گوری رنگ پرچہ پر ہاتھ دھو بھی چال سے چلتی ہوئی آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

عثمان نے بولنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ اس نے اپنے یا توئی ہونٹوں پر اپنی رکھ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی کے ہاتھوں میں پتل موجد تھا اس نے اشارے سے عثمان کو کمرے سے باہر نکلنے کو کہا۔

”جلدی چلو!“ وہ سرسراہٹ ہوئی سرگوشی میں بولی عثمان اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں بڑی احتیاط سے چلتے ہوئے ایک برآمدے میں جا پہنچے یہاں کی انٹس آف میں عثمان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

”یہ لڑکی کون ہے اور مجھے کہاں لے جا رہی ہے؟ اگر کسی نے مجھے اس طرح آزادی سے چوٹی میں گھونٹ دیکھ لیا تو“ یہ سوچتے ہی وہ خوف زدہ ہو گیا۔

ایک کمرے سے کسی کے خرافوں کی آواز آ رہی تھی لڑکی نے سرگوشی کی۔ ”یہاں مہاراج محو استراحت ہیں احتیاط سے چلتا۔“ وہ دونوں دبے پاؤں دروازے کے سامنے سے گزرے سامنے بیرونی دروازہ تھا۔ اندرونی عمارت سے باہر نکلنے کے لئے انہیں ایک کمرے سے

گزرنا پڑا۔ یہاں جہازی سائز بیڈ پر نجیت سو رہا تھا ابھی وہ کمرے کے وسط میں تھے کہ نجیت نے کروٹ بدلی۔

ان کا دل جیسے اچھل کر قلع میں آگیا وہ خوف سے اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے لیکن خیرت گزری وہ جاگائیں وہ احتیاط سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر چوٹی کے احاطے میں آ گئے ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ تین خونخوار کتے جارحانہ انداز میں ان کی طرف لپٹے وہ خطرناک قسم کے بلی

ڈاک تھے عثمان خوف سے کانپنے لگا ان ہی کتوں نے اس کے سامنے مکیش کو بری طرح بھینچ دیا تھا۔ کتے جیسے ہی قریب آئے لڑکی نے کتوں کو آہستگی سے پھکارا تو حیرت انگیز طور پر کتے اس کے پاؤں سے اپنا منہ رگڑنے لگے۔ کتے شاید اسے مانوس تھے۔

ادھر مورچوں میں خاموشی تھی شاید وہاں کے محافظ سردی کی وجہ سے کونے کھدروں میں دیکھے ہوئے تھے وہ سرگوشی میں بولی۔ ”جلدی باہر چلو۔“ عثمان نے اس کی ہدایت پر عمل کیا وہ چوٹی سے باہر آئے اور پھر دونوں نے ادھر ادھر دیکھا اور تیزی سے چوٹی سے دور جانے لگے کچھ دور جانے کے بعد عثمان نے دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر سیاہ رنگ کی بڑے مائٹروں والی جیپ ایک ڈھلوان پر کھڑی تھی۔ لڑکی خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور عثمان کو کہا۔ ”جیپ کو دھکا دو۔“ عثمان نے جیپ کو گلاسار دھکا دیا تو جیپ تیزی سے ڈھلوان سے لڑھکتے لگی۔ عثمان دوڑ کر جیپ میں بیٹھ گیا تھا۔

”میں مہاراج کی بیٹی اور نجیت کی بہن ہوں۔“

اس کے الفاظ ہم کی طرح عثمان کی سماعت سے نکلے۔

”تم پاگل تو نہیں ایک اجنبی کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دی اپنے بھائی اور باپ پر دوسرے مذہب کے فرقہ وارانہ دیت دی۔“ عثمان حیرت و استعجاب کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے چچا کو دوسروں پر ظلم ڈھاتے دیکھا ہے۔ میری ماما بھی ان کی ان حرکتوں سے نالاں تھیں۔ مہاراج نے سازش کر کے انہیں قتل کر دیا۔“ قتل انہوں نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ لوگ اس قتل کو حاشہ سمجھے، ہمارے پاں عورت کو بوجھ سمجھا جاتا ہے لڑکیوں کو پیرا ہوئے ہی قتل کر دیا جاتا ہے مجھ سے پہلے میری تین بہنوں کو مہاراج نے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا تھا مجھے بھی میری ماں نے بڑی مشکلوں سے بچایا جب وہ امید سے تھیں ان دنوں وہ کیسے چلی گئیں میں اپنے نانا کے گھر پیدا ہوئی زندگی کے ابتدائی دس سال وہیں گزارے میری ماں کو قتل کرنے کے بعد مہاراج مجھے چوٹی میں لے آیا میں کہنے کو راج کماری ہوں۔ لیکن اچھوتوں سے بدتر زندگی گزار رہی ہوں۔

مہاراج اور نجیت بحالت مجبوری مجھے برداشت کر رہے ہیں ایک واقعہ کے بعد ان کی مجھ سے نفرت اور بڑھ گئی۔

ہوا اس طرح کہ ہماری ریاست میں ایک مارشل آرٹ کا ماہر آ نکلا۔ اس کا نام کامران تھا بہت ہی اچھا اور مخلص انسان تھا نجیت نے ان دنوں لڑکپن سے تو جوانی میں بیانیہ قدم رکھا تھا۔

کامران سر کی مارشل آرٹ میں مہارت کی شہرت سن کر مہاراج نے انہیں نجیت کو مارشل آرٹ کی تربیت دینے کو کہا۔ وہ مہاراج کے حکم پر نجیت کو اداران کے چند خاص پرکاروں کو تربیت دینے لگے جب وہ انہیں مارشل آرٹ کی تربیت دیتے، میں کھڑکی سے سب دیکھتی رہتی وہ مجھ سے شفقت سے جوش آتے تھے چونکہ وہ ہر وقت چوٹی میں رہتے تھے اس لئے ان کے تمام معمولات میرے سامنے تھے۔ خاص طور پر جب وہ پانچویں وقت نماز پڑھتے تو میں دلچسپی سے یہ سب دیکھتی میں اکثر ان سے ان کے مذہب کے بارے میں سوالات کرتی جن کے جواب وہ قلمی بخش دیتے انہوں نے اسلام کے بارے میں بہت سی باتیں مجھے بتائیں۔

اسلام میں عورت کے حقوق کے بارے میں سن کر میں بہت متاثر ہوئی، ان کی باتیں میرے دل و دماغ پر اثر کرنے لگیں۔ میں نے خدکی میں بھی مارشل آرٹ سیکھنا چاہتی ہوں انہوں نے مہاراج سے نہ جانے کیسے مجھے مارشل آرٹ سکھانے کی اجازت لے لی، اب میں بھی ان کے زیر تربیت تھی کئی ماہ بعد جب میں مذہب اسلام کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تو میری ضد پر انہوں نے مجھے کلمہ پڑھایا۔ میرا نام راج کماری گیتا تھا جسے تبدیل کر کے انہوں نے میرا اسلامی نام صدف رکھا۔

نجیت و جین تھا دو سال میں ہی مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کر لی پھر سب کچھ ختم ہو گیا انہیں کسی طرح میرے مسلمان ہونے کی اطلاع مل گئی سر کامران کی محبت کو نجیت نے اپنے ہاتھوں سے برباد کیا ایک لڑکی تھی جو سر کامران سے محبت کرتی تھی وہ بے چاری اپنی

بے عزتی برداشت نہ کر پائی اور خودکشی کر لی۔

سر کامران کے احتجاج پر ان کی آنکھوں میں آگ میں لوہے کی کسبیں گرم کر کے ڈالی گئیں انہیں اندھا کرنے کے بعد مارا مارا کراہہ موارا کر کے جنگل میں چھوڑ دیا گیا مجھے بھی یہی طرح مارا جاتا گیا۔

رات کو آپ کی بہن پر ہونے والے ظلم کو کچھ کر میرا دل خون کے آنسوؤں ہاتھ اس غریب انسان کو بے دردی سے روند گیا رات کو آپ کی بہن نے خودکشی کر لی شاید وہ اپنی بے عزتی سہہ نہ پائی تھی۔ اس لئے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔

”میں مہاراج اور نجیت کا خون پی جاؤں گا۔ گاڑی واپس موڈ۔“ عثمان غرایا۔

”پاگل مت بنو! ان دندلوں سے نکرانا تمہارے بس کی بات نہیں قریبی ہستی میں مہاراج کے سوتیلے بھائی مکیش چاہا رہے ہیں وہ مہاراج سے بالکل مختلف ہیں مہاراج کے ظلم کی وجہ سے ان کی مہاراج سے نہیں بنتی تھی اس لئے وہ ان سے الگ ہو گئے سیدھے سادے انسان ہیں لالچ ذرا بھی نہیں۔ ہم ان سے مدد مانگیں گے ہو سکتا ہے وہ کسی طرح مہاراج سے تمہارے مشکل بھائی پر دے پ کو آ کر دوا لیں۔“

باتوں باتوں میں ان کا کافی سفر طے ہو چکا تھا ان کی گاڑی چوٹی سے کافی دور آ چکی تھی ان کا یہ سفر مزید تین گھنٹے جاری رہا۔ اب وہ جنگل کی حدود میں داخل ہو چکے تھے صدف نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اس جنگل کے پار چاچا مکیش کا علاقہ ہے جہاں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔“ یہ راستہ اگرچہ خطرناک ہے لیکن مہاراج سے محفوظ ہے ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ہم اس خطرناک جنگل میں گھس جائیں گے۔“ صدف بولی۔

صبح کے چھ بج رہے تھے جنگل میں جانور اور چرند پرند اپنی اپنی بولیوں میں اپنی موجودگی کا اظہار کر رہے تھے کوئی خطرناک ورنہ ان کے سامنے نہیں آتا تھا اس لئے وہ پرسکون تھے اب وہ جنگل میں کافی آگے پہنچ چکے تھے ان کی جیپ کی رفتار کافی کم ہو چکی

تھی ان کا سکون گولی کی آواز سے ٹوٹا۔

”گولی نامعلوم سمت سے آئی تھی جو جیب کے اگلے تار میں لگی تار دھاکے سے پھٹا اور جیب بری طرح لہرائی ان کی قسمت ابھی تھی جو جیب کی رفتار کم تھی اس لئے دونوں زخمی ہونے سے محفوظ رہے ان کے چہروں پر خوف و ہراس تھا۔

”تم یہ پھل لے لو“ صدف نے اپنا پھل اس کی طرف بڑھایا۔ ”مجھے پھل چلنا نہیں آتا وہ شرمندگی سے بولا۔

اچانک ان کی جیب کو تین رائفیل بردار افراد نے گھیر لیا ان کے چہروں پر ڈھانٹے بندھے ہوئے تھے۔ ”واہ! آج تو ہمارے دارے نیارے ہو گئے صبح ہی صبح ایک حسین شکار ملا آج تو جنگل میں منگل ہوگا۔“ ان میں سے ایک خباثت سے ہنسا اور صدف سے پھل چھین کر اسے تھپتھپ کر ایک طرف لے جانے لگا عثمان نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی بھایا دور رائفیل برداروں نے اس کی مرمت شروع کر دی اور صدف کو تھپتھپ کر لے جانے والا اچانک زمین پر گر کر ترپنے لگا۔

ایک تیر سنناہٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن میں پیوست ہو گیا تھا خون فوراً ہی کی طرح اس کی گردن سے بہہ رہا تھا چند لمحے ترپنے کے بعد وہ ساکت ہو گیا اپنے سانس کی چیخ سن کر بھایا دو تیرے چوکنے ہو کر دائرہ اور نظریں دوڑانے لگے مگر تیر انداز انہیں نظر نہ آیا وہ عثمان کو بھول کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھے اسی وقت ایک اور تیر سنناہٹ ہوا ایک ایک دوسرے ڈھانچہ پوش کے سینے میں دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔

آخری بیج جانے والے نے ایک طرف لگا تار تین فائر کئے۔ ”میں ادھر ہوں۔“ اس کے عقب سے ایک بھاری آواز گونجی وہ پھرتی سے مڑا اور آواز کی سمت فائر کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا آواز دینے والا وہاں سے بھی غائب ہو چکا تھا ڈھانچہ پوش جھنجھلاہٹ میں جھلا ہو گیا اس نے مختلف سمتوں میں کی فائر کئے۔

بائیں سمت سے آواز آئی ”پاگل کے بیج کیا

آتش بازی کر رہا ہے۔“ اس نے آواز کی سمت فائر کرنا چاہا مگر تھپتھپ کی آواز سنائی دی اور اس کی رائفیل خالی ہو چکی تھی اپنی بے وقوفی سے وہ تمام گولیاں ضائع کر چکا تھا رائفیل ایک طرف پھینک کر اپنے مردہ ساتھی کی رائفیل کی طرف لپکا کہ اچانک اس کے سامنے ایک درخت کی آڑ سے ایک دروازہ قہقہہ نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا چہرے کی رنگت گندمی، بیخیز اور ٹی شرٹ میں لمبوس آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ موجود تھا ہاتھوں میں تیر کمان اور ہولسٹر میں پھل دکھائی دے رہا تھا۔

صدف اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی ”مر کا مران یہاں کیسے؟“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایک ماہر فائر ہے اس نے اپنی آنکھوں سے چشمہ ہٹا کے عین میں اڑس لئے ڈھانچہ پوش اور عثمان حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے وہ شخص آنکھوں سے محروم تھا۔ دیکھ کر ڈھانچہ پوش کا حوصلہ بڑھ گیا کہ اس کا مقابلہ اندھا ہے وہ جاہلانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا ڈھانچہ پوش نے اس کے چہرے پر گھونٹ مارا حیرت انگیز طور پر اس نے پھرتی سے جھکا لی دیکر خود کو پتایا اور پے در پے کئی لکس اس کے جسم پر رسید کر دیں ڈھانچہ پوش کا ہر وار وہ انتہائی مہارت سے روک کر اس کی پٹائی کر رہا تھا چند لمحوں بعد ڈھانچہ پوش زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ وہ پر اعتماد انداز میں اس کی طرف لپکا اس کی گردن کو پکڑ کر مخصوص انداز سے جھکا دیا تو کڑا کے کی آواز کے ساتھ ڈھانچہ پوش کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

اب وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا ”تم لوگ کون ہو اور صبح ہی صبح اس جنگل میں کیا کر رہے ہو؟“

سر میں صدف ہوں مہاراج کی بیٹی اور میرے ساتھ عثمان ہے اس کا تعلق پاکستان سے ہے صدف نے عثمان کی پوری روداد اسے سنا ڈالی۔

عثمان بولا ”تم انکھیں نہ ہونے کے باوجود آپ نے تین خطرناک ڈاکوؤں کا مقابلہ جس مہارت سے کیا

وہ ناقابل یقین ہے۔“

”ایسا کرتے ہیں یہاں سے کچھ فاصلے پر میری جھونپڑی ہے وہاں چلتے ہیں باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“ وہ انہیں لے کر ایک سمت چل دیا۔

اس نے اپنی داستان سنانا شروع کی۔ ”میرا نام کامران ہے، میں بچپن ہی سے مارشل آرٹ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ مجھے جنون کی حد تک مارشل آرٹ سے دلچسپی تھی۔ اپنے والدین کی اگلوٹی اولاد تھا۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ کی جہاں جہاں اس فن کا ماہر مجھے ملا ہے اس سے کچھ سیکھ چکا گیا۔ میرا مشغلہ صرف سیر و سیاحت اور مارشل آرٹ تک محدود تھا۔ اس فن کو سیکھنے کے لئے میں جاپان تک گیا پانچ سال وہاں گزارے۔ پھر ایک روز یہاں کے جنگلات میں گھومنے آیا اور ایک لڑکی ساوتری کو دل دے بیٹھا وہ بھی مجھ سے متاثر تھی۔ ہم دونوں کے پیار پر اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ ہندو میں مسلمان اس کے باوجود ہم دونوں شدت سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ہمارے درمیان مذہب کی دیوار حائل نہ تھی اسی دوران مہاراج کو میری مارشل آرٹ میں مہارت کی خبر ہو گئی اس نے مجھے آفر کی کہ میں اس کے بیٹے رنجیت اور اس کے خاص کارندوں کو مارشل آرٹ کی تربیت دوں۔ حوصلے میں اکھاڑہ بنایا گیا میں رنجیت اور اس کے خاص ہرکاروں کو تربیت دینے لگا۔

لگ بھگ 2 سال میں وہاں جانا رہا۔ رنجیت اپنی دلچسپی اور محنت سے جلد ہی مارشل آرٹ میں ماہر ہو گیا راج کماری جو اس وقت موجود ہے اس کو بھی مارشل آرٹ سکھانے لگا۔ اللہ نے اسے ہدایت دینی تھی اسے اسلام سے دلچسپی ہو گئی بلاخرہ وہ مسلمان ہو گئی میں نے اس کا نام صدف حسین تجویز کیا۔ نہ جانے کیسے مہاراج اور رنجیت کو اس بات کی خبر ہو گئی۔ ان ہی دنوں اس کی گندمی نظریں ساوتری پر پڑیں اس نے میری لاعلمی میں ساوتری کو اغوا کر لیا۔

زبردستی اس کی عزت لوٹ لی وہ اپنی بے حسی

سہ نہ پائی میرے نام خط میں سب کچھ لکھ کر خود کشی کر لی میرے دل میں آتش فشاں بھڑک اٹھا میں طوفان کی طرح حوصلے پر چڑھ دوڑا میرے ہاتھوں اٹھ کے قریب سپاہی مارے گئے میں اکیلا تھا وہ سینکڑوں مجھے پکڑ کر بے بس کر دیا گیا میری آنکھیں پھوڑ کر مجھے جنگل میں پھنکوا دیا گیا ساوتری کے والدین اس کے غم میں گھل کر مر گئے میں نے جنگل میں چھٹی بنالی۔

”عثمان بولا آپ بتا دیجئے اتنی مہارت سے کیسے لڑ لیتے ہیں۔ اور بنا دیکھے ہدف کا درست نشانہ کیسے لیتے ہیں؟“

میں آواز کی سمت کا اندازہ لگانا ہوں۔ میں بلاسٹ فائر کا بھی ماہر ہوں اندھا ہونے سے پہلے اکثر آنکھوں پر پٹی باندھ کر فائر کرتا تھا۔ آنکھوں کی روشنی جانے کے بعد اس مہارت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ کامران نے جواب دیا۔

”سر پلیز! خدا کے لئے میری مدد کریں زندگی میں کبھی بھی لڑائی جھگڑے سے میرا واسطہ نہیں پڑا آپ مجھے مارشل آرٹ سکھائیں تاکہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ اپنے ماں، باپ، بہن کا بدلہ اس ظالم انسان سے لے سکوں اور یہاں کے مظلوم لوگوں کو ان شیطانوں سے نجات دلاؤں۔ عثمان اسے امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مسٹر عثمان مارشل آرٹ کو آسان مت سمجھو یہ انتہائی کٹھن آرٹ ہے اسے سیکھنے کے لئے اپنے جسم کو تکلیف پہنچانے کا عادی بنانا پڑتا ہے اس قدر عادی کہ ہر چوٹ پر مسکراؤ موسم کے جبر کو جھیلو تھر کے تپے ریگستانوں میں ہماری طرح کے انسان جیسے ہیں ان کے جسم گری سہنے کے عادی ہوتے ہیں برقائی علاقے میں برف کے نیچے سخت سردی میں جاندار رہتے ہیں۔ سب سے پہلے درو کو سہنا سیکھو۔ جب تم حد سے بو جھتی تکلیف پر مسکرانے لگو تو سمجھو یہ لیتا تم مارشل آرٹ سیکھ سکتے ہو۔ جہاں درد اور اذیت کی حد ختم ہوتی ہیں وہیں سے انسان کی جیت شروع ہوتی ہے۔“

عثمان پوری توجہ اور انہماک سے کامران کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کا کہا ہوا ہر لفظ اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔

”سب سے پہلے میں تمہارا ایک امتحان لوں گا۔ تم اس امتحان میں پورے اترتے تو تمہیں مارشل آرٹ کی تربیت دوں گا۔“

”سر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی توقعات پر پورا اتر دوں گا۔“ کامران مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھا ایک جگہ بیٹھنے کی نصیحت ورجن خالی بوتلیں پڑی تھیں۔ کامران نے بوتلیں اٹھائیں اور عمان کو جھوپڑی سے باہر نکلنے کو کہا۔ وہ اس کے ہمراہ جھوپڑی سے باہر نکلا صدف بھی حیران پریشان باہر نکل آئی باہر آتے ہی کامران نے ایک ایک کر کے ساری بوتلیں زمین پر توڑ ڈالیں وہ دونوں حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

”عثمان اپنے پاؤں سے جوتے اتار کر ایک طرف پھینک دو اور ان کاچے کے ٹکڑوں پر آنکھیں بند کر کے چلتے ہوئے میرے پاس آ جاؤ یہ تمہاری برداشت کا امتحان ہے۔“ عثمان سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا ہوا گھبرا گئے خبر میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم تکلیف سہہ نہ پاؤں گے۔“ وہ بولا۔

عثمان غصے سے جھنجھلا اٹھا اس نے جوتے اتارے اور آنکھیں بند کر کے قدم آگے بڑھا دیے دائیں پاؤں میں کاچے کا پڑا سا ٹکڑا پیوست ہوتے ہی اس کے منہ سے سسکاری سی نکلی دردی شدت سے اس کا پورا وجود کپکپا اٹھا۔ اس نے لب بھینچے اور دوسرا قدم آگے بڑھا دیا اس کے منہ سے سسکاری نکلی وہ لڑکھایا بھٹکل سنبھلا اور آگے بڑھا۔ بلا آخر کامران کے قریب پہنچ کر گر گیا۔

صدف نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تھیں عثمان کے پاؤں بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ کامران نے اسے اٹھایا اور جھوپڑی میں لے جا کر چٹائی پر لٹا دیا۔ اس کے بعد ایک طرف پڑی بیٹنی سے میڈیکل کٹ نکالی اور عثمان کے پاؤں میں پیوست کاچے کے ٹکڑے نکالنے کے

بعد اس کے زخموں پر مرہم لگانے لگا چند روز میں اس کے پاؤں کے زخم ٹھیک ہو گئے۔

عثمان اور صدف شب و روز جنگل میں کامران کے ساتھ گزارنے لگے کامران نے عثمان پر ختیموں کی انتہا کردی ہر وقت انتہائی سخت قسم کی ایکسرسائز کرواتا سارا سارا دن اسے تیز رفتاری سے دوڑنا پڑتا درختوں پر عثمان کو لگک بیچ مارنے کا حکم دیتا کئی کئی گھنٹے سینڈ بیگ پر اسے مصروف رکھتا عثمان کے ہاتھ پاؤں لہو لہان ہو جاتے ٹائنگر کی سیاہ رنگت کا گھوڑا کامران کا پسندیدہ گھوڑا تھا۔

کامران خود گھوڑے پر سوار ہوتا اور عثمان کو بھاگنے کا حکم دیتا۔ عثمان آگے آگے بھاگتا وہ اس کے پیچھے گھوڑے پر ہوتا۔ جہاں کہیں عثمان کے قدم ڈراست ہوتے وہ قریب پہنچ کر عثمان کے جسم پر اپنے ہاتھوں میں موجود ہتھ سے وار کرتا۔ دن میں ایک آدھ دفعہ خود بھی اس سے لڑتا عثمان بری طرح اس کے ہاتھوں پٹتا۔ اب عثمان کو کسی بھی قسم کی چوٹ اذیت پہنچانے کے بجائے لطف دیتی تھی۔

وہ جتنا عرصہ وہاں رہے جنگل سے باہر کی دنیا کو یکسر فراموش کر چکے تھے عثمان مارشل آرٹ میں مہارت اختیار کرتا جا رہا تھا خجڑی، من، چکو، شیشیر زنی اسٹک فائنڈ رائفل اور پستل سے نشانہ بازی تیر اندازی غرض کہ ہر قسم کی لڑائی کا ماہر ہو چکا تھا۔ ان کی گزربسر چھوٹے موٹے شکار کئے ہوئے جانوروں سے ہو رہی تھی۔

عثمان اور صدف کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ایک بے نام سی الفت جنم لے چکی تھی وہ نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے حال دل کہہ ڈالتے تھے۔

کامران فائزر ہونے کے ساتھ ساتھ پانچ وقت کا نماز بھی پڑھتا تھا اس نے عثمان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

ایک روز عثمان نے اس سے جانے کی اجازت

چاہی وہ بولا۔ ”اب تم فولاد میں دھل چکے ہو جانا چاہتے ہو تو بے شک جاؤ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا جذبات میں کبھی نہ آنا حصہ اور جذبات فائزر کو کنٹرول کر دیتے ہیں۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“ عثمان نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

”نہیں دوست میری زندگی کی شام اب اسی جنگل میں ہوگی۔“ کامران او اس لہجے میں بولا۔

”سر میں آپ کے احسان کا بدلہ ساری زندگی نہیں چکا سکتا۔“

”تم مہاراج اور اس کے ٹولے خاص کر نجیت کو یکسر کر دار تک پہنچا کر سادتری کی روح کو سکون پہنچا سکتے ہو۔ جس دن تم نے ایسا کر لیا کھجور میرا شاگرد ہونے کا حق ادا کر دیا۔“ کامران کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ تھی۔

دوسرے روز علی الصبح وہ کامران سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے اس بار سر کامران کے پسندیدہ گھوڑے پر سوار عثمان اسے تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا۔ صدف عثمان کی کمر میں بازو دھال کے اس کے پیچھے بیٹھی تھی اس کے گداز جسم کا لمس عثمان کے سینے میں پھیل چکا تھا۔

کئی گھنٹوں بعد وہ جنگل کی حدود سے بخیر وعافیت باہر نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے گھوڑے کی پیٹھ پر کئی گھنٹوں سے بیٹھے رہنے کی وجہ سے وہ تھک چکے تھے وہاں گھوڑے کی پشت سے اتر کر پیدل چلنے لگے ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی وہ بھینکنے لگے پھر عثمان نے اپنی جیکٹ اتار کر صدف کو پہنا دی۔ وہ اسے مشکور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرا دی۔ اور بولی۔ ”میں کھٹن راستوں پر تمہارے ساتھ ہوں منزل پر پہنچ کر مجھے تہنا تو نہیں چھوڑ دو گے؟“

عثمان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا صدف کی خوبصورت آنکھوں میں پیار کا سمندر بھرا نظر آیا۔ ”دیکھو صدف میرا راستہ بڑا کٹھن ہے ہزاروں

آزائشیں ہیں بہت سے امتحان ہیں۔ ان سب سے گزر کر اگر زندہ رہا تو وہ وعدہ کرتا ہوں تمہیں اپنی زندگی کا ہمسفر ضرور بنانوں گا۔

چلتے چلتے وہ اچانک ٹھٹھک کر رک گئے ایک کٹیا سی نظر آ رہی تھی جس کے دروازے پر بھاری بھر کم پردہ لٹک رہا تھا وہ حیرت زدہ سے اس طرف چل پڑے۔ ”چلو دیکھتے ہیں اس دیرانے میں کون رہتا ہے؟“ عثمان بولا اور دروازے سے پردہ ہٹا کر صدف کے ہمراہ اندر داخل ہو گیا۔

اندر ایک طرف نورانی چہرے والے بزرگ بیٹھے آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے ان کے سامنے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی سر جھکائے بیٹھی تھی وہ دونوں ان سے کچھ فاصلے پر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ”تم لوگ کھڑے کیوں ہو اگر اندر آ ہی گئے تو ہو تو بیٹھ جاؤ۔“ بابا آنکھیں بند کئے ہوئے بولے وہوں لڑکی سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔

”بیٹا گھبراؤ مت اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں بابائے آنکھیں کھول دیں۔ اور مسکرائی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ بابا جی اجازت ہو تو میں جاؤں۔ لڑکی نقرائی آواز میں بولی اس کی خوبصورت آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی بابائے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اگلا یہی لمحہ انہیں حیرت اور خوف میں مبتلا کر گیا لڑکی بیٹھے بیٹھے اچانک غائب ہو چکی تھی۔

”یہ..... کک..... کون تھی؟“ صدف نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”بیٹا ایک نیک روح تھی۔“

”بابا آپ ہماری کامیابی کے لئے دعا کریں۔ ہم پر بہت مشکل دور گزرے ہیں آنے والا وقت بھی کڑی آزمائش کا ہے۔“ عثمان نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس وقت شمال کی طرف محسوس ہو، اپنا رخ تبدیل کر کے مشرق کی طرف چل پڑو اللہ بہتر کرے گا۔“ بابائے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے وہ کچھ دیر وہیں

بیٹھے رہے بارش تھم چکی تھی اس لئے بابا سے اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

شمال کی طرف مہاراج کی حویلی تھی بابا نے نہ جانے کس وجہ سے وہاں جانے سے منع کیا تھا وہ اس وقت گھوڑے پر سوار مشرق کی سمت جا رہے تھے۔ ”اس سمت تو میرے اٹکل کا گھر ہے۔“ صدف بولی۔

وہ شام ڈھلے اس سرسبز علاقے میں پہنچے چاروں طرف کچے مکانات تھے صدف کا چایا کنیش ایک بہت بڑی وسیع حویلی میں رہتا تھا مختصر فیملی تھی ایک اٹھارہ سالہ بیٹی دیویا اور پچیس سالہ بیٹا جگوش اور چھ بیٹا بہت ہی مہربان عورت تھی انہوں نے خندہ پیشانی سے ان دونوں کا استقبال کیا ان کی روداد کنیش چاچا آبدیدہ ہو گئے۔

”مہاراج کی ان ہی حرکتوں سے نالاں ہو کر میں نے اس کا ساتھ چھوڑا ہے۔ مہاراج کے سپاہی تین چار بار تم لوگوں کی تلاش میں یہاں آچکے ہیں شاید اسے یقین ہے تم یہیں کا رخ کرو گے پھر لوگ گھبراؤ مت جب تک میں یہاں ہوں آخری سانس تک تم لوگوں کی حفاظت کروں گا میرے جیسے جی تمہارا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا“ کھانے کے بعد انہوں نے کافی دیر تک کپ شپ لگائی پھر سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

عثمان کو ایک الگ کمرہ دیا گیا وہ جاتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا انہیں وہاں رہتے ہوئے ہفتہ سے زائد وقت بیت چکا تھا اس دوران صدف اور عثمان نے کافی کوشش کر کنیش چاچا کسی طرح مہاراج کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائیں مگر مہاراج کے خلاف کسی قسم کا قدم اٹھانے سے ہچکچاہے تھے۔

ایک روز رات کے وقت عثمان نے صدف کے نام خط لکھا۔ ”بیاری صدف مہاراج کے مظالم جب میری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں میرا خون گھول اٹھتا ہے میں سر پر کفن باندھ کر مہاراج کی طرف جا رہا ہوں تم میرے حق میں دعا کرنا اور ہمیں اپنے چاچا کے پاس رہنا اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ اس نے خط لکھ کر اپنے کمرے میں

رکھی میز پر رکھا اور خاموشی سے رات کے اندھیرے میں کمرے سے باہر نکلا اس نے اصلیل میں جا کر اپنا گھوڑا کھولا اور اس کی لگام تھام کر چٹا ہوا گیسٹ تک جا پہنچا۔ گیسٹ پر موجود سپرے دار اسے گھوڑے سمیت آدھی رات کو گیسٹ پر دیکھ کر چونک پڑے۔ ”خیریت تو ہے رات کے سے کہاں جا رہے ہیں؟“ ایک سپرے دار نے پوچھا۔

”گیٹ کھولو مجھے ایمر جنسی جانا ہے۔ کنیش جی کو بتا کر آ رہا ہوں۔“

”لیکن رات کے اس سے؟“ سپرے دار نے کہا نا چاہا۔

”در اصل رات کے وقت مجبوری میں جانا پڑ رہا ہے۔“

عثمان نے کہا سپرے دار بالکل جھٹکا تھے عثمان کے اصرار پر گیسٹ کھول دیا گیا وہ گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے نکل گیا۔

صبح کے وقت اس کا گھوڑا جنگل کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے مہاراج تک پہنچنے کے لئے اس جنگل کو پار کرنا تھا اس کا گھوڑا جنگل میں سرپٹ دوڑ رہا تھا کہ اچانک فائر کی ہولناک آواز سے جنگل کی فضا گونج اٹھی اس نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر دی وہ چونکا ہو چکا تھا اسی وقت بے درپے کئی فائر ہوئے فائرنگ قریب ہی کہیں ہو رہی تھی گھوڑے کو روک کر نیچے اترا گھوڑے کو قریبی درخت سے باندھ کر وہ پیدل ہی اس سمت چل پڑا جہاں سے گولیوں کی آواز آ رہی تھی اس وقت دوبارہ بے درپے فائر ہوئے اور ساتھ ہی ایک کرب میں ڈوبی انسانی چیخ سنائی دی اسے راستہ مانوس لگ رہا تھا وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آگیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر اس کے محسن سرکار مان کی جھوپڑی تھی جس کے سامنے تین افراد کی خون میں لت پت لاشیں پڑی تھیں اسی وقت جھوپڑی کے سامنے ایک درخت کی آڑ سے فائر ہوا وہ کرانگ کرتا ہوا اس طرف بڑھا اسی وقت درخت کے

پہنچے چھپا شخص چلا یا۔

”اندھے ہم ہم جانتے ہیں تمہیں گولی لگ چکی ہے اور تم شدید زخمی ہو تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ ہتھیار ڈال کر ہمارے سامنے آ جاؤ ورنہ اس جنگل کو تمہارے لئے شمشان گھاٹ بنادیں گے۔“ اس دھمکی کے جواب میں ایک دوسرے درخت کی آڑ سے دھمکی دینے والے پر پٹل سے فائر کیا گیا گولی دھمکی دینے والے کے سر میں لگی وہ چیخا ہوا زمین پر گر پڑا۔

اسی وقت مختلف سمتوں سے درخت کی آڑ میں چھپے کامران پر فائرنگ کی گئی عثمان کرانگ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے رکانا پڑا ایک لاش اس کے راستے میں پڑی تھی راقفل اب تک اس لاش کے ہاتھوں میں موجود تھی گویا وہ مرنے کے بعد بھی مزاحمت کا ارادہ رکھتا تھا عثمان نے راقفل اس کے ہاتھوں سے نکالی اور دوبارہ کرانگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ جہاں اس کے اندازے کے مطابق کامران زخمی حالت میں موجود تھا۔

اچانک عثمان پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی شاید اسے دیکھ لیا گیا تھا لیکن تب تک وہ لکڑیوں کے ایک بڑے ڈھیر کے عقب میں پھنچ چکا تھا۔ اس پر فائر کرنے والا ایک درخت کی آڑ میں چھپا ہوا تھا عثمان نے ذرا سا سر باہر نکال کر اس درخت کی طرف دیکھا جس کی آڑ میں اس کے اندازے کے مطابق کامران چھپا ہوا تھا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیا جس کا داغ مطلب تھا کہ وہ کہیں چھپا ہوا نارنگ فائرنگ سے محفوظ تھا عثمان نے اپنی گن سیدھی کی لاک پن بٹائی اور کرانگ کرتا ہوا لکڑیوں کے ڈھیر کی انہیں سمت پہنچا۔ اس نے درخت کی سمت نال کا رخ کیا اور دشمن کو کھوجے لگا۔

آج اس کی صلاحیتوں کا امتحان تھا اس کا استاد اور محسن شدید زخمی تھا جسے اس نے بچانا تھا اس نے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا لیٹے لیٹے ایک طرف پھینکا کھٹکا ہوا۔ دشمن نے فوراً اس سمت فائر کیا جہاں لکڑی گری تھی۔ فائر کرنے والے کے سامنے آتے ہی اس نے چند سیکنڈ کی بھی دیر نہ کی نشانہ لیا اور گولی داغ دی۔ فضا میں ایک

دلہوز چیخ سے لرز اٹھی حملہ آور زمین پر گر کر ساکت ہو گیا مختلف سمتوں سے عثمان پر فائرنگ ہونے لگی چاروں طرف بارود کی بو بکھیل چکی تھی وہ چند لمحوں پہنچ کر دیکار پامچرایک درخت کی آڑ میں جا پہنچا اب فائرنگ رک چکی تھی شاید دشمن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی گولیاں ضائع کر رہا ہے کامران کی طرف سے بھی کوئی فائر نہیں ہو رہا تھا شاید وہ بے ہوش تھا یا اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا وہ مضطرب ہو گیا زیادہ انتظار فضول تھا وہ لمبی کی طرح سبک رفتار سے درخت پر چڑھ کر گھسنے چٹوں میں روپوش ہو گیا۔ اب تک اس پر کسی بھی طرف سے فائر نہ ہوا تھا۔ اسے حوصلہ ہوا کہ دشمن درخت پر اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ وہ بلندی سے چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔

اچانک اسے ایک درخت کی آڑ سے ایک سر ابھرتا دکھائی دیا اس نے گن سیدھی کی اور فائر کر دیا گولی درخت کی آڑ سے ابھرنے والے سر میں پیوست ہو گئی وہ چیخا ہوا زمین بوس ہو گیا اس کے کسی ساتھی نے درخت پر بے درپے کئی فائر کئے خوش قسمتی سے عثمان محفوظ تھا گولیاں اس کے ارد گرد سے گزر رہی تھیں اب عثمان پر ایک ہی گن سے فائر ہو رہے تھے اس نے اندازہ لگایا کہ ان کے تقریباً سارے دشمن جہنم رسید ہو چکے ہیں صرف ایک ہی باقی ہے وہ کچھ دیر درخت پر دبکا رہا۔ وہ محتاط انداز سے اترا اور کرانگ کرتا ہوا ایک دوسرے درخت کی آڑ میں چلا گیا۔

اچانک ایک طرف سے پٹل سے دائیں سمت والے درخت کی آڑ میں موجود شخص پر فائر کیا گیا جواب میں وہاں چھپے شخص نے باہر نکل کر بے درپے فائر کئے یہی اس کی حادثہ تھی عثمان نے اس کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر دوبارہ کئے دونوں گولیاں اس کی ٹانگوں پر لگیں وہ چیخا ہوا گر اور بری طرح تڑپنے لگا عثمان پھرتی سے اس کی طرف بھاگا وہ خاصا قوی تھیل اور خوفناک شکل کا مالک تھا بڑی بڑی سیاہ موٹھیں اس کے چہرے کو مزید خوف ناک بنا رہی تھیں۔ اس کی گن ایک طرف پڑی تھی

اور وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔

عثمان نے اپنی گن اس پر تان لی تو وہ شخص بولا "۔

مہم میں..... مہاراج کا سپاہی اچھے ہوں۔" اس نے جواب دیا خوف اچھے کے چہرے سے عیاں تھا۔

اسی اثناء میں ایک درخت کی آڑ سے شدید زخمی کامران گرنا پڑا باہر نکلا وہ بری طرح گھائل تھا اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا کپڑے خون میں تر ہو چکے تھے

"تم لوگوں نے کامران سر کو کیوں زخمی کیا؟" عثمان نے پوچھا۔

یہ درپہ اس کی پسیلوں پر ٹھوکریں ماریں اس کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔ "بھگوان کے لئے مجھے مت بارد

مہاراج نے ہمیں تمہیں دھوئیں نے کا حکم دیا تھا ہم جنگل سے گزر رہے تھے کہ راجا بھکاری کی جیب پر نظر پڑی کچھ

فاصلے پر چھوٹی مودی جی کامران سے تم لوگوں کا پوچھا تو اس نے بتانے سے انکار کر دیا اور ہم سے بھڑ گیا اور اس

جھڑپ میں کامران کے ہاتھوں ہمارے تین ساتھی مارے گئے۔" وہ تھوک لنگ کر بولا۔

"تم کتنے افراد تھے؟"

"مجھ سمیت ہم آٹھ ساتھی تھے سوائے میرے سب کے سب مارے گئے۔" بھگوان کے لئے مجھے

چھوڑ دو اس نے عثمان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

کامران عثمان کے کاندھے پر ہاتھ رکھے بے شکل کھڑا تھا۔ "میرا بھائی کیسا ہے اور کہاں ہے؟" عثمان نے پوچھا۔

"مہاراج کی قید میں آج سے چار دن بعد ایک مقابلہ ہے اس مقابلے والے دن اسے پھانسی دے دی جائے گی۔" وہ بولا۔

"مقابلے کے روز کیا مطلب ہے؟" عثمان نے پوچھا۔

ہر سال حویلی کے باہر فردی کو ذرا زانی کا مقابلہ ہوتا ہے اس کے مقابلے کا فاتح ہمیشہ سے مہاراج کا بیٹا ہوتا ہے کوئی مشکل سے ہی اس کے مقابلے میں آتا ہے جو آتا ہے مارا جاتا ہے اس مقابلے کا دستور ہے

کہ لڑائی ایک حریف کے مرنے تک جاری رہتی ہے فاتح

فائز کو مہاراج بڑے انعام دیتا ہے۔" اچھے نے جواب دیا اس کی آواز خوف سے ڈوبنے لگی تھی۔

اسی لمحے کامران لڑکھڑا کر گزرا عثمان نے ٹریگر دبا دیا گولی اچھے کی پیشانی میں لگی اس نے نفرت سے اس کی لاش کو ٹھوکر ماری اور کامران کے سر کو گود میں لے

لیا۔ "کیا ہوا سر؟"

کلک..... کچھ نہیں، میرا..... وقت..... پورا ہو چکا ہے وہ دور آسمانوں میں میرا انتظار کر رہی ہے

مجھے یہی دفتا دینا۔" اس نے پگھلی لی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

کانی دیر تک وہ کامران کے بے جان دھود سے لپٹ کر رہتا رہا کچھ دیر بعد چھوٹی سی کراٹھ لٹھکی

اور اس کے لئے قبر تیار کرنے لگا کامران کو دفن کرنے کے بعد فاتح پر بھی اور بوجھل دل کے ساتھ گھوڑے پر

بیٹھ کر روانہ ہو گیا راجا عشق کا مسافر اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔

عثمان کا گھوڑا جنگل میں سر پیٹ دوڑ رہا تھا رات کے تقریباً گیارہ بجے وہ مہاراج کی ریاست کی حدود میں

داخل ہو گیا تھا اس نے گھوڑے کو آواز دیا راتفل ہاتھوں میں تھا مہاراج کی حویلی کی طرف بڑھنے لگا

حویلی سے کچھ فاصلے پر جا کے رک گیا وہ نظریں گھما کر چاروں طرف جائزہ لے رہا تھا۔ حویلی کے سامنے

والی سمت چار سپاہی پہرہ ادا رہے تھے وہ دو دو کی ٹویلوں میں گشت کر رہے تھے وہ سش دھج میں پڑ گیا یہاں سے

حویلی کے اندر جانا ناممکن تھا، وہ کرائنگ کرتا ہوا وسیع دیرین حویلی کے باغے سمت گیا وہاں بھی یہی پوزیشن

تھی وہاں سے گھوم کر حویلی کی پشت پر گیا وہاں جھانپاں کثرت سے موجود تھی حویلی کی پشت پر ایک چھوٹا سا کمرہ

بنا ہوا تھا جس کی لائٹ آف تھی اس نے سوچا شاید یہاں کے گارڈ بیدار نہ ہوں میں کمرے میں دھک کے بیٹھے ہیں

وہ دیوار کا معائنہ کرنے لگا۔

دیوار کانٹوں اور چھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اگر کسی طرح اوپر چڑھ بھی جاتا تو دیوار کے چاروں کونوں پر چار جھانٹیں چڑھیں جن میں ہر وقت سب سپاہی

موجود تھے۔ اچاکہ اس کی نظر دیوار کے قریب موجود ایک لمبے چوڑے درخت پر پڑی وہ درخت کی طرف

بڑھنے لگا اسی وقت چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی باہر نکلا۔ "کون ہے ادھر؟"

عثمان پر نظر پڑے ہی اس نے لٹاکر پوچھا۔

عثمان نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ سپاہی نے فاتح کیا اس کا نشانہ خطا گیا مگر گولی کی آواز سے بھگدڑ مچ

گئی چاروں طرف سے "پکڑو جانے نہ پائے" کی آوازیں آنے لگیں۔

عثمان تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر اپنے پیچھے آنے والے سپاہیوں

پر چند فاتح کے اور دوبارہ نیک نیک انداز میں بھاگنے لگا اس پر چھپا کرنے والے سپاہیوں نے جوابی فاتح کے

خوش قسمتی سے گولیاں اس کے قریب سے گزرنے لگیں۔ گارڈز موت کے ہر کاروں کی طرح اس کے پیچھے تھے۔

اس کے بھاگنے کی رفتار بہت تیزی سے بھاگتے بھاگتے ایک کھلی میں داخل ہوا۔ دونوں اطراف میں مکانات بنے

ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے بھاگنے والے گارڈز نے فاتح کے اس بار بھی ان کا نشانہ خطا ہو گیا اس نے

مڑ کر فاتح کرنا چاہا مگر ٹھنک کی آواز سنائی دی گولیاں ختم ہو چکی تھیں بھاگتے بھاگتے داخل ہو گیا

کرتیزی سے کھلی کے اختتام پر دوسری کھلی میں داخل ہو گیا بھاگتے بھاگتے اس نے مڑ کر دیکھا سپاہی ابھی تک پچھلی

کھلی میں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی دکھائی نہ دے رہا تھا لیکن کسی بھی لمحہ اس کھلی میں پہنچ سکتے تھے۔ وہ لمبی کی طرح

پھر سے ایک مکان کی دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔

گھر کے صحن میں ایک نوجوان خوبصورت لڑکی آکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی لڑکی نے

چیتنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ لیا اس نے اپنی پنڈی سے باغہ خارج نکالا

اور لڑکی کی شہ پر رکھ دیا۔ "خبردار! شور مچاؤ گی تو اس سے پہلے تمہاری خوبصورت گردن پر خنجر پھیر دوں گا۔"

"دیکھو پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی زندہ

رہنا چاہتی ہوں اس لئے شونہیں مچاؤں گی مگر تم کون ہو اور اس طرح میرے گھر میں گھس کر مجھے کیوں دھمکا رہے ہو؟"

"مہاراج کے کتے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں میں ان کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا۔" عثمان فرمایا۔

"پھر تو وہ ضرور ہر گھری تلخا لیں گے یہاں بھی آئیں گے یہ خنجر ہمارے پیچھے چھوڑ دو، میں تمہیں

پھانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"میں تم پر کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں؟"

"دیکھو مجھے مار کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوگا ابلا خربڑے جاؤ گے اسی لئے تمہاری بہتری اسی

میں ہے کہ مجھ پر بھروسہ کر دو۔"

عثمان نے لمحہ بھر کے لئے سوچا لڑکی کی بات اسے مقبول لگی۔ اس نے اسے چھوڑ دیا اور خنجر دوبارہ

پنڈی سے باندھ دیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر زور دار قسم کی دستک ہوئی۔

لڑکی نے ہاتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھولا اور پوچھا۔ "کون ہے؟" باہر سے آواز آئی۔ ہم مہاراج

کے آدمی ہیں مہاراج کا ایک دشمن ادھر آج ہے وہ اس گلی کے کسی گھر میں گھس گیا ہے ہمیں تمہارے گھر کی تلاشی

لینی ہے۔"

لڑکی نے اپنے گیلے بدن پر جلدی سے کپڑے پہنے اور دروازہ کھول دیا دروازے پر تین سپاہی ہاتھوں میں

راٹھلیں تھامے کھڑے تھے۔ سپاہیوں نے دیکھا لڑکی کے گیلے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی

تھیں۔ "یہاں کوئی نہیں آیا تم چاہو تو تلاشی لے سکتے ہو۔"

سپاہی اندر آئے کمرد چھت کی تلاشی لی ہاتھ روم کا دروازہ لٹکا سا کھول کر دیکھا وہاں بھی کوئی نہ تھا وہ

ملاؤں ہو کر باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی لڑکی نے آواز لگائی "وہ چلے گئے ہیں باہر آ جاؤ۔"

عثمان پانی کی ٹنگی سے باہر آ گیا اس کے کپڑے پانی میں شراورد ہو چکے تھے۔ "مجھے نہیں آتا کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں ہند ہونے کے باوجود تم نے ایک

مسلمان کی زندگی بھائی ہے۔

وہ بولی۔ ”تم مسلمان ہو کر بھی ان بھائیوں سے بہتر ہو۔ تم نے اب تک مجھے میلی نظر سے نہیں دیکھا جبکہ مہاراج جو کہ میرا ہم مذہب بھی ہے اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا میرے ماتا پتا اور بھائی کو احتجاج کرنے پر ٹل کر مڑا دیا۔ اسی شیطان کی وجہ سے میں تنہا رہتی ہوں اور گناہ آلود زندگی بسر کر رہی ہوں۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس وقت وہ ایک کمرے میں موجود تھے عثمان لباس تبدیل کر چکا تھا۔ ان کے درمیان کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ عثمان نے اپنی روادار اسے سنائی لڑکی کا نام پوچھا۔ کہنے لگی۔ ”گلتا ہے مہاراج کا اہم سنگسار ہونے والا ہے اس ریاست میں آج ایک دوسرے باغی نے جنم لیا ہے۔“

”دوسرے باغی سے کیا مراد ہے؟“ عثمان چونک پڑا۔

”اگر جن پاڑے مہاراج کا سب سے بڑا دشمن ہے اس کا تعلق اچھوت برادری سے تھا۔ مہاراج نے شادی کے پہلے روز اس کی پتی کو اغوا کر دیا۔ پاڑے کے گھرانے کے احتجاج پر سب کو زندہ جلا ڈالا۔ پاڑے نے ظالم مہاراج کے ظلم کا شکار دوسرے افراد کے ساتھ مل کر باغیوں کا ایک گروپ بنالیا جو مہاراج کے خلاف ہے مگر وہ آج تک مہاراج کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔“ پونم نے تفصیل سے اسے پاڑے کے بارے میں بتایا۔

”سنو! میں آج یہیں رہوں گا تم مجھے کل کے میلے میں ہونے والی فائنلنگ کے بارے میں بتاؤ۔“ عثمان نے پوچھا۔

”یہ مقابلہ گزشتہ کئی سالوں سے حویلی کے باہر ایک میدان میں ہوتا ہے شروع میں چھوٹے موٹے کشتی کے مقابلے ہوتے ہیں آخری میں بڑا مقابلہ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے اس مقابلے کا اختتام ایک حریف کی موت پر ہوتا ہے فاتح فائزر کو مہاراج منہ مانگا انعام دیتے

ہیں فاتح فائزر اگلے سال رنگ میں آ کر سب کو لکارتا ہے گزشتہ کئی سالوں سے اس مقابلے کا فاتح رنجیت ہے پڑ کے بارے میں سالوں سے اس کے مقابلے میں کوئی نہیں آتا اور وہ بنا مقابلے کے جیت جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے آج رات میں یہیں رکتا ہوں کل صبح مقابلہ شروع ہونے سے پہلے چلا جاؤں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔“ نیچے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے تم ایک شریف انسان ہو۔“ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اس کے بعد وہ سونے چلی گئی۔

صبح سویرے اٹھ کر عثمان نے نماز پڑھی ایک بڑی سی چادر اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹی اس نے چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا کچھ دیر بعد وہ اس کے گھر سے نکل رہا تھا گلی کوچوں میں جہل پھیل شروع ہو چکی تھی لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو حویلی کے سامنے میدان کی طرف جا رہا تھا۔ عثمان اس ہجوم میں شامل ہو گیا اب اسے کوئی بھی آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا ہر گلی ہر محلے سے لوگ نکل کر میدان میں جمع ہو رہے تھے حویلی کے سامنے وسیع عریض میدان میں سینکڑوں لوگ جمع تھے میدان کے وسط میں اکھاڑہ سا بنا ہوا تھا اگلی نشستوں پر نارائن مہاراج اور سپاہ سالار کو بیٹھ بیٹھے تھے۔ میدان میں سینکڑوں کی تعداد میں مہاراج کے سپاہی رانگلے اٹھائے چونکا کھڑے تھے۔ عام تماشا کی ہزاروں کی تعداد میں میدان میں موجود تھے۔

وقت مقرر پر میلہ شروع ہو گیا سب سے پہلے اسٹیج پر درجنوں کے قریب نیم عریاں لباس میں لمبوس خوبصورت لڑکیاں نمودار ہوئیں جنہوں نے ہمایان خیر رقص پیش کیا۔ ان کا رقص اس قدر جذبات کو بڑھاتا تھا کہ دیکھنے والے بچے بھگدار اور بوڑھے خود کو جوان سمجھنے لگے تھے اور جوان بے قابو ہوتے جا رہے تھے انہوں نے میدان میں ہی دھمال قائم کر رقص شروع کر دیا تھا۔ میدان طرح طرح کی آوازوں اور سیٹیوں سے گونج رہا تھا۔ مہاراج کے ظلم دہم کے شکار لوگوں کے لئے آج کا دن

غیبت تھا۔ وہ میلے سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ رقص تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا اس کے بعد جو کہوں نے اپنے تماشوں سے لوگوں کو خوب ہنسیا مہاراج بھی ریاست کا عجیب سرب راہ تھا سال کے تین سو پینسٹھ دن عوام کو رلانے کے بعد آج ایک دن ہنسا رہا تھا اس کے بعد نشانہ بازی کا مقابلہ شروع ہوا جو کافی دیر جاری رہا۔ اس مقابلے میں ماہر نشانہ بازوں نے حصہ لیا پھر دوسرے کھیل تماشے ہوئے۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب لڑائی کے مقابلے شروع ہوئے۔ پہلا مقابلہ ہاتھی کی طرح دو موٹے پہلوانوں کے درمیان تھا جو بدست ہاتھیوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ اس مقابلے کا اختتام ایک فریق کی شکست پر ہوا۔ دوسرا مقابلہ ایک پہلوان نما شخص امر چھریے بدن کے ایک شخص کے درمیان ہوا۔ وہ ایک بے جوڑ مقابلہ تھا گویا ہاتھی اور چیونٹی کی لڑائی تھی ایک موقع پر موٹے نے داؤ لگا کر دوسرے کو بے بس کر دیا لیکن چھریے بدن والے نے بڑی ہی مہارت سے اپنے آپ کو زار اور لایا۔ بلا خراجیت اس کی ہوئی۔

چند مقابلوں کے بعد اصل مقابلے کا اعلان ہوا جو اس میلے کی جان تھا۔ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن سننے لگی۔ میدان میں عجیب سا سکوت چھا گیا تھا۔ رنگ میں رنجیت پوری شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوا۔ ایک ریفری نما شخص نے اس کی شان میں قصیدہ گوئی کی۔ جس کا لہجہ یہ تھا کہ ”رنجیت گزشتہ کئی سالوں سے ان مقابلوں کا فاتح ہے۔ اس کے چیلنج کے جواب میں جو بھی فائزر آئے گا جیتنے کے بعد مہاراج سے منہ مانگے انعام کا حقدار ہوگا۔ یہ مقابلہ ایک فریق کی موت پر اختتام پذیر ہوگا پچھلے دو مقابلوں کی طرح اگر اس کے مقابلے پر آنے کی کسی نے ہمت نہ کی تو رنجیت بنا لے اس مقابلے کا فاتح ہوگا۔“

رنجیت نے بنا مقابلے جیتنے کی بیٹ ٹوک بنانے کا پروگرام بنا رکھا تھا اس نے رنگ میں آ کر مختلف قسم کے نعرے لگائے۔ اور میدان میں موجود لوگوں

کو لکارتے لگے۔ ”کسی میں ہمت ہے تو میرے سامنے۔“ میدان میں صرف رنجیت کی لکاریں گونج رہی تھیں۔ لگتا تھا لوگوں کو سانپ سونگھ گیا ہے سب خاموشی سے اسے رنگ میں اچھلتے کودتے دیکھ رہے تھے وقت دھیرے دھیرے آگے کی طرف سرک رہا تھا ریفری کی آواز گونجی۔ ”اگلے چند منٹ تک اگر رنجیت کے مقابلے پر کوئی نہ آیا تو رنجیت اس سال بھی بنا لے جیتھیں ہوگا۔“ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ اعلان کیا۔ ”میں دس تک گمنوں گا اگر پھر بھی کوئی نہ آیا تو رنجیت فاتح ہوگا۔“ ایک دو تین، چار، پانچ، چھ، سات۔ پانچ کروہ رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

اجانک تماشاویوں کے ہجوم سے بڑی سی چادر جسم پر لپیٹی ایک شخص نمودار ہوا اس نے چہرے پر بھی چادر لپیٹی ہوئی تھی اس لئے وہ پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں ظاہر تھیں ”رک جاؤ ریفری! اس کا چیلنج میں قبول کرتا ہوں۔ میں اس سے مقابلہ کروں گا۔“

”سکوت زدہ ماحول میں اس کی گونجنے والی آواز نے ہلچل مچادی۔ وہ چلتا ہوا پہلی نشستوں پر موجود مہاراج کے قریب چند لمحوں کے لئے رکا پھر رنگ پر چڑھ گیا۔ رنجیت کے چہرے پر ہزرت کے آثار تھے چادر پوش رنجیت کے مد مقابل کھڑا تھا۔ ”اپنے چہرے سے چادر تو ہٹاؤ تاکہ پتہ چلے خوشی کے لئے میرے سامنے آنے والا کون ہے؟“ رنجیت نے قہقہہ لگایا۔

”صبر کرو جلدی کیا ہے تم اپنی موت کو دیکھ لو گے۔“ مہرانی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

ریفری مقابلے کی شرائط دہرانے لگے شرائط دہرانے کے بعد اس نے ایک کاغذ پر دونوں فائزوں کے دستخط لئے اور درمیان سے ہٹ گیا۔

عثمان نے چادر اتار کر پھر تک دی رنجیت کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا مہاراج نارائن گوند اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ ”اس کی ہمت کیسے ہوئے یہاں آنے کی، بکڑ لو اسے، اس نے حویلی سے فرار ہوتے

ہوئے راجکمار کو ان کا کیا ہے۔ "مہاراج چنچا۔
 "چند گارڈز رائل تھیں رگ میں بیچ گئے
 اور عثمان کو رائلنگوں کی زد میں لے کر مہاراج کے سامنے
 چاہتے۔ "مرنے سے پہلے تو یہ بتا کر تو نے راجکمار کی
 کو کہاں چھپا رکھا ہے؟" مہاراج سانپ کی طرح
 پھینکا۔

عثمان بولا۔ "مہاراج شاید بیٹے کی موت
 اور متوقع شکست کے صدمے نے تمہارے ہواس
 چھین لئے ہیں تمہارے بیٹے نے اس میدان میں
 موجود تمام افراد کو لگا کر اتھان افراد میں، میں بھی
 شامل تھا تمہارے بیٹے کے چیلنج کو قبول کر کے جان
 بھیلی پر رکھ کر اس رنگ نہیں آیا ہوں اگر تم نے یہ
 مقابلہ نہ ہونے دیا تو لوگ سمجھ گئے کہ تم باپ بیٹا مجھ
 سے ڈر گئے۔" عثمان مسکرایا۔

"مجھے اگر رنجیت کے ہاتھوں مرنے کا اتنا ہی
 شوق ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میری ایک شرط
 ہے رنگ میں جانے سے پہلے تو راجکمار کی کا پتہ بتائے
 گا۔" مہاراج اشتعال بھرے لہجے میں بولا۔

"میری بھی ایک شرط ہے رنگ میں جانے
 سے پہلے راجکمار کی کا پتہ ضرور بتاؤں گا لیکن مقابلہ
 شروع ہونے سے پہلے میرے بھائی کو یہاں
 لایا جائے، اگر میں مقابلے میں مارا گیا تو تم بے شک
 اسے مار دینا اگر جیت میری ہوئی اور تمہارا بیٹا میرے
 ہاتھوں مارا گیا تو تم منہ ماسکے انعام میں مجھے
 اور میرے بھائی کو زندہ یہاں سے جانے دو گے۔ بولو
 یہ شرائط تمہیں منظور ہیں؟" عثمان تقریباً چیختے ہوئے
 بولا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ میدان میں موجود
 تمام لوگوں نے سنی۔

مہاراج سوچ میں پڑ گیا اگر انکار کرتا تو لوگ ان
 باپ بیٹے کو بزدل سمجھتے، بد رسوں کے لوگوں کے دلوں میں
 اس کا رعب اور جودہشت تھی لوگوں کے دلوں میں کم
 ہو جاتی اگر یہ مقابلہ ہو جاتا تو عثمان جو کہ اس کی نظر میں
 کمزور فریق تھا رنجیت کے ہاتھوں مارا جاتا اس طرح اس

کا انتقام بھی پورا ہو جاتا اور راجکمار کی بھی اس کے ہاتھ
 آ جاتی اور دوسرے بھائی کو بھی پھانسی پر چڑھا دیتا۔
 لوگوں کے دلوں میں ان کی ڈھاک بیٹھ جاتی یہ سوچ
 کر مہاراج نے ہائی بھرنی۔

"مجھے تیری تمام شرائط منظور ہیں میں دجن دیتا
 ہوں کہ جیت کی صورت میں تجھے اور تیرے بھائی کو زندہ
 یہاں سے جانے دیا جائے گا۔ اب رنگ میں جانے سے
 پہلے راجکمار کی کا پتہ بتا کیونکہ تو رنجیت کے ہاتھوں مارا
 جائے گا پھر راجکمار کی کا پتہ کون بتائے گا۔" وہ مکاری
 سے بولا۔

اس طرح نہیں مہاراج پہلے میرے بھائی
 کو یہاں بلاؤ۔ "مہاراج کے حکم پر اس کے بھائی کو یہاں
 بلوایا گیا پر دیپ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے
 تھے اس کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے کپڑے جبکہ
 جگہ سے چپے ہوئے تھے عثمان کے کہنے پر اس کے دونوں
 ہاتھ کھول دیئے گئے۔

"میں اپنے بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔" عثمان بولا۔
 "ہاں مرنے سے پہلے لو، ہم مرنے والے کی
 آخری خواہش ضرور پوری کرتے ہیں۔"

عثمان آگے بڑھ کر پر دیپ کے سینے سے لگ
 گیا۔ "پر دیپ میرے بھائی تم فکر مت کرو میں تمہیں
 زندہ سلامت یہاں سے لے جاؤں گا۔" اس کے لہجے
 میں یقین تھا۔

"بھائی یہ بہت ظالم لوگ ہیں، انہوں نے دیدی
 کو بھی مار دیا، ہمیں بھی مار دیں گے۔" پر دیپ رونے لگا۔
 نہیں پر دیپ اب رو نامت اب رونے کی باری
 مہاراج کی ہے میں گن گن کر ان سے ظلم و ستم کے بدلے
 لوں گا تم گھبراؤ مت اس نے بھائی کی پیٹھ پھکی اور مہاراج
 کے رو بر و کھڑا ہو گیا۔

"مہاراج تمہاری بیٹی اپنی مرضی سے میرے
 ساتھ گئی تھی میں بزدل نہیں لے گیا وہ مظلوم لڑکی بھی
 تمہارے ظلم و ستم سے شکستھی، یہ وضاحت میں اس لئے
 نہیں کر رہا کہ میں تم سے ڈرتا ہوں، صرف اس لئے

کہ رہا ہوں کہ یہ لوگ مجھے غلط نہ سمجھیں اس وقت بھی وہ
 اپنے چاچا رنجیت کی حویلی میں ان کے پاس موجود ہے
 اگرچہ تم لوگوں کی بہن بیٹیوں کو بے عزت کرتے ہو اس
 کے باوجود بھی میں نے اسے چھوٹا نہیں۔"

وہ رنگ میں چلا گیا رنجیت اور عثمان دونوں ایک
 دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہے
 تھے۔ میدان میں موجود تمام افراد کو عثمان کی یقینی شکست
 نظر آ رہی تھی۔ رنجیت ساڑھے چھ فٹ سے نکلتے ہوئے
 قد و قامت اور ورزشی جسم کا مضبوط فولاوی شخص تھا اس
 کے علاوہ مارشل آرٹ اور لڑائی بھڑائی کے فن میں ماہر
 تھا۔ رنجیت نے جیترا بدلتے ہوئے عثمان کی کپٹی
 پر ایرو کینچ کا وار کیا۔

عثمان نے نہایت مہارت سے ہلاک کر کے اس
 کا وارڈ کا اور ساتھ ہی سائیڈ کلک اس کے سینے پر رسید
 کی، رنجیت لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف گیا اس کے چہرے
 پر حیرت کے آثار نمایاں نظر آ رہے تھے ماضی میں اس
 کے ہاتھوں بننے والے کمزور شخص نے فائٹ کے پہلے ہی
 مرحلے پر اسے باور کروادیا تھا کہ اب وہ رنجیت کے لئے
 تروالہ نہیں بلکہ لوہے کا چٹا ثابت ہوگا رنجیت اب محتاط
 انداز میں کھڑا تھا۔

"لگتا ہے تم نے تھوڑی بہت اوجھل کو دیکھ لی
 ہے لیکن تم میں اپنی بہن کے جتنا بھی زور نہیں۔ رنجیت
 نے زہر افشانی کی اس کا مقصد عثمان کو پیش میں دلانا تھا
 جس میں وہ کامیاب رہا۔"

وہ اندھا دھند رنجیت سے جا کر کھڑا اس کا گھونہ
 پوری شدت کے ساتھ رنجیت کے سینے پر لگا اس وقت
 اسے اندازہ ہوا کہ اس کا مد مقابل رنجیت کوئی عام شخص
 نہیں اس کے جسم میں جیسے گوشت پوست کے بجائے
 فولا دھرا ہوا ہے۔ سینے پر گھونہ کھا کر رنجیت رنگ کے
 رسول سے کھرا کہ اس طرح تیزی سے واپس اس کی
 طرف آیا کہ اسے لگا رسول میں طاقتور اسپرنگ لگے ہوں
 اس کا فولا دی ہاتھ عثمان کے جڑے پر پڑا اور آنکھوں
 میں ستارے سے قس کر گئے یکا یک وہ کسی وحشی کی

طرح عثمان پر ٹوٹ پڑا وہ خالی ہاتھ تھا مگر لگتا تھا کہ اس
 کے ہاتھوں میں تھوڑے ہیں۔

چند ہی منٹ میں عثمان کو اپنے جسم پر درجنوں
 ضربیں سہا پڑیں وہ کئی بار رسول سے کھرا کھرا پھراٹھا
 پھر عثمان کا داؤ چل گیا عثمان نے اس پر ایسا وار کیا کہ
 جو کسی کرائے فائٹ میں سراسر فاول ہوتا ہے مگر یہ زندگی
 موت کی جنگ تھی اس میں ہر داؤ جائز تھا عثمان نے اس
 کی رانوں کے سین درمیان زوردار ٹھوکہ ماری تو وہ تڑپ
 کر پیچھے کی طرف گیا عثمان کو اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع مل
 گیا۔ اگلے چند منٹ تک ان دونوں کے درمیان
 خطرناک معرکہ ہوا، معرکہ کے دوران رنجیت نے اپنی
 پتلون کی جیب میں پوشیدہ تیز دھار چاقو نکال لیا اس کے
 چاقو کے خطرناک ترین دار اس نے بشکل رو کے ایک
 موقع پر اس نے پوری قوت سے رنجیت کے منہ پر لات
 ماری عثمان کے پاؤں کا بالائی حصہ اس کی تھوڑی پر لگا وہ
 اوپر کی طرف اچھلا اور پشت کے بل نیچے گرا اس نے
 سرعت سے اٹھنے کی کوشش میں مگن رنجیت پر چلا لگ
 لگا دی۔ اس کے دونوں گھٹنے رنجیت کی پسلیوں پر لگے تو وہ
 کراہ کر دوبارہ گر گیا وہ چلایا اور اپنے ہاتھ میں موجود چاقو
 کو سنبھالنے لگا وہ عثمان کے سینے میں چاقو پیوست
 کرنا چاہتا تھا مگر عثمان کے سر پر بھی خون سوار تھا اس نے
 دونوں ٹانگیں ہوا میں بلند کیں اور ایڑیاں اس کی ٹانگوں
 کے بیچ ماریں رنجیت ہلکا کر اٹھ بیٹھا شدید تکلیف سے
 اس کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے تھے عثمان نے موقع
 سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چاقو پر ہاتھ ڈال دیا۔

رنجیت نے جھک کر دیکر چاقو چھڑانا چاہا مگر ناکام
 رہا۔ عثمان نے دوسرے ہاتھ کا زوردار گھونہ اس کے سینے
 پر مارا اور چاقو کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی مگر ناکام
 رہا۔ اس نے رنجیت پر اندھا دھند گھونوں کی بارش کر دی
 پورے میدان میں سکوت چھا چکا تھا سب لوگ پھٹی پھٹی
 آنکھوں سے موت اور زندگی کی خوف ناک کش مکش دیکھ
 رہے تھے۔

مہاراج کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا لڑائی

میں مداخلت کروانا اس کی بے عزتی تھی اس لئے خود پر بضط کرتے ہوئے خونی مقابلہ دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے کہ عثمان اس سے چاقو چھیننے میں کامیاب ہوتا۔ رنجیت کا زوردار گھونسا اس کی پٹنی پر پڑا اور وہ اس کے رگ دپے میں پھیل گئی لئے بھر میں اس کا وجود بے جان ہو گیا وہ کولیوں کے بل گرا اور بری طرح تڑپنے لگا میدان رنجیت کے حمایتیوں کے شور اور تالیوں سے گونج اٹھا رنجیت کے لئے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ اس نے چاقو ہاتھ میں پکڑتے ہوئے عثمان کے جسم پر ٹھوکر دینے کی بارش کر دی عثمان فٹ بال کی طرح ادھر ادھر لڑھکتے لگا اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے سے رقص کر رہے تھے اسے پورا میدان گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ رنجیت نے چند لمحے رک کر اسے نفرت سے دیکھا پھر اس کے سینے پر چڑھ کے بیٹھ گیا اس نے اپنے دونوں گھٹنوں سے عثمان کے دونوں بازوؤں پر باؤ ڈالا اور خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے فاتحانہ نگاہ سے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے حمایتی شور مچانے لگے۔ ”مارو، اس مسئلے کو مار دو۔“ عثمان بے بسی سے اس کے نیچے پڑا تھا۔

اچانک عثمان کی نگاہوں کے سامنے اپنی بہن پڑھائے جانے والے نظم کے مناظر گھوم گئے اس کے ذہن میں بجلی سی گونجی اس نے دونوں ٹانگیں فضا میں بلند کیں اور رنجیت کی گردن میں قیمتی بنا کر زوردار جھکا دیا۔ رنجیت اس کے سر پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف جا گرا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اٹھتے ہی رنجیت کے سینے پر چب سائیکل لک ماری رنجیت اچھیل کر نیچے گرا چاقو اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ایک طرف جا گرا۔ عثمان نے فضا میں قلا بازی کھائی اور اٹھتے ہوئے رنجیت کے سینے پر فلائنگ لک ماری رنجیت دوبارہ نیچے گر گیا رنجیت جہاں گرا اس سے کچھ فاصلے پر چاقو پڑا تھا اس نے چاقو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عثمان نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور چھلانگ مار کر اس پر سوار ہو گیا عثمان نے بے درپے کئی گھونٹے اس کے چہرے پر مارے اور لپک کر چاقو اٹھا لیا اس کے ہاتھ

میں چاقو آتے ہی مہاراج اور نارائن اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے اس نے بجلی کی سی تیزی سے تیز دھار چاقو رنجیت کے سینے میں دل کے مقام پر پھونک کر دیا۔ رنجیت بنا کوئی آواز نکالے جسم رسید ہو گیا۔ عثمان رنجیت کی لاش سے اٹھا اور رنگ سے اتر کر مہاراج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”مہاراج اپنا وعدہ پورا کرو۔“

مہاراج کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا اس کی نظروں کے سامنے سینکڑوں حمایتیوں کے درمیان عثمان نے اس کے اگلوتے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر وہ کچھ نہ کر سکا تھا اب بھی وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا وہ اس سے اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ آس جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کے سامنے مہاراج نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کرنا تھا۔

پردیپ کو عثمان کے حوالے کر دیا گیا ”سنو بالک ہم اپنے وعدے کے مطابق اپنی حدود میں نہیں کچھ نہیں کہیں گے مگر اس ریاست سے تمہارے نکل جانے کے بعد ہم آزاد ہو گئے۔ تمہیں رنجیت کے خون کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔“

”مہاراج اس دقت میں تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کے خون سے ہاتھ رنگ کر جا رہا ہوں کل کیا ہوگا اس کا فیصلہ کل کریں گے تم نے ماضی میں جو مظالم کئے ہیں اس کا حساب تمہیں بھی دینا پڑے گا تم بھی انتقام کا نشانہ بنو گے۔“ عثمان فیصلہ کن لہجے میں بولا اور پردیپ کو لے کر میدان سے رخصت ہو گیا۔

مہاراج نے حسب وعدہ اسے ایک تیز رفتار گھوڑا دیا تھا گھوڑا تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے ریاست سے باہر جانے والے راستے کی طرف جا رہا تھا وہ ریاست کی حدود سے جب باہر پہنچے تو رات کے نو بج چکے تھے ہر طرف تاریکی کا راج تھا عثمان گھوڑا دوڑاتا ہوا جنگل کی حدود میں داخل ہو گیا پردیپ اس کے پیچھے اس سے چپکا بیٹھا تھا۔ جنگل کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس نے گھوڑے کی رفتار کم کر دی چاروں طرف گھپ اندھیرا

تھا۔ اس اندھیرے میں تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ناممکن تھا جنگل مختلف قسم کے جانوروں کی آوازوں سے گونج رہا تھا یہ آوازیں کم عمر پردیپ کو خوف زدہ کر رہی تھیں۔ ”بھیا مجھے رگ رگ رہا ہے وہ بولا۔ اور عثمان نے گھوڑا روک دیا وہ دونوں گھوڑے سے نیچے اترے۔ بھائی یہ بہت خطرناک جنگل ہے اگر کوئی جنگلی جانور آ گیا تو ہمیں کون بچائے گا۔“ پردیپ مصدومیت بھرے لہجے میں بولا۔

اچانک وہ چونک بڑا اس کے ارد گرد سے ڈھول اور باجوں کی آوازیں آنے لگیں تھیں وہ متلاشی نظر سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ آوازیں ان کے قریب بڑھنے لگیں پھر وہ ظاہر ہو گئے وہ پچاس ساٹھ کے قریب تنگ ڈھرنگ گورتیں اور مرد تھے لباس سے عاری جسم پر انہوں نے مختلف قسم کے رنگ رنگے ہوئے تھے وہ اب ان دونوں کے ارد گرد گھوم رہے تھے وہ دونوں حیرت سے ان تنگ ڈھرنگ افراد کی اچھیل کود دیکھ رہے تھے ان سے پچاس ساٹھ افراد میں سے کچھ افراد نے ڈھول اور باجے اٹھا رکھے تھے جن کے شور سے ان کے کان کے پردے پھٹنے لگے تھے ان میں بیس کے قریب نوجوان اور صحت مند افراد نے ہاتھوں میں بھالے اور کٹواریں اٹھا رکھی تھیں اس ہجوم میں کچھ بیچاری قسم کے افراد بھی موجود تھے جن کے گلے میں مختلف قسم کی مالا میں ڈلی ہوئی تھیں۔ چند لمحے کے اس تماشے کے بعد انہوں نے ڈھول اور باجے بجانا بند کر دیے اب سب اپنی اپنی جگہ پر خاموش کھڑے تھے۔

ایک بیچاری آگے بڑھا اور ان سے مخاطب ہوا۔ ”ہم کالی کے بیچاری ہیں تمہیں ہمارے ساتھ مندر جانا ہوگا۔“

”مگر کیوں اور اگر ہم نہ جانا چاہیں تو“ عثمان نے کرخت لہجے میں پوچھا؟

”اس صورت میں ہمیں زبردستی کرنی پڑے گی اور تم دیکھ بھی رہے ہو ہمارے پاس ہتھیار بھی موجود ہیں۔“ بیچاری نے جواب دیا، وہ انہیں اپنے زرعے میں

لئے آگے بڑھ گئے، کالی دیر پیدل چلنے کے بعد وہ قافلہ ایک سرنگ نما راستے میں داخل ہوا یہاں پہنچ کر بیچاریوں نے نارنجیں روشن کر لیں تھیں دائیں طرف سرنگ کی نیم پتھر دیواروں میں کہیں کہیں سوراخ تھے جن سے بجلی ہوا اور مدھم روشنی اندر آتی تھی ان کے سامنے سیڑھیوں کا ایک سلسلہ آگیا یہ سیڑھیاں سرنگ کے پتھرے فرش کو کھود کر بنائی گئی تھیں وہ آگے بڑھنے لگے انسانی ہاتھوں کی بنائی گئی یہ سرنگ آگے جا کر تنگ ہونے لگی تھی جگہ تنگ ہونے سے انہیں ٹھنکن محسوس ہو رہی تھی پچاس قدم آگے جا کر انہیں ہلکا سا شور سنائی دیا ایسا لگ رہا تھا کہ آپس میں کچھ افراد زور زور سے باتیں کر رہے ہیں وہ چلتے ہوئے ایک وسیع وعریض ہال میں داخل ہو گئے یہاں بڑے بڑے ستون تھے جنہوں نے چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ دیواروں پر چابجا دیوی دیوتاؤں کی تصویریں آویڑی تھیں ان کے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا شخص آگیا شکل اور حلیہ سے وہ کوئی پنڈت لگ رہا تھا قریب ہی پانچ کے قریب افراد آپس میں باتیں کر رہے تھے ان کے کندھوں سے رانگلیں لٹک رہی تھیں ان کے اندر داخل ہوتے ہی عثمان کے ساتھ آنے والے بیچاریوں میں سے ایک بیچاری ان کی طرف بڑھا اور ان کی گفتگو میں شامل ہو گیا سب عثمان اور پردیپ کو غور سے دیکھ رہے تھے انہیں یوں دیکھی سے دیکھا جا رہا تھا جیسے قربانی کے جانور کو دیکھا جاتا ہے آپس میں باتیں کرتے ہوئے گاہے بے گاہے وہ عثمان کی طرف اشارے بھی کرتے تھے عثمان کو بے چینی ہو رہی تھی جبکہ پردیپ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ان کی گفتگو کا اختتام ہو گیا اب وہ ان دونوں کو لے کر آگے بڑھے یہاں کالی کا بیت تاک بت موجود تھا دونوں کو بت کے قدموں میں کچھ دیر بیٹھا کر اشلوک پڑھے گئے پھر ان دونوں کو لے کر رابداری سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں آگئے ان دونوں کو کمرے میں دھکیل کر ہاتھ پشت پر مضبوطی سے باندھے گئے۔ اس کے بعد پاؤں کی باری

آئی۔ ”سنوہپ ہم دونوں آرام سے یہاں پڑے رہو، کل رات کالی کے جنوں میں تم دونوں کی بلی دی جائے گی۔“ پردیپ خوف سے جھٹکنے لگا، لگا بچاری اس کی چیخ و پکار سے بے نیاز کمرے کا دروازہ باہر سے متقلل کر کے چلا گیا۔

”پردیپ خاموش ہو جاؤ، دوست اللہ بہتر کرے گا۔“ عثمان نے نظارہ اسے ٹپکی دی مگر خود سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کالی کے بچاریوں کے بارے میں بہت کچھ نہن رکھا تھا اپنا انجام اسے صاف نظر آ رہا تھا۔

رات گہری ہو چکی تھی، پردیپ سوچ کا تھا تقریباً رات بارہ بجے دروازے کی طرف بڑھتی قدموں کی چاپ سنائی دی ساتھ ہی ایک مانوس آواز اس کے کانوں سے نکل گئی۔ ”ہاں بھئی دکھاؤ تو سہی تم نے بلی کے لئے کون سے بندے پکڑے ہیں۔“ دروازہ کھلا اور دو بچاریوں کے ساتھ آنے والی شخصیت کود کچھ کر عثمان حیران رہ گیا وہ مہاراج کا دوست راست نارائن تھا۔

نارائن بھی انہیں دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ”واہ بھئی واہ! تم لوگوں نے آج ایسا کارنامہ سر انجام دیا ہے کہ میں تم لوگوں سے خوش ہوں۔ یہ دونوں ہمشکل بھائی مہاراج کو مطلوب ہیں کل رات بلی کے بعد ان کے کئے ہوئے سر مجھے دینا، میں مہاراج کو تحفے میں دوں گا۔“ نارائن بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکل گئے رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

صبح جاگنے کے بعد کچھ دیر تک عثمان بے حس و حرکت پڑا رہا دیوار پر لگے وال کلاک میں صبح کے چھ بجے تھے۔ پردیپ بدستور سو رہا تھا۔ اس نے بیروں کو زور دے کر رسی کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا رسی مضبوطی سے بندھی تھی اس نے گھٹنے اکٹھے کئے اور اٹھ کر بیٹھ گیا دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا شاید ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے وہ بے نگہری سے جاتے وقت دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے ہر طرف خاموشی کا راج تھا کسی قسم کی آواز سنائی نہ دے رہی تھی

یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ اس نے اپنے بندھے ہاتھوں کو بیروں میں بندھی رسی کی گانٹھ تک پیچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اس کوشش پر اس کی کلائی بری طرح جھل گئی تھی۔ ہاتھوں میں تکلیف سی محسوس ہو رہی تھی وہ تکلیف کے باوجود برابر اپنی کوشش میں لگا رہا۔

بلاخرہ اس کی انگلیوں نے گانٹھ کو چھو لیا۔ اسے رسی کو ٹول کر گانٹھ کھولنے کی کوشش کی اور آخر کار اپنی کوشش میں اسے کامیابی ہوئی۔ وہ اپنے بیروں کو رسی سے آزاد کر چکا تھا پاؤں رسی سے آزاد ہوئے تھے وہ اٹھا اور پردیپ کی طرف بڑھا سرگوشی میں چند آوازیں دیں! پردیپ نیند میں کسمانے لگا مگر انہیں آخر تک آکر اس کے قریب بیٹھ کر پاؤں سے اسے جھنجھوڑا، اس بار پردیپ اٹھ بیٹھا۔ ”بولنے کی کوشش مت کرنا۔“ عثمان سرگوشی میں بولا اور اس کی پیٹھ سے اپنی کمر لگا کر اس کے ہاتھوں پر بندھی گانٹھ کھولنے لگا کچھ دیر بعد پردیپ کے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے پردیپ نے اپنے پاؤں کھولنے کے بعد عثمان کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے وہ کمرے سے نکل کر امدادی میں پہنچنے یہاں کوئی نہیں تھا انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بے پاؤں چلنے ہوئے ہال نما کمرے میں آگئے ہال نما کمرے میں چند بچاری سکرے سٹے سو رہے تھے ان کے قریب شراب کی چند بوتلیں خالی پڑی تھیں غالباً کثرت شراب نوشی سے وہ مدہوش ہو چکے تھے وہ دونوں چلتے ہوئے سرگم میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے سرگم میں آتے ہی وہاں کا طائرانہ جائزہ لیا وہاں بھی کوئی موجود نہ تھا شاید کالی کے مندر میں موجود تمام افراد شراب کے نشے میں مدہوش پڑے تھے وہ تیزی سے چلتے ہوئے سرگم سے باہر نکل گئے۔

تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد عثمان نے پلٹ کر دیکھا ان کے تعاقب میں کوئی نہ تھا یعنی کسی کو بھی انکے فرار کا علم نہ تھا جوں جوں وہ مندر سے دور ہوتے گئے ان کے چلنے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی، یعنی اب

وہ بھاگنے کے سے انداز میں چل رہے تھے کافی دیر چلنے کے بعد وہ جنگل میں داخل ہو چکے تھے وہاں سے باحفاظت نکل جانے پر عثمان نے خدا کا شکر ادا کیا مگر اس وقت اسکی نگاہوں کے آگے اندیر اچھا گیا۔

ایک سیاہ رنگ کی جیب اچانک ان کے قریب آ کر رک گئی اس میں سے نارائن نکل کر ان کی سمت بڑھا وہ حیران اور پریشان تھے کہ یہ مصیبت دوبارہ کہاں سے نازل ہوگئی نارائن کے ہاتھوں میں رائفل موجود تھی جس کی نال کارخانہ ان کی طرف تھا۔

”رات کو ہم لوگوں نے زیادہ پی پی پی تھی اس لئے تم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے وہ تو آٹھ کھلے ہی مجھے تمہارا خیال آیا کمرے میں جھانکا تو تم لوگ غائب تھے میں سمجھ گیا تم فرار ہو چکے ہو اس لئے فوراً ہی اس طرف دوڑ پڑا یہ تو بھگوان کی کرپا ہے کہ تم ہاتھ آگے چلو آگے بڑھو۔“ اس نے عثمان کو رائفل کی نال سے دھکا دیا۔

وہ دونوں بھائی جیب کی طرف بڑھنے لگے نارائن انکے پیچھے رائفل تھامے چل رہا تھا اچانک ایک جگہ ٹھوکر کھانے سے وہ لڑکھایا تو عثمان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیک کک اس کے رائفل والے ہاتھ پر ماری رائفل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گری اس نے رائفل اٹھانے کے لئے جھکنا چاہا تو عثمان نے زوردار لالت اس کے جڑے پر ماری وہ چیختا ہوا ایک طرف گر گیا عثمان وحشیوں کی طرح اس پر پل پڑا۔ اس کی لائیں گھونسنے نارائن کے جسم پر پڑنے لگے چند لمحوں بعد وہ زمین پر پڑا تھا عثمان نے لپک کر اس کی رائفل اٹھائی۔

”یاد کرو برسوں پہلے تم نے ظالم مہاراج کے سامنے شوشہ چھوڑا تھا کہ اس املاک کی رات پیدا ہونے والا بچہ اس کے لئے خطرناک ثابت ہوگا اسی شوشے کی وجہ سے اس ظالم نے درجنوں بچوں کو ذبح کر دیا۔“ عثمان بولا۔

”م..... مجھے معاف کر دو بھگوان کے لئے مجھے

مست مارو۔“ وہ گڑگڑایا عثمان نے رائفل کارخانہ اس کی طرف کر کے ٹرگر دبا دیا کئی فائر ہوئے فضا اس کی چیخوں سے گونج اٹھی وہ نارائن کی لاش کو ٹھوکر مار کر پردیپ کا ہاتھ تھامے نارائن کی جیب کی طرف بڑھا۔

اسی وقت گھونٹوں کی ناپوں کی آواز سنائی دی وہ چونک پڑا۔ ”یا اللہ یہ کیا جرم ہے ایک مصیبت سے ہمشکل جان چھڑ گئی تھی اب کون نازل ہو گیا۔“

دیکھتے ہی دیکھتے انہیں درجنوں مسلح گھڑسواروں نے گھیر لیا گھڑسواروں کے چہروں پر نقاب موجود تھا۔ سفید رنگ کے گھوڑے پر سوار نقاب پوش ان کے قریب پہنچ گیا پردیپ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں عثمان بھی پریشان نظر آ رہا تھا گھڑسوار درجنوں کی تعداد میں تھے۔ ”کون ہو تم اور اسے کس نے مارا؟“ سفید گھوڑے پر سوار نقاب پوش نے اس سے پوچھا۔

”میرا نام عثمان ہے اور اسے میں نے مارا ہے۔“

”نقاب پوش گھوڑے سے اتر اور اس کے سینے سے جاگنا شاباش میرے شیر شاباش تمہارے بہت چرچے سنے تھے میں نے تم نے رنجیت جیسے درندے کا خاتمہ کیا تھا اور اب اس شیطان کو انجام تک پہنچا کر تم نے یہاں کے لوگوں کو اس درندے سے نجات دلوائی ہے میں پابندے ہوں مہاراج کا بہت بڑا مخالف۔“ اور پاٹھ سے نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا وہ گندی رنگت کا قبول صورت نوجوان تھا کچھ دیر بعد پردیپ اور عثمان پاٹھ سے کے ہمراہ اس کے ٹھکانے پر پہنچے یہ ساتھ افراد پر مشتمل گروہ تھا جو پہاڑی غاروں میں رہ کر پوش تھے۔ وہ چھاپا ماروں کی طرح کارروائی کرتے تھے جہاں کہیں مہاراج کے کارندے کم تعداد میں دکھائی دیتے وہ حملہ کر دیتے پاٹھ سے اور اس کے تمام ساتھی ہمدرد اور مخلص تھے یہ مہاراج کے مظالم سے تنگ لوگ تھے جنہوں نے مجبور ہو کر ہاتھوں میں ہتھیار اٹھا رکھے تھے۔ سب عثمان سے متاثر نظر آ رہے تھے وہ اس کے احسان مند تھے کہ اس نے انہیں اور ریاست کے لوگوں کو ان ظالموں سے نجات دلوائی۔

عثمان اور پردیپ ان میں گھل مل گئے انہوں نے قبوہ بنایا جو سب نے ساتھ مل کر بنایا، سب ایک جگہ بیٹھے گپ شپ اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔

اس طرح خوش گپیوں میں خاصا وقت گزر گیا۔ مغرب کے وقت ایک گھڑ سوار تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے، گھوڑے سے اتر کر وہ پانڈے کی طرف بڑھا۔ ”مولو کیا ہوا کیوں اتنا گھبرائے ہوئے ہو؟“ پانڈے نے پوچھا۔

”سردار غضب ہو گیا نارائن کی لاش ملنے ہی مہاراج اچھوتوں سمیت مٹی ذات کے بندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے ہیں۔ جگہ جگہ قتل ہو رہے ہیں نوجوان عورتوں کو اغوا کیا جا رہا ہے گھروں کو آگ لگائی جا رہی ہے رنجیت کے بعد نارائن کے قتل نے اس کے حواس چھین لئے ہیں وہ وحشی ہو چکا ہے اب وہ اپنے سیکڑوں مسلح کارندوں کے ہمراہ بستیوں کو تباہ و برباد کرتا ہوا یہاں کارخ کر رہا ہے۔“ سونو گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اس کی بات سنتے ہی پانڈے بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔“ ہم صرف پچاس افراد ہیں سیکڑوں تربیت یافتہ سپاہیوں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ فوراً یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔ عثمان تم ہم سے راستے میں الگ ہو کر کشش کی حویلی چلے جانا مہاراج وہاں حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ تم کو کشش کرو کہ کشش اپنی طاقت کو مہاراج کے خلاف استعمال کر کے اسے روکے ورنہ مہاراج ریاست کے نچلے طبقے کے تمام افراد کو غرق ہستی سے منادے گا۔ ہم یہاں سے روپوش ہو کر ریاست کے بہادر نوجوانوں کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی کوشش میں کامیاب رہے اور کشش کو تم نے راضی کر لیا تو مہاراج کا خاتمہ یقیناً ہو جائے گا۔“

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں سے کوچ کر گئے آدھے راستے میں عثمان ان سے الگ ہو کر کشش کی طرف چل پڑا کہنے چلتے صبح آٹھ بجے کے قریب وہ حویلی میں تھا۔

صدف اسے دیکھتے ہی خوشی سے پاگل ہو گئی

جذبات میں وہ عثمان سے لپٹ کر رونے لگی۔ ”بس کرو صدف مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو، پلیز! کچھ خیال کرو سب دیکھ رہے ہیں۔“ عثمان نے احساس دلایا۔

صدف شرمندگی سے عثمان سے الگ ہو گئی۔ کشش اور اس کی جتنی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ عثمان کے آنے سے حویلی میں ہل چل مچ چکی تھی عثمان کے کارناموں کی خبر اس سے پہلے یہاں تک پہنچ چکی تھی عثمان نے کشش کو بتایا کہ مہاراج نے اپنی رعایا پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے اگر اسے روکا نہیں گیا تو ریاست میں صرف مہاراج اور اس کے کارندے ہوں گے باقی سب انسانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

کشش سوچ میں پڑ گیا اب تک وہ اپنے بھائی سے تصادم سے بچتا آ رہا تھا۔ مگر اب تصادم ناگزیر تھا ایک طرف بھائی تھا دوسری طرف ہزاروں انسان اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔

شام کے وقت پانڈے کا ایک ساتھی تیز رفتار گھوڑے پر وہاں پہنچا اس نے ایسی خبر سنائی کہ کشش کے ارمان خطا ہو گئے۔ مہاراج سیکڑوں کی تعداد میں بذات خود اپنے سپاہیوں کے ہمراہ کشش پر حملے کی غرض سے چل پڑا تھا کشش سر پکڑ کر بیٹھ گیا اس کے مسلح کارندوں کی تعداد 80 کے قریب تھی وہ اس قلیل تعداد میں مہاراج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پانڈے کا ساتھی خبر سنا کے جاچکا تھا کہ کشش پریشان بیٹھا تھا۔

اس خبر کو سن کر سب پریشان ہو گئے وہ جانتے تھے کہ مہاراج یہاں آتے ہی قتل عام شروع کر دے گا کوئی بھی اس کے انتقام سے بچ نہیں سکتا۔

”میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔“ صدف بولی۔

”وہ کیا؟“ کشش نے پوچھا۔

”یہ حویلی کسی قلعے کی طرح اگرچہ مضبوط نہیں لیکن کافی وسیع و عریض ہے اس میں سیکڑوں افراد آسکتے ہیں یہاں کے تمام لوگوں کو گھروں سے نکال

کر یہاں لایا جائے کچھ افراد کے پاس چھوٹا موٹا اسلحہ بھی ہوگا انہیں اپنے محافظ دے کر وہاں شامل کر لیں چھت پر باؤنڈری وال کی دیوار چار فٹ کے قریب ہے اس لئے چھت پر اچھی خاصی تعداد میں مسلح افراد کی چوکیاں رہنے کا حکم دیں تاکہ وہ حملہ آوروں کو با آسانی اندر نہ آنے دیں۔“ صدف نے انہیں مسئلے کا بہترین حل بتایا کشش سمیت وہاں تمام افراد کے چہرے کھل اٹھے۔ ”زبردست بہت ہی واہ زبردست حل تم نے بتایا ہے۔“ کشش کھل اٹھا۔

”میں نے سنا تھا کہ عورت ناقص عقل ہوتی ہے لیکن تم نے ایسی تدبیر بتائی ہے کہ دل چاہتا ہے تمہیں انعام دیا جائے لیکن اس وقت نہیں۔“ عثمان شوخ لہجے میں بولا۔

”نہیں جی یہ آپ کی غلط فہمی ہے عورت کمزور نہیں اسے کمزور سمجھنے والے ان حقوق کی دنیا میں رہتے ہیں عورتیں ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ رہتی ہیں۔“ صدف چمک کر بولی۔

”میری بیٹی بھگوان کی کرپا سے بہت سمجھدار ہے! کشش نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”مگر بیٹا یہ حویلی ہمیں پناہ دینے کے لئے مضبوط سہارا نہیں ہو سکتی ہے پہلے ہی حملے میں وہ لوگ حویلی میں داخل ہو جائیں۔“ کشش نے نکتہ نکالا۔

”چاچا جی ہمارے پاس نوجوان لائق تعداد میں ہیں آپ اپنے محافظ دے کر نوجوانوں کو حویلی سے چند گز کے فاصلے پر گہری خندق کھود دیں گے۔“

صدف کی تجویز سن کر سب کے چہروں پر اطمینان دوڑ گیا علاقے کے تمام لوگوں کو صورتحال سے آگاہ کر کے حویلی میں محفوظ کر لیا گیا کشش کے حکم پر سیکڑوں کی تعداد میں نوجوان خندق کی کھدائی میں مصروف ہو گئے۔

چند گھنٹوں میں حویلی کے چاروں طرف کافی گہری اور چوڑی خندق کھودی جا چکی تھی اب اسے پھلانگ کر پار کرنا ناممکن تھا۔

چھت پر ماہر نشانہ باز رائفلس لے کر اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے خندق کے اوپر کمزور قسم کی ورنٹ کی لمبی لمبی ٹہنیاں ڈال کر اوپر گھاس پھوس ڈال دی گئی اب پہلی نظر میں کسی کو اس خندق کی موجودگی کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو حویلی کے پچھلے بال میں بٹھرایا گیا۔

صبح سویرے پانچ بج گئی حویلی کے اطراف میں گھوڑوں کی اور بچپوں کی آوازیں سنائی دیں، ساتھ ہی کئی فائر ہوئے اور فخرے مارے گئے۔

عثمان چھت پر محافظ دے کر ہمراہ چوکی کھڑا تھا۔ اس نے تھوڑا سا سر اٹھا کے دیکھا اسے اپنے رونگٹے کھرے ہوتے محسوس ہوئے، حویلی کے چاروں طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے ابھی وہ حویلی سے کچھ فاصلے پر تھے اور حویلی پر حملے کا آغاز نہیں کیا تھا ابھی وہ خندق سے بھی کچھ فاصلے پر حویلی کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے پھر حملے کا آغاز کر دیا گیا۔ بے درجے مختلف اقسام کی رائفلس اور ہندوتوں سے فائرنگ شروع ہو گئی، فضا گولیوں کی ترزا مٹ سے گونج اٹھی چھت پر موجود عثمان اور محافظ دے کے اراکین نے اب تک جوابی فائر نہیں کیا تھا اس کے پاس گولیاں محدود تھیں اس لئے وہ گولیاں بغیر ہدف کے ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مہاراج کے سپاہی فائرنگ کرتے ہوئے تیزی سے اندھا دھند آگے بڑھے ان میں سے کئی سپاہی لاطمی میں جیتنے ہوئے خندق میں جا گرے اسی وقت چھت پر موجود عثمان اور محافظ دے نے نشانہ لے کر تباہ توڑ فائرنگ شروع کر دی کئی سپاہی جیتنے ہوئے ان کی گولیاں کا شکار ہو گئے۔

اب حویلی میں سے بھی فخروں کی گونج شروع ہو چکی تھی صورتحال کو بھانپ کر مہاراج کے سپہ سالار نے اپنے سپاہیوں کو منتظم کیا اور ادھر ادھر مورچہ زن ہو گئے اب وہ مسلسل کر حویلی کی طرف بڑھ رہے تھے اور فائرنگ کر رہے تھے۔

مہاراج دور کہیں چھپا غصے سے دھاڑ رہا تھا شاید

پہلے حصے میں اپنے سپاہیوں کی ہلاکت نے اس کے غصے میں اضافہ کر دیا تھا سپہ سالار نہایت مہارت سے سپاہیوں کی کمان کر رہا تھا پھر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے مہاراج کے سپاہی خندق پر پہلے لے جاتے رکھ رہے تھے حویلی کی دیواروں میں فائرنگ میں شدت آگئی تھی اب عثمان اور حافظ دسٹے کے لئے فائرنگ کرنا ناممکن تھا گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں محافظ دسٹے کے کچھ نوجوانوں نے اٹھ کر فائر کرنے کی کوشش لیکن سروں میں گولیاں کھا کر وہیں ڈھیر ہو گئے ان کا حشر دیکھ کر دوسروں کا حوصلہ جواب دے گیا مہاراج کے سپاہی اس شدید فائرنگ کی آڑ میں آرام سے خندق پا کر رہے تھے۔ سامنے والی دیوار زمین بوس ہوئی۔ وہ دیکھتا تھا جو مہاراج کے سپاہیوں نے سامنے کی دیوار پر پھینکے تھے دھماکوں کی آواز اور شدت نے حویلی میں موجود عورتوں اور بچوں کو خوف زدہ کر دیا تھا وہ چیختے چلاتے اور رونے لگے۔

صورتحال بہت گھمبیر ہو چکی تھی سینکڑوں مصحوم لوگوں کی زندگی خطرے میں تھی ان میں بوڑھے بھی تھے نوجوان بھی تھے عورتیں اور بچے بھی تھے پھر چشم فلک نے حیرت انگیز منظر دیکھا ماضی کی راجکماری گیتا جواب صدف تھی مارشل آرٹ کے ماہر کامران کی تربیت یافتہ ہاتھوں میں راکفل تھا اس کے قریب نوجوانوں کے ہمراہ کرائنگ کرتی ہوئی حویلی سے باہر آئی صدف نے چہرے اور سر پر سفید رنگ کا رد مال باندھا ہوا تھا گویا وہ سر پر نقہ باندھ کر میدان جنگ میں آ کر آئی تھی صدف اور اس کے ساتھی سپہ سالار کے سپاہیوں پر تہہ بہ تہہ کر ٹوٹ پڑے۔ ان کی گولیاں خندق پار کر کے آنے والے دشتوں کے جسم میں چھید کر رہی تھیں بارود کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔

صدف کے ساتھ باہر نکل کر لڑنے والے جوانوں میں سے کچھ نوجوان مہاراج کی سپاہیوں کی گولیوں کا شکار ہو چکے تھے حویلی میں صدف کی بہادری سے اندر موجود باقی نوجوانوں کو غیرت آگئی سینکڑوں کی

تعداد میں نوجوان ہاتھوں میں تلواریں خنجر، کلہاڑیاں لاشیاں اور بعض راکفلیں اٹھا کر حویلی سے باہر آ گئے اب دونوں طرف سے دست بدست لڑائی شروع ہو چکی تھی باہر موجود سیکڑوں جوان صدف کی قیادت میں لڑ رہے تھے ہر طرف لاشیں اور زخموں کی چیخ پکارت تھی۔

صدف کی طرف سے مزاحمت کی وجہ سے مہاراج کے سپاہیوں کی توجہ عثمان وغیرہ کی طرف سے ہٹ چکی تھی اب چھت پر موجود عثمان اور حافظ دسٹے کے نوجوان تاک تاک کر مہاراج کے سپاہیوں پر گولیاں برس رہے تھے حویلی کے اندر گتیش بچوں اور عورتوں کو حوصلہ دے رہا تھا تمام مرد حویلی سے باہر مہاراج کے سپاہیوں سے لڑ رہے تھے کتیش کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے آثار تھے انہیں معلوم تھا ان کے نوجوان کے پاس اسلحہ اور گولیاں کم ہیں اس اسلحہ سے کافی دیر تک مہاراج کا مقابلہ ناممکن تھا بلکہ آخر انہیں پسپا ہونا پڑتا پھر یہاں کوئی زندہ نہیں بچتا مہاراج کے سپاہی مہاراج کے حکم پر سب کا خاتمہ کر رہے۔

لڑائی شروع ہوئے تقریباً آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے صدف اور اس کے ساتھ لڑنے والے اب پسپا ہو کر دوبارہ حویلی میں داخل ہو چکے تھے ان کے کافی ساتھی مارے جا چکے تھے بہت سے شدید زخمی تھے جن کی چیخ دیکھ کر حویلی کے در دیوار لرز رہے تھے اب ان کے لئے خطرہ بڑھ چکا تھا مہاراج کے سپاہی کرائنگ کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے حویلی میں موجود افراد اپنی بقاء کی آخری جنگ لڑ رہے تھے صدف اور دوسرے جوان حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے سپاہیوں پر نشانے لگا کر فائر کر رہے تھے چھت کے اوپر سے عثمان اور حافظ فورس کے جوان مزاحمت کر رہے تھے ان کی گولیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔

مہاراج کے سپہ سالار کی ہدایت پر حویلی میں ہینڈ گرنیڈ پھینکے گئے فضا خونخوار دھماکوں اور انسانی چیخوں سے گونج اٹھی احاطے میں موجود بہت سے جوان ان دھماکوں کی نظر ہو گئے کتیش کا چہرہ خوف سے زرد

پڑ چکا تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی انہیں شکست اور موت سے بچا سکتا تھا۔

صدف نے راکفل ایک طرف رکھی اور دعا کے لئے ہاتھ کھڑے کر دیئے "یا اللہ کثیر کے مقابلے میں قلیل جماعت کو فتح دلانے والے رب ہماری مدد فرما کوئی معجزہ دکھا دے میرے اللہ۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو چکی تھیں اور پھر معجزہ ہو گیا۔

مہاراج کی سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی ان پر عقب سے سیکڑوں کی تعداد میں لوگ حملہ آور ہو گئے یہ پاٹھ اور اس کے ساتھی تھے ان میں پردیپ بھی شامل تھا ان کے ساتھ ریاست کے نچلے درجے کے سینکڑوں جوان تھے جو مہاراج کے حد سے بڑھتے ہوئے ظلم سے تنگ آ کر پاٹھ کے ساتھ مہاراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے باہر سے مدد آتی دیکھ کر حویلی میں موجود جوانوں کا حوصلہ بڑھ گیا وہ سب حویلی سے باہر آ کر جنگ میں شریک ہو گئے۔

عثمان بھی چھت سے اتر کر لڑنے والوں میں شامل ہو چکا تھا مہاراج کے سپاہی عقب سے ہونے والے سے بولکھاتے تھے حویلی سے نکلنے والے جوان جب ان پر حملہ آور ہوئے تو وہ مزید بولکھا ہٹ کا شکار ہو چکے تھے وہ چل کے دو پاٹھوں میں پس چکے تھے چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر لگدے تھے۔

صدف ماہر شیر زنوں کی طرح نہایت مہارت اور بے جگر سے لڑ رہی تھی اس کی تلوار سامنے آنے والے سپاہیوں کو گاجرمولی کی طرح کاٹ رہی تھی اور تو اور پردیپ بھی بڑھ چڑھ کر اس جنگ میں حصہ لے رہا تھا۔ دونوں بمشکل بھائی الگ الگ لڑ رہے تھے لیکن دیکھنے والے انہیں میں جھلا ہو جاتے تھے عثمان اور صدف اس جنگ کے ہیرو یا مرکزی کردار تھے اس وقت میدان جنگ میں تمام لوگ ان ہی کی زیر نگرانی جنگ کر رہے تھے صدف نے ایک نئی تاریخ رقم کی تھی اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ عورت کمزور نہیں وہ چاہے تو پہاڑوں کو ہلا دے، صدف اس وقت چہرے پر نقاب

باندھے تھے نوجوان لڑکا دکھائی دے رہی تھی جو اس کی تلوار کی زد میں آتا گا جرمولی کی طرح کٹ کر نیچے گر جاتا۔

مہاراج کے سپاہیوں کا خاتمہ ہونا جا رہا تھا کچھ ہی گھنٹوں میں اس جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ مہاراج کے سپاہیوں کی بڑی تعداد ماری جا چکی تھی کچھ سپاہی بچے تھے جو آخر اتفری میں ادھر ادھر بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے ان بھاگنے والوں میں مہاراج سپہ سالار گوندی بھی چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے بھاگنے لگے۔ اچانک پاٹھ کے کی نظر ان پر پڑی۔ "مہاراج بھاگ رہا ہے پکڑ داسے۔" وہ چلایا اور چند ساتھیوں کے ہمراہ اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

عثمان اور صدف نے بھی یہ منظر دیکھا قریب ہی ایک جیب کھڑی تھی خوش قسمتی سے چابی انکیشن میں لگی تھی صدف نے تیز رفتاری سے جیب ان کے پیچھے دوڑا دی۔

مہاراج کی جیب گوندی ہاتھوں کی طرح چلا رہا تھا کچھ دیر بعد مہاراج کی جیب چوٹکا کھا کر کٹ گئی مہاراج اور اس کے ساتھی قریب موجود گھر میں بھاگتے ہوئے گھس گئے اس اثنا میں پاٹھ نے اپنے نصف درجن ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے اس گھر کو گھیرے میں لے لیا جس میں مہاراج اور اس کے ساتھی روپوش تھے۔

صدف اور عثمان بھی پہنچ چکے تھے۔ "اب کیا کریں؟ پاٹھ نے پوچھا۔

"تم لوگ سامنے پوزیشن لے کر کھڑے ہو جاؤ میں عقبی سمت سے اندر جاتا ہوں۔"

"میں بھی چلوں گی۔" صدف فیصلہ کن لہجہ میں بولی اور عثمان نے اثبات میں سر ہلادیا۔

وہ دونوں عقبی سمت کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے چاروں طرف سکوت چھایا ہوا تھا ای وقت گھر کے سامنے والے حصے سے فائرنگ کی آواز سنائی دی شاید پاٹھ اور اس کے ساتھیوں نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی مزاحمت میں مہاراج کے

پانڈے ان کا دست راست بننا عثمان نے کسی قسم کا عہدہ لینے سے انکار کر دیا اس کا کہنا تھا کہ وہ مہمان ہے آج نہیں تو کل چلا جائے گا۔

عثمان اور صدف کی شادی دھوم دھام سے ہوئی کچھ روز حویلی میں مہمان رہے۔ کنش جی سے جانے کی اجازت چاہی مگر کنش جی اور ریاست کے لوگوں نے اسے وہاں سے جانے کی اجازت نہ دی۔

ایک روز صدف اور عثمان اپنے بستر پر سوئے تھے کہ عثمان کو گھسی نے جھنجھوڑ کر اٹھایا، وہ اٹھا سامنے وہی خوابوں والی روح کھڑی تھی جس کی وجہ سے وہ آج یہاں تھا۔ ”ماں تم آگئی، میں نے سب کو ان کے انجام تک پہنچا دیا ہے۔“ عثمان بے اختیار بولا۔

وہ مسکرائی۔ ”ہاں تم نے اپنا حق ادا کر دیا ہے، اب پر دیپ نہیں رہے گا تم ان لوگوں میں جاؤ گے جنہوں نے تمہاری پرورش کی تھی، تم پر ان کا حق ہے، یہ تمہاری تقدیر ہے، میرے پیچھے آؤ، اسے بھی اٹھاؤ، اب تم دونوں میرے زیر اثر چلتے رہو گے کوئی تمہیں نہیں دیکھے گا۔“ روح بولی۔

صدف بھی اٹھ چکی تھی وہ دونوں روح کے سحر کے اثر اس کے ساتھ چلتے ہوئے مندر میں جا پہنچے سرنگ کا راستہ کھلا تھا وہ سرنگ میں چلتے رہے آخر دوسرے وہاں پر جانکلے مندر کے باہر وہی بڑی جیپ کھڑی تھی شاید یہ اتفاق تھا وہ حیرت زدہ سے اس میں بیٹھے۔

جیپ خود بخود چل پڑی کافی دیر بعد بلکہ کئی گھنٹوں بعد عثمان کو ہوش آیا۔ تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ جیپ ان کے گھر کے دروازے پر تھی اس کے پہلو میں صدف موجود تھی اور گیٹ پر اس کی پرورش کرنے والے والدین ایڈوکیٹ زبیر احمد والدہ بلیٹیس بانو حیرت اور خوشی سے اسے اور صدف کو دیکھ رہے تھے دونوں جیپ سے نیچے اترے تو زبیر احمد اور والدہ بلیٹیس بانو نے آگے بڑھ کر دونوں کو گلے لگالیا۔

لوگوں نے ان پر فائرنگ کی تھی وہ دونوں ہاتھوں میں رائفلیں تھامے چوکنے انداز میں دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوئے ایک سمت سے ان پر پے در پے دو فائر ہوئے دونوں نیچے گر گئے صدف نے گرتے گرتے اس سمت گولی چلا دی جہاں سے ان پر فائرنگ کی گئی تھی۔

جواب میں کرب میں ڈوبی انسانی چیخ سنائی دی عثمان نے سر اٹھا کر دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر ایک سپاہی فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا وہ دائیں سمت والے کمرے کے دروازے کے پاس سے گزر رہے ہی تھے کہ اک دم کمرے کا دروازہ کھلا اور عثمان کے سر سے رائفل کی نال آگئی اس نے مڑ کر دیکھا تو دروازے میں گووند کھڑا تھا جس کی رائفل کی نال اس کے سر سے لگی تھی جب کہ اس کے دروازہ کی ساتھی نے رائفل کی نال صدف کی پشت سے لگا رکھی تھی ”مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تم لوگوں کی وجہ سے مہاراج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔“ گووند سفاک لہجے میں بولا۔

صدف نے سر سالٹ فلا بازی کھائی اور دروازہ کے سر سے ہوتی ہوئی اس کی پشت پر پہنچ گئی گووند نے گھبرا کر فائر کر دیا عثمان پھرتی سے گرا رائفل کی گولی دروازہ قد کے سینے میں لٹکی اس سے پہلے کہ گووند رائفل کا رخ صدف یا عثمان کی طرف کرنا صدف نے برسٹ چلا دیا تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ گولیاں گووند کے سینے میں پیوست ہو گئیں وہ چیخا ہوا گرا اور جہنم رسید ہو گیا۔

عثمان اور صدف آگے بڑھے، مہاراج دروازے کی طرف پاٹھے اور اس کے ساتھیوں پر فائر کر رہا تھا آہٹ سن کر مڑا اور عثمان پر فائر کرنا چاہا جبکہ پاٹھے کی رائفل سے گولی نکلی اور مہاراج کی پشت میں پیوست ہو گئی وہ لہرایا، عثمان نے اس کے دل کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ ریاست کا ظالم ترین انسان لاوارثوں کی طرح بے حس و حرکت نیچے پڑا تھا، ظلم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

مہاراج کی ریاست کی گلدی پر کنش جی بیٹھے

